قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اپریل 2024 قیمت 15₹

ماہنامہ

اُردو دُنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیشکش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی
میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ،A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
ربط و التفات — قارئین کے خطوط 5

زبان و تعلیم
زبان اور اس کے رموز — مصطفیٰ ندیم خان غوری 7
اردو زبان کی تدریس میں قواعد کی اہمیت — محمد ارشد 10

لعل و گہر
نعیم الحق مسرور اورنگ آبادی بحیثیت غزل گو — قاسم فریدی 15
عبدالشکور آہ مظفر پوری کی غزلیہ شاعری — شکیل احمد 17
کوثر چاند پوری کی تخلیقی جہات — ایم اے کنول جعفری 20

فراق شناس افغان اللہ خاں — ذاکر حسین ذاکر 23
فراموش کردہ ادبی شخصیت سلیم جعفر — فہیم الدین 27
ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی ادبی جہات — محمد شفیع بھٹ 29

ادب زاویے اور جہات
جگن ناتھ آزاد کی نظموں میں شعری عمل کی جہتیں — احمد امتیاز 31

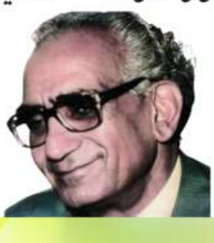

اردو فکشن میں زمیندارانہ معاشرے کی عکاسی — سمی اقبال 34

فراق گورکھپوری کے غیر مطبوعہ خطوط — عزیز احمد خان 38
اردو افسانہ اور رومانی اسلوب — عرفان رشید 41
آزادی کے بعد اردو نظموں میں ہندوستانی عناصر — محمد اکبر 45

یاد رفتگاں
سید شکیل دسنوی — سید نفیس دسنوی 48
پروفیسر محمد اسلم خان: دہلی کی ایک نامور علمی شخصیت — مہتاب جہاں 51
فاروق نازکی کی غزلیہ کائنات — مشتاق احمد گنائی 53

سالک بستوی کا تخلیقی سفر — محمد اسلام خان 56

خصوصی گفتگو
ڈاکٹر شعور اعظمی سے گفتگو — ساجد جلالپوری 58

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ 61

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 76

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:26، شمارہ:04، اپریل 2024

مدیر : پروفیسر دھننجے سنگھ
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی، شاداب شمیم

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے   سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000   شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدر آباد۔500002
فون: 040-24415194

ہماری بات

تہذیبی تکثیریت اور لسانی تنوع ہندوستان کی خصوصی پہچان ہے—!

تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے دیکھا جائے تو ہمارے ملک بھارت میں الگ الگ تہذیب اور ثقافت رکھنے والی قومیں اور آبادیاں ہیں۔ اتر، دکھن، پورب پچھم کے علاقوں کا الگ الگ کلچر ہے اور ہر کلچر کی اپنی ایک معنویت بھی ہے۔ تہذیبی تضاد کے باوجود ایک قدر مشترک یہ ہے کہ سبھی میں ہندوستانیت ملتی ہے اور اسی سے ہمارے ملک کے ثقافتی اور تہذیبی تنوع کا صحیح طور پر اندازہ ہوتا ہے۔ یکسانیت کہیں بھی ہو وہ ایک طرح سے انجماد کو جنم دیتی ہے۔ کسی شاعر نے بہت خوب کہا ہے۔

گلہائے رنگارنگ سے ہے زینت چمن

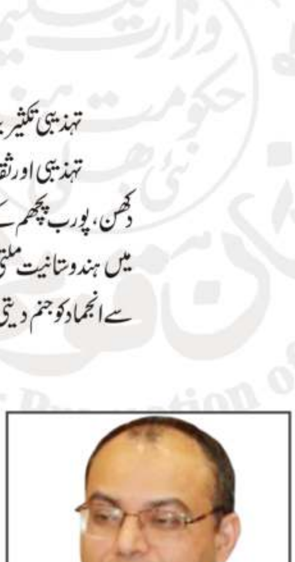

کلچر ہی کی طرح زبان کا بھی مسئلہ ہے کہ ملک کے مختلف حصوں کی زبان الگ ہے اور اس لسانی تنوع سے ہی ہندوستان کی کثیر لسانی شناخت قائم ہوتی ہے۔ اگر زبان کی سطح پر بھی یکسانیت ہوتی تو شاید ہماری وحشتوں میں اضافہ ہونے لگتا۔ الگ الگ زبانوں کے اظہارات، علائم اور رموز سے لسانی کیفیت بدلتی ہے اور ایک طرح سے تنوع کا بھی احساس ہوتا ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ کلچر اور زبان کے اس اختلاف اور تضاد کی وجہ سے کبھی کبھی کشیدگی کی صورت بھی پیدا ہو جاتی ہے، جب کہ بنیادی طور پر دیکھا جائے تو اس لسانی اور ثقافتی تنازعے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی، کیونکہ زبان کوئی مذہب تو ہے نہیں اور نہ ہی زبان کا کوئی مذہب ہوتا ہے۔ الگ الگ مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کی زبان بھی ایک ہو سکتی ہے۔ کنڑ، ملیالم، تیلگو، تمل، اڑیا میں مختلف طبقات کی زبانیں ہیں۔ ان میں ہندو مسلم، عیسائی، سکھ سبھی شامل ہیں۔ یہی معاملہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کا بھی ہے کہ مذہب کوئی بھی ہو، زبان وہی ہوتی ہے جو اس علاقے میں مقبول اور مروج ہوتی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو زبان کا مذہب سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اگر زبان مذہب سے مشروط ہوتی تو پوری دنیا کے مسلمان ایک ہی زبان بول رہے ہوتے یا پوری دنیا میں دوسرے مذاہب کے لوگ بھی اپنی مذہبی زبان میں ہی باتیں کرتے۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہندوستان کے لسانی نقشے اور منظر نامے پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ مذہب اور عقیدے کے اختلاف کے باوجود لسانی سطح پر اتحاد اور یکسانیت ہے اور یہی ہمارے ملک کا حسن ہے اور اسی وجہ سے ہندوستان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کثیر تہذیبی اور لسانی ملک ہے۔ شاید ہی ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک میں ایسا لسانی تنوع دیکھنے کو ملتا ہو۔

ہندوستان میں ایک بڑی تعداد ان علاقائی زبانوں کی بھی ہے جن سے بھارت کی تہذیبی اور ثقافتی روح کی عکاسی ہوتی ہے اور ان علاقائی زبانوں کا ادب بھی بہت ثروت مند ہے۔ لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم بہت سی علاقائی زبانوں کے ادبیات اور ان کے ثقافتی اور لسانی رجحانات اور رویوں سے واقف نہیں ہو پاتے۔ جب کہ ہمیں ہندوستان کے تہذیبی تنوع کو جاننے اور سمجھنے کے لیے ان زبانوں سے رابطے کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کرنی ہوگی کیونکہ ہندوستانی تہذیب صرف ایک زبان، ایک قوم، ایک خطے پر مرکوز نہیں ہے۔ اس تہذیب کی تشکیل، تنوع سے ہوئی ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستان کی ان زبانوں کے تراجم پر بھی زور دیا جائے جہاں کی تہذیب و ثقافت سے ہماری قطعی کوئی آشنائی نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کی تہذیبی روح اور ثقافتی رمز کو سمجھنا ہے تو ہمیں ان علاقائی زبانوں پر توجہ دینی ہوگی جنھیں ہم نظر انداز کرتے رہے ہیں اور اس کے لیے سب سے بہترین ذریعہ تراجم ہیں۔ ترجمے ہی ثقافتی اور تہذیبی رابطے کی شکل بن سکتے ہیں اور ترجمے ہی کے ذریعے ہم الگ الگ علاقوں اور مقامات کی رسمیات اور رسومیات سے واقف ہو سکتے ہیں۔

گلوبلائزیشن کے اس دور میں بھی ہم صرف چند زبانوں کی تخلیقات کے تراجم میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں، جب کہ ہونا یہ چاہیے کہ جن زبانوں سے آشنائی کی صورتیں کم ہیں انھیں ترجیحی طور پر تراجم کی فہرست میں شامل کریں۔ خاص طور پر قبائلی آدی باسی اور شمال مشرق کی بہت سی زبانیں ہیں جن کا ادب کافی ثروت مند ہے، اس پر خاص فوکس کرنے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر دھننجے سنگھ

ربط والتفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ھے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔
قارئین سے گزارش ھے کہ ماھنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ھے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اھمیت کے حامل ہوتے ھیں، ان سے ھمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ھے۔ (ادارہ)

✍ 'اُردو دنیا' فروری 2024 نظرنواز ہوا۔ سرورق پر 'نہالِ حروف تہجی' اپنی ٹہنیوں میں بہار دکھارہا ہے۔ اداریے میں یہ تاکیدی تحریر درج ہے کہ معاشرے میں مادری زبان کی اہمیت اس بناپر ہے کہ انسان اپنے مافی الضمیر کی احسن طریقہ سے ترسیل کرسکے اس لیے زبان کو زندہ رہنے کے لیے روزمرہ سے اس کا تعلق استوار رہے۔ جو اپنی مادری زبان بھول جائے وہ گویا مرگیا۔'ربط والتفات' میں تین مکتوبات شامل ہیں۔

کچھ تنقیدی اور کچھ توصیفی۔ دیکھیے ان میں کیا کچھ قابل اعتنا ہیں۔'ادب زاویے اور جہات' میں چھ مقالات شامل ہیں جنھیں معروف قلمکاروں نے سپرد قلم کیا ہے۔ پہلا مضمون 'اجنبی جہانوں سے رؤ برؤ کرانے والا جامِ جم' ڈاکٹر غضنفر کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں انھوں نے کامیاب ترجمہ نگاری کو جام جم کے علاوہ ایک خوردبین قرار دیا ہے جس کی مدد سے ہم نادیدہ جہانوں کو مع ان کی تمام تر باریکیوں کے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا وسیلہ ہے جو ایک زبان کے افکار و اسرار کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرتا ہے کہ اس پر اوریجنل کا گمان غالب ہو۔ مضمون کی عمدگی میں کوئی کلام نہیں۔ دوسرا مضمون پروفیسر ابوبکر عباد نے بعنوان 'اردو فکشن کی تنقید میں ہندو فکشن نگاروں کا حصہ' لکھا ہے۔ انھوں نے ابتداءً اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو بدیسی یا مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس میں ہندو فکشن نگاروں اور ان کے فنون کو بخوبی اجاگر کیا گیا ہے۔ جیسے 'فسانۂ آزاد' پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ناول ہے اور 'جامِ سرشار' سے اس کا تقابل کرکے تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ اسی طور چکبست کے کلام کو تنقیدی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ویسے ہی منشی پریم چند پر بھی طویل تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ پھر کرشن چندر، اوپیندر ناتھ اشک، دیویندر اِسّر کے مضامین 'ادب وفرائڈ' ادب ونفسیات پر کافی ادبی وتنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ بہرحال یہ نہایت عمدہ تحقیقی مضمون ہے۔ تیسرا مضمون ڈاکٹر انوپما پول کا تحریر کردہ ہے۔ عنوان ہے 'اردو زبان وادب کے فروغ میں فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس کا کردار'۔ یہ مضمون اس لحاظ سے اچھا ہے کہ جن قارئین کی یادداشت کمزور ہو ان کا آموختہ ہوجائے گا۔ اگلا مضمون ڈاکٹر طالب اکرم کا لکھا ہوا ہے۔ عنوان ہے 'اردو شاعری میں کرشن کنہیا' ان کا کہنا ہے کہ اردو شعرا نے کرشن جی کو بھی موضوع سخن بنایا ہے۔ یہ کون سی نئی تحقیق ہے یہ تو سبھی جانتے ہیں۔ بقیہ مضامین میں بھی کافی افادیت پائی جاتی ہے۔ پڑھ لیجیے کیا مضائقہ ہے۔'زبان وتعلیم' کے تحت پہلا مقالہ بعنوان 'املے سے بے نیاز ایک بڑی غلطی' ڈاکٹر اسلم جاوداں کا لکھا ہوا ہے اور بہت عمدہ مضمون ہے۔ پڑھ کر تو عش عش کرنے کو جی چاہتا ہے کہ خواص ہی نہیں بلکہ عوام میں بھی امالہ کو حذف کرنے کی یہ غلطی عموماً پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسلم جاوداں نے امالہ کے قواعد اور اصول بھی بتائے ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر یہ مقالہ سب سے عمدہ اور عملی محسوس ہوا۔ جس کے لیے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ دوسرا مضمون 'اُردو زبان کے آغاز سے متعلق مختلف نظریات کا

جائزہ‘ جناب امتیاز احمد کا لکھا ہوا ہے۔ انھوں نے اسے 13 حوالہ جاتی کتب کی روشنی میں تحریر کیا ہے۔ نظریات کا کیا ہے کوئی بھی پیش کرسکتا ہے۔ دیکھیے اس میں اگر آپ کو کوئی نئی تھیوری مل جائے۔ ’یادرفتگان‘ کے ذیل میں عشرت ظہیر نے ’بدنام نظر کی نظموں میں زندگی کی خوشبو‘ تحریر کیا ہے۔ جو ایک توصیفی وتقریظی مضمون ہے۔ لیکن اس میں ’بدنام نظر‘ کے کوائف سے کافی واقفیت ہوئی۔ دوسرے مضمون میں جناب اشتیاق سعید نے ’احسان سیوانی‘ کو یاد کرتے ہوئے یہ مقالہ تحریر کیا ہے۔ ان کی اس تحریر سے مرحوم کی کئی صفات سے واقفیت ہوئی۔ ’خصوصی گفتگو‘ میں ڈاکٹر ریشا قمر نے ’پروفیسر صغیر افراہیم‘ سے لیا گیا انٹرویو پیش کیا ہے۔ ’نگر نگر اردو‘ کے ذیل میں جناب بسم اللہ عدیم برہانپوری نے ’برہانپور میں نظمیہ شاعری‘ پیش کی ہے۔ انھوں نے برہانپور کی نظمیہ شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ’کتاب دریچہ‘ میں جناب ثناء اللہ خان صادق تیمی نے ان کتابوں کی تفصیل بیان کی ہے جن کتابوں نے انھیں متاثر کیا۔ ’فلم اور ڈرامہ‘ میں تین مضامین دیے گئے ہیں۔ جن لوگوں کو سینما اور ڈرامہ میں دلچسپی ہو وہ انھیں شوق سے پڑھ سکتے ہیں۔ ان میں پروفیسر محمد شاہد حسین نے اپنا مضمون بعنوان ’سینما— فریب نظر یا فریب حقیقت‘ لکھا ہے۔ اگر اسے فریب نظر وحقیقت لکھا جاتا تو کیا برا تھا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ڈاکٹر شکیل احمد خاں نے جوڑی ہے۔ ان کے مضمون کا عنوان ’اردو اور ہندوستانی سینما‘ دیا گیا ہے۔ اس میں سینما کے ارتقائی سفر کی روداد فلم کس طرح چلتی ہے کیسے بولتی فلم عالم آرا سے یہ سفر ریلوں میں شروع ہوا اور پریم چند کے افسانوں سے ہوتے ہوئے یہاں تک پہنچا۔ اچھا مضمون ہے پڑھنے میں مزہ آئے گا۔ ڈاکٹر شہباز احمد ارشد نے ’اردو ڈرامے کی ابتدا‘ تحریر کیا ہے۔ اس میں انھوں نے مختلف نظریات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا ہے اور یکے بعد دیگرے نظریوں کو بیان کیا ہے۔ پر اس موضوع پر اردو میں کافی مواد موجود ہے جیسا کہ اس مضمون کے حواشی سے ظاہر ہے۔ جن میں 13 کتب کی فہرست درج ہے۔ پھر بھی مضمون تحقیقی ہے اور پیش کش عمدہ ہے۔ ’ادبِ اطفال‘ میں ڈاکٹر محمد دانش غنی نے اپنے مضمون میں ’کوکن میں ادب اطفال کی صورت حال‘ کا جائزہ لیا ہے۔ ’نیا آسمان نئے ستارے‘ میں تین مقالات شامل ہیں۔ پہلا مقالہ جناب محمد اظہری کے نکات الشعرا کے حوالے سے لکھا ہے ’میر تقی میر تذکرہ نویس شاعر‘ اس تحقیقی مقالے کو انھوں نے نوماخذ کتب کی مدد سے تیار کیا ہے اور میر کی کارکردگی پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ادبی مضمون ہے خود پڑھ لیجیے۔ دوسرا مضمون مہر فاطمہ سلمہا نے لکھا ہے۔ عنوان دیا ’وحشت کا تصور اور میر و غالب‘ مضمون میں جابجا میر و غالب کے عمدہ اشعار سے رنگین و جاذب بنا دیا ہے۔ پڑھنے میں مزہ آتا ہے۔ تیسرا مضمون شری ردر شکتی جی مہاراج کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ عنوان ہے ’کشمیری لال ذاکر کی ناول نگاری‘۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ کشمیری لال ذاکر کی تصانیف پر بڑی اور منطقی بحث کی ہے۔ مضمون عمدہ ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ’تبصرہ وتعارف‘ کے ذیل میں درجن بھر کتابوں کے تبصرے شامل ہیں۔ آخر میں ’خبرنامہ‘ کے تحت اردو دنیا کی خبریں دی گئی ہیں جن میں اردو تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی بھرپور خبریں شامل ہیں تاکہ آپ ہمیشہ باخبر رہیں۔

مصطفیٰ ندیم خاں غوری: بی 11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

ماہنامہ ’اردو دنیا‘ جنوری کا شمارہ موصول ہوا۔ ’ہماری بات‘ میں فلسفۂ وقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وقت کے حوالے سے افسانے اور ناول لکھے گئے ہیں، نیا سال نئے خواب لے کر آتا ہے۔ نیا سال 2024 محض ایک کلینڈر کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ فکر ونظر، رویے اور رجحان کی تبدیلی کا بھی ایک اشاریہ ہے۔ ہر سال نئے سال کی مناسبت سے اداریہ

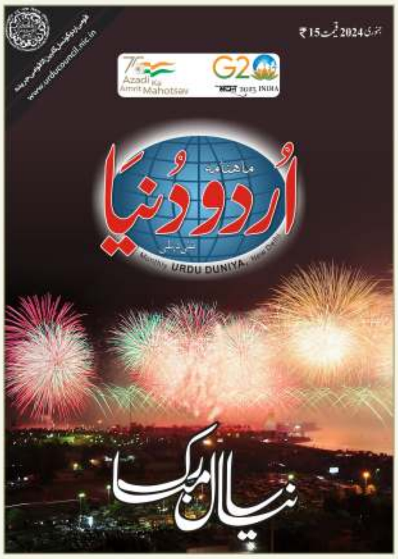

خوب ہے۔ ظہیر انور نے ’خواب رو اور جوگندر پال کا فن‘ میں ان کے افسانے، ناول کا تجزیہ کرتے ہوئے فکر وفن پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں خواب رو میں موضوعات کا تنوع تو ہے ایک ایسا توازن بھی ہے جو زبان، تکنیک، کردار اور خود پلاٹ کی دین ہے۔ جوگیندر پال نے اس ناول کے بیانیہ ڈھانچے کو نہایت باخبری اور سوجھ بوجھ کے ساتھ ترتیب دیا ہے جو انسانی روح کے داخلی ارتعاشات اور ان کی طاقت کی دریافت میں ممد ومعاون ہیں۔ ایس ایم شکیل نے ’خاندیش میں اردو تحقیق وتنقید‘ موضوع پر لکھا ہے کہ وہاں کے مصنفین اور نقادوں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ قمر الحسن نے ’منٹو کے افسانوں کی سماجی وتہذیبی معنویت‘ میں منٹو کے افسانوں اور تخلیقات کا تجزیہ اور محاکمہ کیا ہے۔ طارق حسین نے ’پنجابی زبان پر فارسی کے اثرات‘ کا لسانی تجزیہ پیش کیا ہے۔ باقی مشمولات بھی انفرادیت لیے ہوئے ہیں۔ ان میں نظیر کی غزل گوئی اور قومی یکجہتی پر شعری حوالوں سے بات کی گئی ہے۔ باقی مواد ومشمولات ادبی بصیرت اور عصری شعور عطا کرتے ہیں۔ اردوداں طبقے کے لیے یہ کسی نعمت سے کم نہیں ہیں۔

’اردو دنیا‘ مارچ کا شمارہ بھی موصول ہوا۔ سرورق پر ممبئی اردو کتاب میلے کی تصویروں کے ذریعے عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ نایاب حسن کی تفصیلی رپورٹ بہت معلوماتی اور بصیرت افروز ہے۔ مدیر صاحب نے ہماری بات میں جن کتابوں پر بہت فکرانگیز اور معلومات سے پر اداریہ لکھا ہے وہ کہتے ہیں ’’کتابیں علم کا خزانہ ہوتی ہیں جو نہ صرف ہمارے شعور کو بیدار کرتی ہیں بلکہ ہمارے اندر نئے خیالات وجذبات اور فکر کی نئی جہتیں بھی پیدا کرتی ہیں اس لیے کتاب کو اچھا ساتھی اور دوست کہا جاتا ہے۔ یقیناً کتابیں علوم وفنون کا اہم ذریعہ ہوتی ہیں۔ اس میں مذہب، ثقافت، تمدن اور انسانی قدریں زندہ رہتی ہیں اور انسانیت کو جینے کا سلیقہ عطا کرتی ہیں۔ کتابوں سے ہی قوم و ملک کی ترقی ہوتی ہے۔ کتاب میلہ سے لوگوں میں کتب پڑھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔‘‘ ’بائٹ سائز لرننگ میں‘ روبینہ نے نئے زاویے سے روشنی ڈالی ہے۔ نصاب کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں رکھ کر درس وتدریس کی جاتی ہے۔ آمنہ تحسین نے ’بشیر النسا بشیر کی ادبی تعلیمی، سماجی خواتین کے تئیں خدمات‘ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ان کی شاعری کی خصوصیات کو بیان کیا ہے۔ وہ ان کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ شاعرہ نے طبقہ نسواں کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ محمد ذاکر حسین ندوی ماہنامہ ’عفت‘ پٹنہ خطوط صفیہ اختر میں ان کے خطوط پر تجزیہ پیش کیا ہے۔ شاداب تبسم نے ’نسائی ادب کا گراں قدر سرمایہ پر روشنی ڈالی ہے۔ احسان حسن نے میر کا طرز شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ باقی مشمولات بھی فکرانگیز اور بصیرت افروز ہیں۔ طلبہ، اسکالر اور ادیبوں و شاعروں کے لیے یہ رسالہ ادبی وعصری معلومات عطا کرے گا۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

زبان اور اُس کے رموز

مصطفیٰ ندیم خان غوری

”موقع محل کے اعتبار سے زبان کے کئی مفاہیم ہوتے ہیں۔ ایک تو وہی زبان جو ہر جاندار کے جبڑوں میں ہوتی ہے۔ دوسرے زبان برائے اشاعت علم جیسے سنسکرت، عربی، فارسی جیسی زبانیں یا پھر وہ بھی زبانیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ”بے زبان جانوروں پر رحم کھاؤ“۔ یہ باتیں کئی لوگ سیکھتے اور سکھاتے بھی ہیں جیسے کسی زبان کی قواعد سکھانا۔ اغلاط کی تصحیح، نظم نگاری، مضمون نویسی یا فن خطابت و خوش بیانی۔“

انسان زبان کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کرنے اور اپنے مقابل کو کسی خیر سے آگاہ کرنے اور اسے اپنے ارادے کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس کی زبان نہ صرف انسان بلکہ پالتو اور جنگلی جانور تک سبھی سمجھ جاتے ہیں۔ مثلاً جانوروں کو ان کی مرغوب غذا دکھا کر پاس بلانا یا پھر ڈنڈا دکھا کر دور بھگانا۔ مگر یہ میٹھی یا ترش زبان بلکہ اس کے علاوہ سریلی زبان انسان کو کس نے کب اور کہاں سکھائی ہوگی باہمی تجربات نے اس کے اپنے ماحول نے یا پھر اس کے ایجاد کردہ میٹھے سروں، لسانی بحور اور اس ساز و سامان نے یا ان سب نے اجتماعی طور پر۔ انسانی مزاج اور طبیعتیں فرداً فرداً یا ایک فرد میں موقع بموقع جداگانہ ہوتی ہیں۔

زبان سیکھنے کے کئی ذرائع (نظریے) پیش کیے گئے ہیں۔ زبان کے آغاز کے سلسلے میں کچھ بنیادی باتیں اس طرح ہیں:

الوہی نظریہ: اکثر مذاہب[1] اپنے کو قدیم ترین مذاہب گرانتے ہیں۔ ان میں بھارت کا الوہی نظریہ پیش پیش رہا ہے۔ اس نظریے کے مطابق ہندو دھرم یعنی سناتن دھرم قدیم ترین دھرم ہے۔ ان میں سنسکرت زبان کو دیوبانی کہا جاتا ہے جبکہ بدھ مت کے مطابق پراکرت قدیم ترین زبان ہے۔ چنانچہ انسان آسمانوں میں دیوی دیوتاؤں کے ساتھ سنسکرت زبان میں ہی بات کیا کرتا ہوگا۔ ظاہر ہے جسے دیوتاؤں نے ایجاد کیا ہوگا۔ چنانچہ تمام تر مخلوق بشمول انسان اور جانور باہم سنسکرت میں ہی باتیں کیا کرتے ہوں گے۔ ہندوازم کے علاوہ کئی مشابہ نظریے بھی دیگر مذاہب میں قائم رہے ہیں۔ مثلاً بدھوں کے قریب پالی پراکرت قدیم ترین زبان ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان نے سب سے پہلے یہی زبان سیکھی ہوگی۔ جینیوں کی دانست میں تیرتھنکروں کے اردھ ماگدھی اپدیشوں کو انسان کے علاوہ حیوانات بھی سمجھتے تھے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک اصل زبان عبرانی تھی جبکہ اسلامی عقیدے کے مطابق حضرت آدمؑ کی پیدائش کے بعد انھیں کئی اشیا کے نام سکھائے گئے جن سے فرشتے ناواقف تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ نام عربی زبان میں ازبر کرائے گئے ہوں گے۔ اس طرح تو انسان کی پہلی زبان عربی قرار دی جاسکتی ہے۔ واللہ عالم بالصواب۔

فطری نظریہ: اس نظریے کو فیثاغورث چھٹی صدی ق.م. (قبل مسیح)، ہیراگرٹس 576 تا 480 ق.م.) اور افلاطون (492 تا 347 ق.م.) نے باہمی طور پر پیش کیا تھا کہ فطرت نے کسی جبلی ضرورت کے تحت زبان کو جنم دیا تھا۔ چنانچہ اشیا اور ان کے ناموں میں کوئی فطری تعلق ہوتا ہے۔ چونکہ یہ ایک فلسفیانہ خیال ہے۔ اس لیے ماہرین نے اسے علمی اہمیت نہ دی۔

حیوانی آوازوں کی نقل: اس نظریے کے مطابق انسان نے برّی، بحری اور فضائی آوازوں اور جانوروں کی بولیوں

کی نقل میں زبان کے اولین الفاظ اختراع کیے ہوں گے۔ مثلاً میاؤں، میاں، بھوں بھوں، دریا سمندر کے لہروں کی آوازیں، جنگلی اور پالتو پرندوں اور جانوروں کی آوازیں جن سے انسان اپنی زبان کے اولین حروف تراش لیے لیکن اس پر نمایاں اعتراض یہ ہوا کہ ہر آواز اور ہر لفظ کی ہر زبان میں تعمیم ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ انسان جو کہ اشرف المخلوقات ہے وہ کیونکر جانوروں کی زبانوں کا دست نگر ہوگا۔ اس لیے یہ نظریہ لغو ہے۔ مزید اور بھی کئی نظریے تو ہیں لیکن غیر موضوعی بحث بیجا طوالت کا باعث ہوگی۔

بنی نوع انسان کے لیے زبان از بس ضروری ہے کیوں کہ یہ علم کی ترسیل کا بھی مؤثر ذریعہ رہی ہے۔ یعنی جو سنا وہ سیکھا بولا سنایا لکھا اور اگلی پشتوں تک پہنچایا۔

موجودہ حالات میں زبانیں غیر عسکری تہذیبوں جیسے وادیِ سندھ کی تہذیب، مصری تہذیب، ہڑپہ موہنجودارو وغیرہ میں پروان چڑھی ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایسی کسی تہذیب یا علاقے میں ان کی اپنی زبان پنپتی ہے جس کے خصائص دوسری تہذیب یا علاقوں سے یکسر جدا ہوتے ہیں۔ مثلاً دراوڑی زبانیں، آریائی زبانیں، یونانی، لاطینی، انگریزی، فرانسیسی، فارسی، عربی۔ ذرا غور کریں تو محسوس ہوگا کہ آہستہ آہستہ ان زبانوں پر علاقائی چھاپ واضح ہوتی چلی جائیگی۔ مثلاً انگریزی اور فرانسیسی کو لیجیے۔ ان کے الفاظ اپنے ڈھب کے اعتبار سے انگلستان اور فرانس کو واضح کریں گے۔ ویسے اطالوی، جرمنی، روسی، چینی وغیرہ۔ برصغیر میں آئیں تو پشتو، پنجابی، اودھی، تامل، تیلگو، کنڑی، مراٹھی۔ سب کا مزاج سب سے جدا۔ اگر یکسانیت کی کوئی جھلک دکھائی تو محض اتفاقی۔ لیکن ہم دو متصل علاقوں کے درمیان یوں خط فاصل بھی تو عائد نہیں کر سکتے کیوں کہ زبانیں بدلتے بدلتے بدلتی ہیں۔

موقع محل کے اعتبار سے زبان کے کئی مفاہیم ہوتے ہیں۔ ایک تو وہی زبان جو ہر جاندار کے جبڑوں میں ہوتی ہے۔ دوسرے زبان برائے اشاعتِ علم جیسے سنسکرت، عربی، فارسی جیسی زبانیں یا پھر وہ بھی زبانیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ”بے زبان جانوروں پر رحم کھاؤ“۔ یہ باتیں کئی لوگ سیکھتے اور سکھاتے بھی ہیں جیسے کسی زبان کی قواعد سکھانا۔ اغلاط کی تصحیح، نظم نگاری، مضمون نویسی یا فن خطابت و خوش بیانی۔ ان علوم کے اکتساب سے کئی ایک مقاصد جیسے عمدہ ادیب و شاعر خطیب، خوش گفتار و پیروکار (وکیل) حاصل ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں صوت و آہنگ کی کرشمہ سازیاں ہوتی ہیں۔ زبان و آہنگ کے منظّم مطالعے کو صوتیات کہتے ہیں۔ ماہر صوتیات و سائنسداں ہوتا ہے جس میں انسانی آوازوں کو سمجھنے کی تمیز ان میں تفریق و تجزیہ کی مہارت ہوتی ہے۔

[2]یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں زبان سے مراد بولی جانے والی زبان ہے اسے محفوظ رکھنے کا فن فن تحریر کہلاتا ہے۔

اس تمام بیان پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو زبانوں کے ترقیاتی دور اور ترمیمی لوازم کی تفصیل کچھ یوں ہوگی کہ کوئی ایک لاکھ سال تا 40 ہزار سال قبل تک سندھ، مصر، جنوبی افریقہ، چین، وسط ایشیا میں ترقیمی اشیاء، احمرین روغن، کوئلہ، گوند وغیرہ سے تیار ہوا کرتی تھیں جبکہ سطح ترقیم غیر منقولہ یعنی بھاری چٹانیں، کتبے وغیرہ ہوا کرتے تھے اور منقولہ تعویذ نقوش وغیرہ جن پر ہڈیوں کے نوکدار قلم سے لکھا جاتا تھا۔ پھر 4000 (قبل مسیح) تا 400 (ق.م.) معمولی سی پیش رفت مصر، جنوبی افریقہ، چین، ہندوستان میں دیکھی گئی ہے۔ جس کے دوران گوند نباتی ہے۔ عرق بطور روشنائی استعمال ہوتے تھے۔ جبکہ سطح ترقیم میں چٹانیں سیپیاں تختیاں کھالیں یا پائرس وغیرہ دستیاب تھے۔ اور قلم کے لیے ہڈیاں سرکنڈے بانس مستعمل تھے۔ جو 256 ق.م. تک رائج رہے۔ پہلی صدی عیسوی تک ایران، سندھ، اسلامی پرتگال کاغذ پر روشنائی کا استعمال ہوا جبکہ 1041ء میں چین میں طباعت شروع ہو چکی تھی۔ 1450ء میں یورپ میں پرنٹنگ پریس شروع ہو چکا تھا اور انیسویں صدی میں کانپور دہلی لکھنؤ کلکتہ میں اُردو کتابوں کی طباعت جاری ہو چکی تھی جن میں 42 کتابوں کے کوئی 11458 نسخے شائع ہو چکے تھے۔ بیسویں صدی میں کمپیوٹر سے تمام زبانوں میں ایک انقلاب رونما ہوا[3] اور اکیسویں صدی میں تو انٹرنیٹ، واٹس اپ، یوٹیوب، سوشل میڈیا وغیرہ نے تہلکہ مچا دیا۔

زبان کی ادائیگی میں دماغ کا حصہ: اب تک ہم نے زبان کا علم لسانیات کی روشنی میں جائزہ لیا جس کے دوران ہمیں ماحولیاتی عوامل کی کارفرمائیاں نظر آئیں۔ اب زبان کی اُپج اور ادائیگی میں انسانی دماغ کے کردار پر نظر ڈالیں گے۔ واضح رہے کہ انسانی دماغ کے غیاب میں زبان کا کوئی وجود ہی نہ ہوگا۔ اس موضوع پر گفتگو سے قبل اگر انسان کی دماغی ساخت پر اجمالی نظر ڈالی جائے تو معاملے کو سمجھنے میں آسانی رہے گی۔

انسانی دماغ کاسۂ سر میں ہر جانب محفوظ و محصور رہتا ہے۔ اس کی سب سے اوپری پرت بھورے رنگ کی ہوا کرتی ہے اور جس کی موٹائی کم و بیش 3 ملی میٹر ہوتی ہے۔ یہ دماغ کا اہم ترین حصہ ہوتا ہے اور دماغ کے پیچیدہ ترین امور جیسے اشعار کی موزونیت میں غور و فکر کرنا، تحقیق و تنقید کے مسائل کا حل وغیرہ اسی سے انجام پاتے ہیں۔ جانوروں میں اس کا فقدان ہوتا ہے۔ البتہ بندروں میں یہ ہلکی سی نشوونما پاتی ہے مگر بے اثر ہوتی ہے۔ انسانی دماغ جسے مغز (Cerebrum) کہا جاتا ہے ایک درز کے ذریعے دو متشاکل، متوازن و مساوی نصف کروں میں منقسم ہوتا ہے۔ اس میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ دایاں نصف کرہ بدن کے بائیں حصے کو کنٹرول کرتا ہے جبکہ بایاں نصف کرہ بدن کے دائیں حصے پر اپنا قابو رکھتا ہے۔ ہر نصف کرہ مزید ایک تڑقن کے ذریعہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اس طرح پورے دماغ کے چار حصہ ہوئے۔ ان میں سے دو حصوں میں زبان و بیان کو کنٹرول کرنے والے حصے ہوتے ہیں جن کی تفصیل ذیل میں ہے۔

بروکا ایریا (Broca's Area): دماغ کے اس حصے کا نام نامور نفسیاتی طبیب پال بروکا (1824 تا 1880) (Paul Broca) کے نام سے موسوم ہے۔ اپنے معالجہ کے دوران اس کے مشاہدے میں کچھ ایسے مریض آئے جنھیں الفاظ کی اُپج (Language Production) میں رکاوٹ اور ادائیگی میں لکنت کے مسائل حائل تھے۔ ان مسائل کے حل کے دوران اس نے غور کیا کہ کہیں اس بگاڑ کا تعلق دماغ یا اس کے کسی حصے سے تو نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے

انسانی دماغ کا سۂ سر میں ہر جانب محفوظ و محصور رہتا ہے۔ اس کی سب سے اوپری پرت بھورے رنگ کی ہوا کرتی ہے اور جس کی موٹائی کم و بیش 3ملی میٹر ہوتی ہے۔ یہ دماغ کا اہم ترین حصہ ہوتا ہے اور دماغ کے پیچیدہ ترین امور جیسے اشعار کی موزونیت میں غور وفکر کرنا، تحقیق و تنقید کے مسائل کا حل وغیرہ اسی سے انجام پاتے ہیں۔ جانوروں میں اس کا فقدان ہوتا ہے۔ البتہ بندروں میں یہ ہلکی سی نشوونما پاتی ہے مگر بے اثر ہوتی ہے۔

چندمریضوں کے دماغ کی جراحت کی تاکہ ناقص حصوں کا گہرائی سے مشاہدہ کیا جاسکے۔ اس جراحت کے دوران اس نے پایا کہ مریضوں کے بائیں پیش دماغ لختہ (Left frontal lobe) [5] ناقص و ناکارہ ہوچکے ہیں۔ اس طرح فتور گوئی (Aphasia) [6] کے علاج کے دوران دماغ کے بائیں نصف کرہ (Left hemisphere) میں اس نے پایا کہ گویائی اُپج (Speech Production) اور تصویت (Articulation) [7] سے مربوط ہوتا ہے اور دماغ کے اسی حصے کو دریافت کرکے اس نے اپنے نام پر ہی بروکا ایریا کا نام دیا۔ بروکا کو اپنے اس نظریے پر یہ شرف حاصل ہے کہ دماغ میں گویائی کے اپج کا مرکز دماغ کے بائیں جانب قائم ہے۔ اپنے اس ہدف یعنی بروکا ایریا کو بعینہٖ متعین کرنے کے لیے بھی اسے ناموری حاصل رہی۔ اس نے دماغ کے اس حصے کو دریافت کیا تھا جو خلل زبان کا باعث تھا یعنی جو قشر (Cerebral Cortex) کے پیش دماغ لختہ (Frontal Lobe) کی بائیں جانب قائم رہتا ہے۔ اسے یہ کامیابی ضررِ دماغ (Brain damage) اور خلل گویائی (Speech Disorder) کے متعدد مریضوں کے مشاہدوں کے بعد حاصل ہوئی۔

دراصل ہماری ادائیگی الفاظ، نارمل بات چیت، تصورات، نیز تقریری وتحریری زبان میں صحت الفاظ کی بخوبی ادائیگی دماغ کے اسی اہم ترین حصے سے منسوب ہے۔ بروکا ایریا کو حرکی کلامیہ (Motor Speech) حصہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ حرکی قشر دماغ (Motor Cortex) کے قریب درون پیش تلفیف (Inferior Frontal Gyrus) میں واقع ہوتا ہے۔ یہ حصہ بات چیت اور گفتگو کے دوران سانسوں کے زیر و بم پر قابو رکھتا ہے تاکہ بات چیت نارمل انداز میں پایہ تکمیل کو پہنچ جائے۔ اس ضمن میں مزید پیش رفت ہوتی رہی اور یہ اندازہ لگایا گیا کہ بروکا ایریا اور دماغ کے دیگر حصوں میں مزید کوئی ارتباط تسلسل کے امکانات کی تلاش جاری رہی۔ اس سلسلے میں کارل ورِنکی کی تحقیق کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ [8]

کارل ورِنکی (1848 تا 1905) (Carl Wernicke): یہ ایک جرمن طبیب تھا جو بطور عصب نفسی معالج (Neuropsychiatrist) جیسے پیشے سے عملاً وابستہ تھا۔ نیز اس نے دماغی ترکیب وساخت (Brain anatomy) اور امراضیات جیسے میدانوں میں نہایت اہم دریافتیں کیں، اس کا یقین تھا کہ قشر دماغ [9] (Cerebral Cortex) کے حصوں کی خصوصی شناخت کے ذریعے کئی

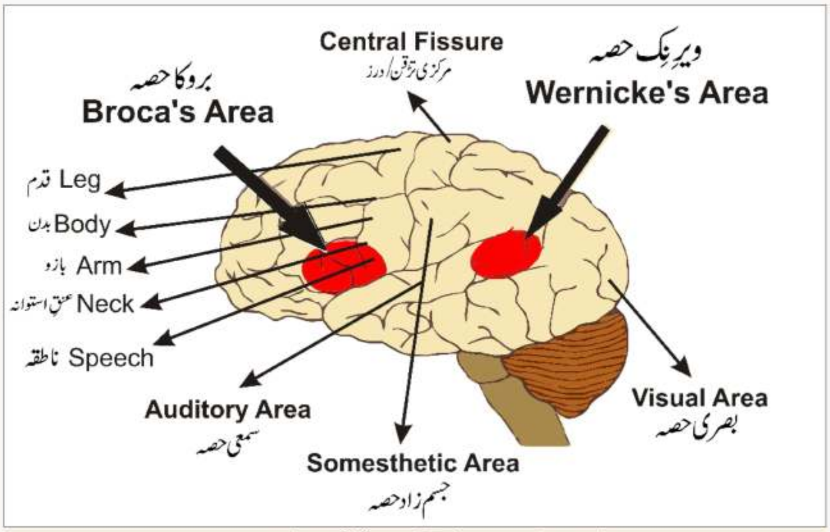

شکل: دماغ کے وہ حصے جو گویائی کی اُپج اور گفتگو پر قابو رکھتے ہیں۔

ذہنی فتور کا سدِّ باب کیا جاسکتا ہے واراس طرح دماغ کے ان حصوں کے افعال کا تعین اور درستی کی جاسکتی ہے۔ وہ بطور ایک ماہر کلامیہ زبان (Speech Language Pathologist) کے بڑی شہرت رکھتا تھا کیوں کہ اس نے فتور گوئی (Aphasid) کے مطالعے کے دوران مغز (Cerebrum) کا گہرا مشاہدہ کیا تھا اور یہ پایا کہ انسانی مغز یعنی دماغ ہی زبان اور گویائی جیسے مظاہر (Phenomena) کا طرف دماغ لختہ (کنپٹی) (Temporal Lobe) کی دماغی تلفیف (Superior Gyrus) میں حصول کرتے ہیں۔

ورنکی کا پیش کردہ یہ ماڈل دماغ کے ایسے خصوصی حصص کے درمیان اتصال کو ظاہر کرتا ہے یعنی دماغ کے مختلف حصے الفاظ کی ادائیگی سے قبل ان کی معنویت سے متعلق اطلاعات مجتمع کرنے کی خاطر باہم ربط قائم کرتے ہیں تبھی وہ زبان کے حرکی حصے کو تحریک دے پاتے ہیں۔

بروکا ایریا اور ورنکی ایریا کا فرق: بروکا ایریا اور ورنکی ایریا دماغ کے وہ حصے ہیں جو زبان کی ادائیگی میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ بروکا ایریا زبان کی اُپج (Language Production) سے منسوب ہوتا ہے جبکہ ورنکی ایریا زبان و بیان کے افہام و ادراک سے تعلق رکھتاے۔ ورنکی ایریا اس عمل پر بالضرور زور دیتا ہے کہ بیان کردہ زبان بامطلب ہو، جبکہ بروکا ایریا اس امر کو یقینی بناتا ہے کہ بیان میں روانی و برجستگی پائی جائے۔ ورنکی ایریا زبان و بیان میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ عقبی اعلیٰ طرف دماغ لختہ [10] (Posterior Superior Temporal Lobe) (یعنی کنپٹی) کو ایک عصبی ردعمل کے ذریعے بروکا ایریا سے مربوط کرتا ہے۔ شہادتوں کی بنا پر یہ ایریا تحریری وتقریری زبان کے طریقہ عمل جیسے صحت الفاظ تجدید یا تخلیق نو کا ردّعمل سے وابستہ رہا ہے۔ شکل ملاحظہ کریں:

ورنکی نے ایک نظریہ تحصیر (Theory of Localisation) [11] تجویز کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ دماغ کے ایسے متعدد حصوں کی شناخت کی جاسکتی ہے جو مختلف انسانی اطوار پر نہ صرف اپنا قابو رکھتے ہیں بلکہ اسے اپنے ردعمل سے مزید کردار و برتاؤ نمودار کرسکتے ہیں۔ بروکا اور ورنکی حصوں کا یہی معاملہ تھا جو باہم ردعمل کے ذریعہ ایک صحت مند زبان کی جانب گامزن تھا۔

حواشی وحوالے

1 لسانی مطالعے۔ ازگیان چندجین، ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی۔ دوسرا ایڈیشن، 1979، ص 32
2 صوتیات اور فونیمیات۔ اقتدار حسین خان۔ قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی 2013، ص 1
3 سہ ماہی فکر و تحقیق، جولائی ستمبر-2015، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ص 23-20
4 ایضاً، ص 24
5 فرہنگِ اصطلاحات۔ فلسفہ نفسیات اور تعلیم۔ ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی، 1988، ص 186
6 ایضاً، ص 30
7 ایضاً، ص 34
8 انٹرنیٹ سے برآمد
9 فرہنگِ اصطلاحات۔ فلسفہ نفسیات اور تعلیم۔ ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی، 1988، ص 55
10 ایضاً، ص 186
11 ایضاً، ص 186

■

Mustafa Nadeem Khan Gauri
Zarrin Villa,
B.11, Green Valley, Roza Bagh,
Aurangabad - 431001 (MS)
Mob: 9604957100

محمد ارشد

اردو زبان کی تدریس میں قواعد کی اہمیت

زبان اظہار رائے اور ادائے مطلب کا سب سے مؤثر اور بہترین وسیلہ ہے۔ جس کے ذریعے انسان ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات ومعلومات کرتا ہے اور اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کرتا ہے۔ عام طور پر زبان معاشرے کے تقاضوں اور سماجی ماحول کے اعتبار سے ظہور پذیر ہوتی ہے اور پروان چڑھتی ہے۔ زبان کی تاریخ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں ضروریات اور تقاضوں کے تحت زبان نے عہد بہ عہد ارتقا کے مدارج طے کی ہیں۔

زبان صرف وسیلۂ اظہار ہی نہیں ہے بلکہ مختلف علوم وفنون کے حاصل کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ سماجی رابطے اور میل جول کا ایک اہم سبب بھی۔ زبان کا انسان کے ذہنی ارتقا سے گہرا تعلق ہے۔ انسانی تہذیب وتمدن نے نظریۂ ارتقا پر عمل کرتے ہوئے مختلف علوم وفنون کو جنم دیا۔ مثلاً فلسفہ وتاریخ، منطق وہیئت، ریاضی وہندسہ، قانون وطب، سماجی علوم، سائنسی حقائق، تقریر وتحریر، تعلیم وتعمیر وغیرہ۔ یہ تمام علوم زبان ہی کی رہینِ منت ہیں۔ دیگر علوم کی طرح زبان بھی بذات خود ایک علم ہے۔ جسے 'علم السنہ' کہا جاتا ہے۔ شاعر اور ادیب کو عوام الناس میں اس لیے برتری حاصل ہے کہ وہ زبان وبیان پر پوری قدرت رکھتا ہے اور الفاظ کے ذریعے کسی واقعہ یا جذبہ واحساس کی

”

کسی زبان کا لفظی ومعنوی ڈھانچہ جن اصولوں پر قائم ہے، اس کا مطالعہ قواعد کا خاص موضوع ہے۔ اس طرح قواعد زبان وبیان کے اس علم کو کہتے ہیں جس میں کسی زبان کی ساخت، مبادیات، الفاظ کی بناوٹ، حالت، اس کے باہمی ربط وضبط، ان کے اقسام، سابقہ ولاحقہ، واحد جمع، تذکیروتانیث اور تراکیب وجملوں کی ترتیب سے بحث کی جاتی ہے۔ قواعد ہی میں الفاظ بنانے کے طریقے، اسما وافعال، ان کی قسمیں، فاعل فعل اور مفعول کی پہچان، مرکبات، جملوں کی شناخت، ان کی ترکیب اور اس طرح کے دیگر مسائل وامور کے مطالعے سے بحث کی جاتی ہے۔

“

ایسی مؤثر تصویر کشی کرتا ہے کہ عام انسانی ذہن کی رسائی وہاں تک نہیں ہو پاتی۔

زبان کا علم لغت، صرف ونحو، علم معانی وبیان اور علم بدیع وغیرہ پر مشتمل ہے۔ شاعری اور نثر کی مختلف اصناف کو بھی زبان کی قلمرو میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ مجموعی طور پر اسے علم ادب کہتے ہیں۔ اول الذکر میں زبان کی لفظیات، مبادیات، اس کی صرفی ونحوی خصوصیات اور فنی محاسن سے بحث کی جاتی ہے، جب کہ موخر الذکر میں زبان کے منثور ومنظوم سرمایے یعنی ادبی تخلیقات سے سروکار رکھا جاتا ہے۔

زبان کا سرمایہ الفاظ ہیں۔ الفاظ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ کلمہ اور مہمل۔ یعنی بامعنی اور بے معنی الفاظ۔ چونکہ قواعد میں صرف بامعنی الفاظ سے بحث کی جاتی ہے۔ اور مہمل الفاظ اپنی کم مائگی کی وجہ سے جلد ہی اپنا اعتبار کھو دیتے ہیں۔ اس لیے قواعد میں اس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کلمے ہی سے کلام میں کام لیا جاتا ہے۔ اگر چند لفظوں میں باہمی ربط وتناسب قائم ہو اور صحیح معنی سامع یا قاری تک پہنچے تو الفاظ کے اس مجموعے کو کلام کہتے ہیں۔

قواعد عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے لغوی معنیٰ ضابطہ، قانون، اصول، طریقہ، اور بنیاد کے ہوتے ہیں۔ نظم وضبط، تنظیم اور ایک خاص نوع کی ترتیب کا مفہوم بھی قواعد میں شامل ہے۔ جب کہ اصطلاح میں قواعد کا مطلب

زبان کی تشکیل و تنظیم کے بنیادی عناصر ہیں۔ کسی زبان کا لفظی ومعنوی ڈھانچہ جن اصولوں پر قائم ہے، اس کا مطالعہ قواعد کا خاص موضوع ہے۔ اس طرح قواعد زبان و بیان کے اس علم کو کہتے ہیں جس میں کسی زبان کی ساخت، مبادیات، الفاظ کی بناوٹ، حالت، اس کے باہمی ربط وضبط، ان کے اقسام، سابقہ ولاحقہ، واحد جمع، تذکیروتانیث اور تراکیب وجملوں کی ترتیب سے بحث کی جاتی ہے۔ قواعد ہی میں الفاظ بنانے کے طریقے، اسما وافعال، ان کی قسمیں، فاعل فعل اور مفعول کی پہچان، مرکبات، جملوں کی شناخت، ان کی ترکیب اور اس طرح کے دیگر مسائل وامور کے مطالعے سے بحث کی جاتی ہے۔

قواعد لسانیات کی ایک اہم شاخ ہے، جس کا مطالعہ زبان پر دسترس حاصل کرنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ کسی بھی زبان کے درست اور صحیح استعمال کا شعور قواعد کے مطالعے کے بغیر ممکن نہیں۔ زبان انسانی معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے اور اسی معاشرتی اہمیت کے تحت زبان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ہے۔ ہر زبان کی تنظیم وتشکیل میں ایک خاص نوع کی ترکیب کارفرما ہوتی ہے۔ اسی کے مطالعے کے لیے قواعد کی ضرورت پڑتی ہے۔

زبان کی آموزش کے لیے قواعد کی ضرورت ہے یا نہیں؟۔ اس سلسلے میں ماہرین تعلیم اور اہلِ زبان کے اختلافات ہیں۔ بعض اہل زبان کا خیال ہے کہ قواعد کی تدریس ہر سطح کے طلبا کے لیے ایک الگ مضمون کی حیثیت سے منضبط طریقے سے پڑھانا نہ صرف ضروری ہے، بلکہ زبان پر عبور حاصل کرنے کے لیے قواعد کا مطالعہ ایک ناگزیر حیثیت رکھتا ہے۔ ان ماہرین زبان کی رائے ہے کہ بغیر قواعد کی تدریس کے زبان میں بہتر صلاحیت ممکن نہیں۔ قواعد کے مطالعے کے بغیر کوئی زبان کی نکتہ رسیوں، باریکیوں اور اس کے اصول وضوابط سے بہتر طور سے آشنا نہیں ہوسکتا۔ بعض ماہرین لسانیات اس سے اتفاق نہیں رکھتے۔ بلکہ وہ اس بات پر مصر ہیں کہ زبان دانی اور اس میں مہارت وصلاحیت حاصل کرنے کے لیے قواعد کی چنداں ضرورت نہیں۔ بالخصوص ابتدائی جماعتوں میں تو اس کی بالکل ضرورت نہیں ہوتی۔ رائے ہے کہ قواعد کو ایک الگ مضمون کی حیثیت سے پڑھانے سے زبان کی آموزش کا عمل اور دشوار ہوجاتا ہے اور بچہ زبان سیکھنے کے عمل کو بوجھ محسوس کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ زبان قواعد کی پابند نہیں ہوتی۔ بلکہ بچہ اپنے سماج اور ماحول سے زبان سیکھ لیتا ہے اور غیر شعوری طور پر زبان کے عملی استعمال سے اس کے بنیادی اصولوں سے واقفیت حاصل کرلیتا ہے۔ کچھ اہلِ زبان دونوں رویوں کی نفی کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ حسب ضرورت ثانوی جماعتوں میں قواعد کی جزوی تدریس کی جانی چاہیے۔ تاکہ کالج اور یونیورسٹی سطح پر تدریس میں درپیش مسائل کو بہ آسانی حل کیا جاسکے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ زبان اور قواعد میں گہرا تعلق ہے۔ اگر مڈل اور ثانوی جماعتوں میں ان ذمے داریوں کو صحیح طور پر محسوس کیا جائے تو اعلیٰ سطح پر پیش آنے والے لسانی مسائل پر بڑی حد تک قابو پایا جاسکتا ہے۔

قواعد کی تدریس طلبا کی لسانی استعداد، ذہنی صلاحیت اور اسباق کی ضرورت کے تحت ہونی چاہیے۔ ابتدائی درجات میں اگر کوئی کام کسی اصول اور سلیقے سے کیا جائے تو اس سے نہ صرف سہولت پیدا ہوتی ہے، بلکہ اس میں ایک طرح کا حسن اور نکھار پیدا ہوتا ہے اور طلبہ کے اندر زبان کی آموزش کا عمل مزید آسان ہوجاتا ہے۔ گویا اردو زبان میں مہارت پیدا کرنے کے لیے اہلِ زبان نے کچھ اصول اور قواعد مقرر کیے ہیں، جس کا مقصد یہ ہے کہ انسان زبان کے استعمال میں غلطی سے بچا رہے اور اپنا مدعا صحیح معنوں میں سامع یا قاری تک پہنچا سکے۔ یہ اصول ابتدائی صورت میں صرف ونحو کہلاتے ہیں اور انتہائی صورت میں فصاحت وبلاغت کے زمرے میں آتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ کوئی زبان قواعد اور اصولوں کے ذریعے پیدا نہیں ہوتی، اور نہ ہی کُلی طور پر قواعد کی پابند ہوتی ہے۔ پہلے زبان وجود میں آتی ہے۔ بعد میں قواعد مرتب کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ زبان کا کچھ حصہ قواعد کی گرفت اور پابندی سے آزاد ہوتا ہے۔ مگر کچھ حصہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کی تنظیم میں قواعد کا عمل دخل موجود رہتا ہے۔ اس لیے زبان کی صحیح جانکاری اور بہتر معلومات کے لیے ان اصول وضوابط پر عمل درآمد کرنا ضروری ہے۔ قواعد کی صحیح جانکاری سے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا ملے گی اور آگے چل کر لسانی خوبیوں اور فنی محاسن سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملے گا۔ طلبا کے اندر قواعد کے متعلق جتنی صحیح معلومات ہوں گی، ان کی ذہنی تربیت اور لسانی تفہیم میں اتنی ہی زیادہ مدد ملے گی۔

کسی بھی زبان کے درست اور صحیح استعمال کا شعور قواعد کے مطالعے کے بغیر ممکن نہیں۔ زبان انسانی معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے اور اسی معاشرتی اہمیت کے تحت زبان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ہے۔

قواعد نویسوں نے لفظوں اور جملوں کو بہ آسانی سمجھنے کے لیے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جسے علم ہجا، علم صرف اور علم نحو کہتے ہیں۔

علم ہجا: وہ علم جس میں زبان کے حروف تہجی کو علیحدہ علیحدہ کرنے، ہجوں کی ساخت اور املا کے بارے میں اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔ اس میں حرکات وسکنات یعنی اصوات (آوازوں) اور اعراب کے متعلق وضاحت کی جاتی ہے۔ اس علم سے حروف کا صحیح تلفظ معلوم ہوجاتا ہے اور اس کا صحیح معیار قائم رہتا ہے۔

علم صرف: قواعد کی وہ قسم جس میں الفاظ کی مختلف حالتوں اور کیفیتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس مطالعے میں الفاظ کی تشکیل، اقسام اور اس میں ہونے والی مختلف تبدیلیوں کا ذکر شامل ہے۔ الفاظ کے باہمی تعلقات اور اس کے تشکیلی مراحل کی شناخت کا علم اس کا خاص موضوع ہے۔

علم نحو: زبان ولسانیات کا وہ حصہ ہے جس میں ہم مرکبات اور جملوں کی بناوٹ کا علم حاصل کرتے ہیں، اور جملوں میں استعمال ہونے والے الفاظ کی مختلف حیثیتوں پر بحث کرتے ہیں۔

حروف تہجی: دوسری زبانوں کی طرح اردو زبان کے بھی اپنے حروف تہجی ہیں۔ اس کی تعداد کے سلسلے میں محققین کے اختلافات ہیں۔ کچھ اہل زبان کے نزدیک اردو کے حروف تہجی کی تعداد 36 ہے۔ بعض کے نزدیک 37 یا 38 ہے اور کچھ اہلِ زبان اس کی تعداد 51 یا 52 بتاتے ہیں۔ اردو زبان عربی، فارسی اور ہندی سے مل کر بنی ہے۔ اس لیے اس کے حروف تہجی میں تینوں زبانوں کے حروف شامل ہیں۔ حروف تہجی دو قسم کے ہوتے ہیں مفرد حروف اور مرکب حروف۔ مفرد حروف کی تعداد 36 ہے، جن میں سے بیشتر عربی زبان سے اخذ کیے گئے ہیں۔ جب کہ 5 حروف (پ، چ، ژ، گ، ے) فارسی سے مستعار ہیں۔ اور باقی تین حروف (ٹ، ڈ، ڑ) ہندی الاصل ہیں۔ اس اعتبار سے اردو کے بنیادی حروف تہجی کی تعداد +28) (5+3=36 ہوجاتی ہیں۔ فارسی زبان سے لیے گئے حروف میں سے 'ژ' کے علاوہ باقی چار حروف ہندی میں

بھی مستعمل ہیں جب کہ 'ژ' خالص فارسی حرف ہیں، جو فارسی میں بھی چند الفاظ میں استعمال ہوئے ہیں۔

اس کے بعد مرکب حروف۔ وہ حروف جو ہائے دوچشمی ھ (مخلوط) سے مل کر بنتے ہیں۔ یہ کل تعداد میں 15 ہیں۔ بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، رھ، ڑھ، کھ، گھ، لھ، مھ، نھ۔ اس طرح 15 ہکاری آوازوں کو ملا کر حروف تہجی کی تعداد 51 ہوجاتی ہے۔ ہمزہ (ء) کے بارے میں ابھی تک یہ تعین نہیں ہوسکا ہے کہ یہ حرف ہے یا علامت۔ چونکہ یہ زیادہ تر بطور اضافت/علامت کے استعمال ہوئے ہیں۔ جیسے ذرائع، نتائج وغیرہ۔ مگر پرانی اردو کتابوں میں یہ حرف کے طور پر بھی لکھا گیا ہے۔ اور کہیں کہیں یہ بطورِ علامت بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے دائرہ، مسئلہ وغیرہ۔ دراصل حروف تہجی کا مسئلہ خالصتاً لسانیاتی اور صوتیاتی ہے۔ اس لیے اسی روشنی میں اس کا حل تلاش کرنا چاہیے۔ 'آ' اور 'لا' یہ مرکب حروف ہیں۔ اس لیے اب ان کا بھی شمار بنیادی حروف تہجی میں نہیں ہوتا ہے۔ اردو میں حروف عِلت (Vowel) تین ہیں 'ا' 'و' اور 'ی'۔ انھیں لسانیات میں مصوتہ کہتے ہیں، جن کے استعمال سے لفظ میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ باقی آوازیں حروف صحیح (Consonant) ہیں جنھیں مصمتہ کہتے ہیں، جو کسی علامت یا حرکت (زیر، زبر، پیش،) کے ملائے بغیر کوئی آواز پیدا نہیں کرتے۔ اردو کا حروف تہجی دیگر زبانوں کے مقابلے میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے جس میں ہر قسم کی آواز کو ادا کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ اس اعتبار سے اردو زبان کا ابجد دنیا کی بیشتر زبانوں میں خصوصی امتیازات کا حامل ہے۔

یہ بات مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ اردو میں حروف تہجی کی کئی کئی شکلیں ہوتی ہیں۔ اور ایک ہی حرف کے کئی اشکال ہوتے ہیں۔ ان کو کئی طریقوں سے لکھا جاتا ہے اور کچھ حروف مخلوط طریقے سے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ عام طور پر اردو میں حروف تہجی کی دو شکلیں ہوتی ہیں۔ چھوٹی اور بڑی شکل یا آدھی اور مکمل شکل۔ کچھ حروف کی دونوں شکلیں ہوتی ہیں اور کچھ ایسے حروف ہیں، جہاں لکھے جاتے ہیں مکمل ہی لکھے جاتے ہیں جیسے (ا، د، ذ، ڈ، ر، ز، ڑ، ط، ظ، و)۔ ہندی کی بہ نسبت اردو زبان کا املا اور رسم الخط قدرے دشوار اور پیچیدہ ہے۔ تحریری عمل کے دوران ایک ہی حرف کی شکل اپنے محل استعمال کے اعتبار سے بدل جاتی ہے۔ کسی لفظ کے شروع میں اس کی شکل کچھ ہوتی ہے۔ جب کہ درمیان اور آخر میں اس کی لکھاوٹ یکسر مختلف ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ کسی لفظ کے شروع اور درمیان میں کسی حرف کی آدھی یا چھوٹی شکل ہی استعمال ہوتی ہے۔ بہ استثنائے (ا، د، ذ، ڈ، ر، ز، ڑ، ط، ظ، و) وغیرہ کیونکہ یہ حروف جہاں بھی آتے ہیں بعینہٖ لکھے جاتے ہیں۔ کسی حرف کی بڑی یا مکمل شکل صرف لفظ کے آخر میں ہی عموماً استعمال ہوتی ہے۔ اردو زبان کے حروف تہجی کے لکھنے کے دوران سب سے بڑا مسئلہ حروف کے جوڑنے اور ملانے کا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی ایسا اصول وضع نہیں کیا گیا ہے جو ہماری رہنمائی کر سکے۔ کیونکہ زبان کی آموزش کے دوران خود بخود یہ ہمارے مزاج سے ہم آہنگ ہوکر ہمارے لاشعور کا حصہ بن جاتا ہے۔ املا اور نقل کے دوران ہم اس بات سے اچھی طرح واقف ہوجاتے ہیں کہ کس حرف کو کس سے ملا کر لکھا جائے، اور کس سے الگ رکھا جائے۔ یہاں پر دو باتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے، جس سے لکھنے کا عمل آسان اور سہل ہوجاتا ہے۔ وہ حروف جن کی آدھی شکل ہوتی ہے یا سرے والے حروف جیسے (ب، ج، س، ض، ط، ع، ف، ق) وغیرہ۔ یہ خود بھی دوسرے حروف سے جڑ جاتے ہیں اور دوسرے حروف کو اپنے ساتھ ملانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ آٹھ حروف (ا، د، ذ، ڈ، ر، ز، ر، و) باقی حروف کی بہ نسبت قدرے مختلف ہیں۔ کیونکہ ان حروف کی خاصیت یہ ہے کہ یہ اپنے پہلے آنے والے حرف سے تو جڑ جاتے ہیں۔ لیکن اپنے بعد آنے والے حرف سے نہیں جڑ پاتے۔ جیسے ب+ا=با، ا+ب=اب۔ اس بات کو لفظ قسطنطنیہ اور 'واردات' سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ پہلے لفظ میں آٹھ حروف جو باہم مربوط ہیں۔ جب کہ دوسرے لفظ میں چھ حروف ہیں جو سب الگ الگ لکھے گئے ہیں۔ کیونکہ ان میں سارے حروف ان اصول کے تحت آتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ باقی سارے الفاظ کا اطلاق انھیں اصولوں پر کیا جاسکتا ہے۔ اگر دورانِ تدریس لکھنے کے عمل کے دوران ان اصولوں اور طریقوں کو ملحوظ رکھا جائے تو تحریری عمل کو دلچسپ، مؤثر اور نسبتاً آسان بنایا جاسکتا ہے۔

اردو زبان کے حروف تہجی کے لکھنے کے دوران سب سے بڑا مسئلہ حروف کے جوڑنے اور ملانے کا ہے. اس سلسلے میں کوئی ایسا اصول وضع نہیں کیا گیا ہے جو ہماری رہنمائی کر سکے. کیونکہ زبان کی آموزش کے دوران خود بخود یہ ہمارے مزاج سے ہم آہنگ ہوکر ہمارے لاشعور کا حصہ بن جاتا ہے. املا اور نقل کے دوران ہم اس بات سے اچھی طرح واقف ہوجاتے ہیں کہ کس حرف کو کس سے ملاکر لکھا جائے، اور کس سے الگ رکھا جائے.

ہائے ہوز (ہ) اور ہائے دوچشمی (ھ) میں فرق:
عربی اور فارسی میں ہائیہ اور ہکاری آوازیں نہیں ہوتیں۔ اس لیے ان میں ہ اور ھ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن اردو میں ان کے درمیان بنیادی فرق موجود ہے۔ جس پر بہت توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اردو میں 'ہ' مفرد حرف ہے، جس کی باقاعدہ مستقل آواز ہے۔ جب کہ ھ کبھی تنہا نہیں آتا۔ اردو میں ھ کا استعمال ہکاریت کو واضح کرنے کے لیے یا مرکب حروف تہجی بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے، جس کا بنیادی مقصد مخلوط آواز کو ظاہر کرنا ہے۔ جیسے بھ، جھ، دھ، کھ، گھ، لھ وغیرہ۔ اردو میں ھ کی کوئی مستقل آواز نہیں۔ بلکہ ہمیشہ اسے کسی دوسرے حرف کے ساتھ ملا کر پڑھا اور لکھا جاتا ہے۔ اور نہ ہی کبھی کسی لفظ کے شروع میں استعمال ہوتا ہے۔ ھ اردو میں ہندی کے توسط سے آئی ہے، جو صرف چند حرفوں کے ساتھ مستعمل ہوئی ہے۔ قدیم اردو عبارتوں میں عربی کا رواج عام تھا، جس سے ہ اور ھ میں کوئی تخصیص نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اب جدید املا اور قواعد میں ان دونوں کو باقاعدہ الگ کر دیا گیا ہے۔ اس لیے اب 'ھمارا' ھادی' اور 'ھوا' کو ہمارا' ہادی اور ہوا کے طور پر لکھنا مناسب اور درست ہے۔

پڑھنے والا اگر بکر ہے تو ہم کہیں گے کہ بکر فاعل ہے۔ جب کہ اسم فاعل میں نام واضح نہیں کرتے۔ بلکہ یہ کہیں گے کہ 'پڑھنے والے نے پڑھا' تو اس جملے میں 'پڑھنے والے' اسم فاعل ہے۔ یہی صورت حال ضمیر کے ساتھ ہے۔ ضمیر اردو میں جن معنوں میں مستعمل ہے، اس سے بڑھ کر لوگوں کو نہیں معلوم کہ اس کا ضمیر زندہ ہے یا مرچکا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اسم کی جگہ استعمال ہونے والے الفاظ ضمیر کہلاتے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ضمیر کو کسی عام فہم اردو الفاظ سے بدل کر اس کی تدریس کا کوئی آسان طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

جمع اور اسم جمع کے مابین فرق: طلبہ اکثر و بیشتر جمع اور اسم جمع کو ایک ہی چیز سمجھ لیتے ہیں۔ قواعدِ زبان میں ایسا لفظ جو بظاہر واحد معلوم ہوتا ہے۔ مگر درحقیقت کئی اسموں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اسم جمع کہلاتا ہے۔ جیسے 'فوج' قوم'

جماعت' لشکر' ہیں۔ محفل' انجمن' گروہ' بھیڑ' قطار وغیرہ الفاظ اسم جمع کہلاتے ہیں۔

جمع اور اسم جمع میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جمع کے مقابلے میں واحد موجود ہوتا ہے۔ جیسے مضامین، مساجد، خطوط وغیرہ کی واحد مضمون، مسجد اور خط ہے۔ مگر اسم جمع کے مقابلے میں واحد نہیں ہوتا۔ جیسے فوج، لشکر، جماعت وغیرہ۔ مگر ہاں واحد کی طرح اسم جمع کو جمع بنایا جاسکتا ہے۔ جیسے لشکر سے لشکروں، قوم سے قوموں وغیرہ۔

واحد اور جمع کے اصول: واحد اور جمع کا مسئلہ قواعد کی اس شاخ سے تعلق رکھتا ہے جس میں لفظوں کی صرفی خصوصیات سے بحث کی جاتی ہے۔ عربی اور فارسی بہ نسبت اردو میں یہ مسئلہ زیادہ پیچیدہ ہے۔ کیونکہ اردو میں واحد اور جمع کے بارے میں تین طرح کے قواعد اصول مستعمل ہیں:

(1) فارسی طرز کے اصول (2) عربی طرز کے اصول اور (3) ہندی طرز کے اصول۔

مثال کے طور پر غالب نے اپنے ایک شعر میں 'نوازش' کی جمع 'نوازش ہا' اور شکایت' کی جمع 'شکایت ہا' استعمال کی ہے۔ کسی اسم کے آخر میں 'ہا' بڑھا کر جمع بنانے کا یہ طریقہ فارسی سے مختص ہے۔ عربی اصول پر ان کی جمع نوازشات اور شکایات ہوں گی۔ جب کہ ہندی قاعدے کے مطابق ان الفاظ کی جمع نوازشوں اور شکایتوں ہوگی۔

جمع بنانے کا یہ طریقہ اب صرف مرکبات کی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔ شاعری سے الگ شاذ و نادر ہی اس کا استعمال ملتا ہے، جو صرف شاعری اور اعلیٰ نثر کے لیے موزوں ہے۔ اس طرح اقبال نے ایک جگہ 'لغت ہائے حجازی' کی ترکیب استعمال کی ہے۔ اردو شاعری پر ایک سرسری نگاہ ڈالیے تو اس طرح کی بے شمار ترکیبیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مثلاً پارہ ہائے دل، نسخہ ہائے وفا، مژہائے دراز، نوازہائے راز وغیرہ۔ روزمرہ اور بول چال کی زبان میں عموماً ہندی طریقہ مروج ہے۔ جب کہ علمی زبان اور ادبی تحریروں میں ہندی کے ساتھ عربی اصول بھی مستعمل ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہندی طرز واحد جمع کے ساتھ عربی کے چند ایسے اوزان بالخصوص جمع سالم، جمع مکسر اور جمع الجمع سے واقفیت نہایت ضروری ہے، جن میں ڈھلے ہوئے صیغے جمع کے الفاظ اردو میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً اشجار، علوم، اقسام، احکام، اطبا اور مکاتیب وغیرہ۔

اردو میں تذکیر و تانیث دو طرح کے ہوتے ہیں۔ جنس حقیقی اور جنس غیر حقیقی۔ جنس حقیقی میں مذکر و مؤنث الفاظ کی شناخت کرنا نسبتاً آسان ہے۔ کیونکہ ان میں تذکیر و تانیث فطری اصول کے تابع ہوتے ہیں۔ واحد اور جمع کی طرح مذکر اور مؤنث کے تعین کے لیے واضح اصول موجود ہیں۔ جیسے غلام باندی، شہزادہ شہزادی، جمیل جمیلہ ہاتھی ہتھنی وغیرہ۔ لیکن جنس غیر حقیقی کی تذکیر و تانیث کا مسئلہ سراسر قیاسی اور سماعی ہے۔ ان میں نر اور مادے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ ان میں کسی لفظ کے مذکر و مؤنث ہونے کا انحصار بنیادی طور پر اس بات پر ہے کہ اہل زبان انھیں کس طرح استعمال کرتے ہیں۔

بعض اہل زبان اور قواعد نویسوں نے بے جان چیزوں کی تذکیر و تانیث کے لیے کچھ اصول اور قاعدے بیان کیے ہیں، جس سے آگاہی رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ معاشرے میں طے شدہ لسانی روایات کو سامنے رکھ کر کچھ اشارے ضرور اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی اسم کے شروع میں ضمیر کی اضافی حالت لگانے سے بھی تذکیر و تانیث کی پہچان کی جاسکتی ہے۔ جیسے میرا گھر، تمھاری کتاب، ہمارا ملک، اس کی کرسی وغیرہ۔ اگر کسی اسم کے شروع میں اس کا، تمھارا میرا/ ہمارا لگا ہو تو وہ مذکر ہوگا۔ اگر اس کی، تمھاری، میری وغیرہ کا استعمال ہو تو وہ مؤنث کہلائے گا۔

اصطلاحاً دو الفاظ کے درمیان نسبت یا تعلق ظاہر کرنے کی علامت ہی اضافت کہلاتی ہے۔ جب ایک اسم کی دوسرے اسم سے نسبت یا تعلق بیان کی جائے تو قواعد کی رو سے اسے اضافت کہتے ہیں۔ جس اسم کا تعلق ظاہر کیا جائے اسے مضاف اور جس سے نسبت یا تعلق قائم ہو اسے مضاف الیہ کہتے ہیں۔ دونوں کے مجموعے کو مرکب اضافی کہتے ہیں۔ جیسے اکبر کا قلم، برسات کا پانی، احمد کا گھوڑا وغیرہ۔ اردو میں مضاف الیہ پہلے اور مضاف بعد میں آتا ہے۔

اردو میں مستعمل فارسی قاعدے کے مطابق مضاف مقدم اور کسرۂ اضافت اسے مضاف الیہ سے ملاتا ہے۔ جیسے دردِ دل، خانۂ خدا، شدتِ غم وغیرہ۔ اردو میں اضافتیں تین طرح سے استعمال کی جاتی ہیں۔

(1) جب دو عربی یا فارسی الفاظ اکٹھے جمع ہوں اور پہلے لفظ کا آخری حرف 'الف' یا 'واؤ' پر ختم ہو تو وہاں یائے اضافت کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے بوئے گل، افشائے راز، ابتدائے عشق، شعرائے بنارس، صدائے وقت وغیرہ۔

(2) اگر مضاف کے آخر میں 'ہ' یا 'ی' ہو تو وہاں اضافت کے لیے ہمزہ لگائیں گے۔

جیسے نقطۂ نظر، سایۂ دیوار، ناقۂ لیلیٰ، کرۂ ارض وغیرہ، لیکن جن الفاظ کے آخری حرف 'ہ' میں ایک ہی مکمل آواز نکلتی ہے تو وہاں کسرہ کا استعمال زیادہ مناسب ہے جیسے نگاہِ کرم، راہِ نجات وغیرہ۔

(3) یائے اضافت اور ہمزہ اضافت کو چھوڑ کر باقی تمام جگہ کسرہ اضافت (ِ) استعمال ہوگی۔ محبوبِ حقیقی، آزادیِ وطن، قابلِ تحسین، رعنائیِ خیال وغیرہ۔

زیر، ہمزہ اور یائے کی مدد سے جن دو الفاظ میں تعلق ظاہر کیا جائے ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ دونوں ایک ہی زبان کے الفاظ ہوں۔ ہندی اور فارسی کا مرکب درست نہیں مانا جاتا۔ جیسے گل لالہ کی جگہ پھول لالہ کی ترکیب معیوب سمجھی جائے گی۔ اسی طرح عربی فارسی کا مرکب بنانا بھی قواعد کی رو سے صحیح نہیں ہوگا۔ جیسے راہِ مستقیم، اور صراطِ راست، کی جگہ 'صراط مستقیم' اور راہِ راست لکھنا ہی زیادہ فصیح مانا جائے گا۔ تاہم اردو میں کچھ مستثنیات ہیں جو راہ پا چکی ہیں اور جنھیں قبول کر لیا گیا ہے۔ جیسے ہندی اور فارسی کا مرکب لبِ سڑک اور موسمِ برسات۔ اسی طرح عربی اور فارسی کا امتزاج بھی رائج ہے۔ جیسے شبِ قدر، روزِ قیامت وغیرہ۔

فارسی زبان سے عدم واقفیت کی وجہ ہم ان خوبصورت الفاظ و تراکیب سے بے بہرہ ہور ہے ہیں، جو اردو زبان کا فطری جوہر ہے۔ آج کل طلبہ ہی نہیں بلکہ پڑھے لکھے اساتذہ اور شاعر و ادیب بھی ان تراکیب کے استعمال میں فاش غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ جہاں اضافت کا استعمال ہونا چاہیے، فارسی زبان سے ناآشنائی کی وجہ سے وہاں اضافت چھوڑ دیتے ہیں۔ جہاں اضافت نہیں ہونی چاہیے وہاں اضافت کا بے جا استعمال کرتے ہیں۔ جیسے پس منظر (پس کسرۂ اضافت کے بغیر) دست نگر (دست بغیر کسرۂ اضافت کے) جان آفریں (جاں کسرۂ اضافت کے بغیر)۔ اس طرح کی ترکیب کو بھی اضافت کہتے ہیں، مگر اس کا شمار اضافت مقلوب میں ہوتا ہے۔

کسرۂ اضافت کے غلط استعمال سے اردو زبان کا حسن غارت ہور ہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو میں اعراب لگانے کا رواج یکسر ختم ہور ہا ہے۔ جس کی وجہ سے کسرۂ اضافت بھی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کا ایک نقصان یہ ہور ہا ہے کہ اب اس کی وجہ بے ڈھڑک 'ے' لکھتے چلے جاتے ہیں جس سے زبان کی خوبصورتی بگڑ رہی ہے۔ جیسے نامے خدا، قابلے تعریف، تہے دل، صمیمے قلب وغیرہ۔ اس طرح کی صریح غلطی آجکل دوران عام ہوتی جارہی ہے۔

دو لفظوں کو آپس میں ملانے کے لیے جس 'و' کا استعمال ہوتا ہے اسے واو عطف کہتے ہیں۔ اس کے استعمال کے لیے درج ذیل باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

کسی زبان پر مکمل عبور اور اس کی کلاسیکی ادبی روایات سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ زبان و بیان کے اسرار و رموز سے واقفیت ہو۔ اس کے بنیادی نکات کا علم ہو۔ زبان کے لسانی مطالعے کی اہمیت سے باخبر ہو۔ قواعد واملا کے اصولوں سے شناسائی ہو۔ تہذیبی روایات کا اچھا شعور رکھتا ہو۔

(1) جن دو لفظوں کے درمیان 'و' لانی ہو وہ دونوں واحد ہونے چاہئیں یا دونوں جمع۔ ایک جمع اور ایک واحد تو وہاں 'و' کا استعمال کرنا مناسب نہیں۔ جیسے گل وبلبلیں اور حقوق وفرض کی جگہ گل وبلبل اور حقوق وفرائض لکھنا درست ہے۔

(2) جن دو لفظوں کے درمیان 'و' کا استعمال ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دونوں ایک ہی زبان کے لفظ ہوں جیسے ارض وسماء، جدوجہد۔ عربی فارسی کی ترکیب مناسب ہے جیسے امید ویاس۔ لیکن فارسی اور اردو کی ترکیب درست نہیں جیسے روزورات کی جگہ روز وشب ہی فصیح ہے۔

(3) جن دو لفظوں کے درمیان 'و' لایا جائے انھیں املا کی رو سے الگ لکھنا چاہیے لیکن اسے ملا کر پڑھنا چاہیے۔

اردو، عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں اوقاف وعلامات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کا لحاظ نہ رکھا گیا تو عبارت کا مطلب کچھ کا کچھ ہوجاتا ہے۔ بسا اوقات تو اس کا مفہوم بالکل برعکس ہوجاتا ہے۔ اس لیے املا اور عبارت نویسی کے دوران اردو میں مستعمل ہونے والی خاص علامتیں جیسے ختمہ (۔)، سوالیہ /استفہامیہ (؟)، سکتہ (،) واوین (" ") اور قوسین () کا علم ہونا اور اس کے برمحل استعمال کا سلیقہ ہونا اشد ضروری ہے۔ تاکہ عبارت یا جملے کا درست اور صحیح مطلب سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

وقت اس امر کا متقاضی ہے کہ ہم بطور اساتذہ طالب علموں کو صرف اردو پڑھانے پر اکتفا نہ کریں۔ بلکہ اس کی لسانی خصوصیات، صوتی حسن، صرفی ونحوی خصوصیات، سماجی اہمیت، تہذیبی ومعاشرتی افادیت اور ہمہ گیریت کا احساس وشعور بھی کرائیں۔ کسی زبان پر مکمل عبور اور اس کی کلاسیکی ادبی روایات سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ زبان وبیان کے اسرار ورموز سے واقفیت ہو۔ اس کے بنیادی نکات کا علم ہو۔ زبان کے لسانی مطالعے کی اہمیت سے باخبر ہو۔ قواعد واملا کے اصولوں سے شناسائی ہو۔ تہذیبی روایات کا اچھا شعور رکھتا ہو۔ یہ بات اسی وقت ممکن ہے کہ اس عمل میں استاد کس حد تک جدت طرازی سے کام لیتا ہے۔ اس لیے اب طلبہ کی تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کی نوک پلک سنوارنا، حتیٰ کہ املا ونقل سے لے کر رسم الخط اور تلفظ کی درستگی تک منازل طے کرانا اساتذہ کی اضافی ذمے داری ہے۔ کیونکہ اب اردو کے تعلیمی میدان میں جو نسلیں آرہی ہیں ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہیں جن کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہے۔ ان کی اردو تعلیم واجبی ہوتی ہے۔ ان کی بنیادیں بہت کمزور ہوتی ہیں۔ ان کا پس منظر نہ اردو زبان ہے نہ ہی کلچر۔ نہ ہی زبان کی ثقافتی قدر وقیمت سے باخبر ہیں۔ ان کے گھر، خاندان اور اطراف میں اردو زبان کا نہ وہ رواج اور چلن باقی ہے جو ہماری تہذیبی معاشرت کا حصہ ہے۔ وہ اردو زبان کی دلکشی ولطافت کے قائل تو ہیں، لیکن اس زبان کے سیکھنے کے تئیں سنجیدگی کا فقدان ہے۔ ان کے گھروں میں اردو زبان کے تئیں محبت اور اپنائیت کی جگہ اجنبیت اور کمتری کے احساس نے لے لی ہے۔ بہ حالت مجبوری وہ اردو کی تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ لیکن اسے اپنے مزاج سے ہم آہنگ نہیں کرپارہے ہیں۔ یہی طلبہ جب کالج اور یونیورسٹی میں داخلہ لیتے ہیں تو املا اور تلفظ کے حوالے سے انھیں بہت سی لسانی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کے اندر اس بات کی فہم نہیں ہوتی ہے کہ کہاں 'ہ' کا استعمال ہونا چاہیے اور کہاں 'ھ' کا اور 'ح' مستعمل ہونی چاہیے۔ اس لیے زیادہ تر جنھیں کی جگہ جنہیں اور تمھارا کے بجائے تمہارا لکھ دیتے ہیں۔ ہم آواز حروف کے استعمال میں امتیاز نہیں کرپاتے۔ رموز واوقاف نہ ہونے کی وجہ سے بعض اوقات طالب علموں کو بہت مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کہاں قوسین اور کہاں واوین کا استعمال ہونا چاہیے۔ ان کے اندر استفہامیہ، خطابیہ اور اختتامیہ جیسے جملوں کی سوجھ بوجھ نہیں ہوتی۔ وہ جملہ سازی کے وقت فاعل، فعل اور مفعول کی موزوں ترکیب کا خیال نہیں رکھ پاتے، جس سے خوبصورت اور فصیح وبلیغ جملہ بنانے سے قاصر رہتے ہیں۔ کیونکہ ایک اچھے جملے میں لفظوں کی ترکیب کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے۔ یعنی جملہ بناتے وقت الفاظ کی وہی ترکیب بامعنی اور مناسب ہوگی جو عام طول چال کے مطابق ہو۔ اسی قسم کی بے شمار غلطیاں ثانوی سطح پر ہی نہیں بلکہ اعلیٰ سطح پر عام ہوتی جارہی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ قواعد کے اصولوں اور بنیادی نکات سے عدم واقفیت اور اسکولی سطح پر اردو کی تعلیم میں قواعد کی تدریس پر عدم توجہی بھی ہوسکتی ہے۔

اہل مغرب نے اٹھارہویں صدی کے اوائل سے ہی اردو قواعد کی تدوین وترتیب شروع کردی تھی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام جان جوشوا کٹیلر کا ہے جنھوں نے لاطینی زبان میں 1715 میں اردو قواعد مرتب کی۔ انیسویں صدی تک اس حوالے سے بنجامن شلز، جارج ہیڈلے، پلاٹ، فوربس اور مسٹر گلسٹن اور جان گل کرائسٹ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ہندوستانی مصنفین میں سب سے پہلا نام امانت اللہ شیدا کا ہے جنھوں نے 1806 میں ایک رسالہ 'صرف ونحو' لکھا۔ جس میں اردو قواعد کے ابتدائی اصولوں سے بحث کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم نام انشاء اللہ خاں انشا کا ہے جنھوں نے 1807 میں قواعد کے حوالے سے 'دریائے لطافت' لکھی، جو اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ اسی زمانے میں میر بہادر علی حسینی نے 'گل کرائسٹ کی' قواعد اردو' کا ترجمہ کیا۔ محمد ابراہیم نے 1823 میں اپنی قواعد مرتب کی۔ مولوی احمد علی دہلوی کی فیض کا چشمہ (1825)، سرسید احمد خان کا رسالہ اردو صرف ونحو (1842) اور مولوی امام بخش صہبائی کی اردو صرف ونحو (1849) اس سلسلے کی اہم کڑی ہیں۔ مذکورہ ہندوستانی مصنفین کی کتابیں عربی، فارسی قواعد کے زیر اثر لکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں میں اردو کو ایک مقامی زبان کے طور پر دیکھنے کا رجحان نہیں ملتا۔ مولوی عبدالحق اردو کے پہلے قواعد نویس ہیں، جنھوں نے اردو کو ایک ہند آریائی زبان کے طور پر دیکھا۔ اور انھوں نے آریائی پراکرت کے تتبع میں مفصل اور معیاری کتاب قواعد اردو (1916) مرتب کی۔ اس کے بعد سیکڑوں کتابیں منظر عام پر آئیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی مولوی عبدالحق کی قوعد اردو کے معیار تک نہیں پہنچ پائی۔

■

Dr. Mohammad Arshad
Assistant Professor (Urdu)
M.B.S. P. G. College
Gangapur, Varanasi, 221302
Mob.: 9793890815
E-mail ID-ma881486@gmail.com

قاسم فریدی

نعیم الحق مسرورِ اورنگ آبادی

بحیثیت غزل گو

غزل اردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے۔اس میں ایجاز واختصار کا جوحسن ہے وہ صاحب ذوق حضرات کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔غزل میں ایمائیت کے ذریعے حسن پیدا کیا جاتا ہے۔ایمائیت اوراشاریت شعری تخلیقات کو معنی خیز بناتی ہیں۔شاعر ان کے ذریعے غیر معمولی مطالب کو بڑے معنی خیز انداز میں بیان کرتا ہے۔

اورنگ آباد کی سرزمین شعروشاعری کے اعتبار سے بڑی زرخیز ہے۔شفق عماد پوری، واعظ الحق مسرور اورنگ آبادی، سید احمد عروج قادری، ذبیح کیراپی، گستاخ کٹمبوی، زکی اورنگ آبادی سے لے کر محفوظ الحسن اشعری، مناظر احسن فرید، جمال الدین ساحل، ناشاد اورنگ آبادی، شبیر حسن شبیر، تسلیم انجم اور نظام قریشی کے ساتھ بالکل نئی نسل میں گلفام صدیقی، یوسف جمیل، اقبال دل، آفتاب رانا، شبلی فردوسی تک ایک طویل سلسلہ ہنوز قائم ہے۔ان میں سے بیشتر شعرا کی ادبی وشعری سرگرمیوں سے اردو دنیا خوب واقف ہے لیکن چند ایسے قلمکار بھی ہیں جو خاموشی سے اردو کے شعری گلشن میں گل بوٹے ٹانکتے رہے مگر اس کے باوجود بہار کی شعری تاریخ میں ان کا تعارف اب تک نامکمل ہے اور اردو کے معتبر نقادوں نے ان کے فن پر قلم اٹھانے سے گریز کیا ہے۔نعیم الحق مسرور اورنگ آبادی کے دوشعری مجموعے 'فریب زندگی' اور 'نوائے مسرور' شائع ہو چکے ہیں اور جس کے مرتبین بالترتیب ڈاکٹر زین رامش اور ڈاکٹر ریاض الدین نیر ہیں۔اس کے علاوہ جناب نعیم الحق مسرور اورنگ آبادی کی شخصیت اور شاعری پر تیسری کتاب بعنوان 'مسرور اورنگ آبادی — شخصیت اور فن' کے مرتب ڈاکٹر سید اعتصام الحق ہیں۔اس کتاب میں نعیم الحق مسرور کے دونوں شعری مجموعوں 'فریب زندگی' اور 'نوائے مسرور' کی غزلوں اور نظموں کا انتخاب بھی شامل ہے۔حیرت کی بات ہے کہ جس شاعر کے کھاتے میں دو شعری مجموعے ہوں اور اس کے فن وشخصیت پر ایک مکمل کتاب موجود ہو اور قارئین کے لیے یہ خبر بھی مسرت بخش ہوگی کہ راقم السطور کی نگرانی میں ڈاکٹر سنجر امام کو دسمبر 2016 میں مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بعنوان 'نعیم الحق مسرور — حیات اور شاعری' تفویض کی جا چکی ہے، ایسے شاعر کا شمار بہار کی اردو غزل گوئی کی تاریخ میں نہ کیا جانا دیانت داری نہیں ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ متعدد قلمکاروں کی طرح نعیم الحق مسرور کو بھی نظرانداز کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔البتہ چند اہل قلم حضرات نے ان کے کلام پر اپنی رائے دی ہے مگر احتیاط کے ساتھ۔ جب کہ ان کی غزلوں کا مطالعہ انھیں ایک کامیاب اور قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے متعارف کراتا ہے۔

نعیم الحق مسرور بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے نظمیں بھی کہی اور قطعات بھی لکھے ہیں مگر غزلوں میں ان کا تخلیقی جوہر زیادہ کھلتا ہے۔ان کی غزلوں میں فکر وخیال کی رعنائیاں بھی ملتی ہیں اور رنج وغم میں ڈوبے تصورات بھی، مگر ان کی شادابی فکر، غم والم کے مواقع اور نامساعد حالات میں بھی خوش دلی کے ساتھ زندگی گزارنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔اشعار دیکھیے۔

چمن اداس ہے جان بہار آجاؤ
ہجوم غم میں بھی مسرور پھر غزل خواں ہے

غم میرا شناسا ہے دل غم کا شناسا ہے
یہ میرا مقدر ہے یہ زیست کا ساماں ہے

چمن کا پتا پتا جانتا ہے اس حقیقت کو
کہ کس کس طور سے ہم نے گزارا ہے یہاں ساقی

غم دل کی قسم مسرور ہوں میں اپنی حالت پر
کہ لے پیرِ فلک جتنا بھی چاہے امتحاں ساقی

غم دل اور ہجوم غم جیسی ترکیبیں مسرور اورنگ آبادی کی غزل کے حسن میں اضافے کا سبب بنتی ہیں۔اس طرح کے اشعار غم کی مختلف کیفیتوں کا اظہار ہیں۔شاعر نے اپنے چمن کو غم دل اور ہجوم غم سے آباد کیا ہے۔ان کی غزل میں غم دل اور ہجوم غم ہی سرمایہ حیات بن گئے ہیں۔ان کے یہاں غم دل میں بھی ایک سرور اور سرشاری کی کیفیت نظر آتی ہے۔اس طرح اگر دیکھا جائے تو مسرور اورنگ آبادی نے اپنے دل میں بسے ہوئے غموں سے بخوبی زندگی کا کام لیا ہے۔

نعیم الحق مسرور اورنگ آبادی کی غزلوں کی ایک خوبی سادگی اور سلاست ہے۔وہ روایتی اور کلاسیکی رنگ کی غزلوں کی تخلیق میں اپنے ہم عصروں سے منفرد نظر آتے ہیں۔لطیف اظہار بیان کی خوبصورت مثال دیکھیے۔

مسرور آشنائے محبت سے پوچھ لو
جو لطف ہے دعا میں کہاں وہ اثر میں ہے

آپ چن لیجیے درّ نایاب
ہم بھی دامن میں سنگ بھر لیں گے

اپنے آئینۂ دل میں بھی ہے صورت ان کی
اک مسلماں کو بھی الفت ہے صنم خانے سے

ان اشعار کو اگر بغور دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مسرور اورنگ آبادی نے نہ صرف اردو کی شعری روایت سے استفادہ کیا ہے بلکہ اپنے لطیف جذبے اور احساس کے اظہار میں سادگی اور لطافت سے کام لیا ہے اور زندگی کے سنگلاخ تجربوں کو جس طرح آسانی کے ساتھ پیش کیا ہے اس کی مثال آج کم شاعروں کے یہاں نظر آتی ہے۔غزل کے یہ اشعار زندگی کے مثبت رویوں کا پتہ دیتے ہیں۔

نعیم الحق مسرور پر جب غم والم کا پہاڑ ٹوٹا اور ان کا پیارا بیٹا رانچی کے مہیب اندھیروں میں گم ہوگیا تو ان کے صبر وضبط کا باندھ ٹوٹ گیا اور وہ خود کو روک نہیں پائے اور خدا سے یوں شکوہ سنج ہوئے۔

کیوں مرا محبوب یوں چھینا گیا
اب خدا کے گھر میں بھی کچھ کم ہے کیا

لیکن جلد ہی وہ اپنے غموں سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔اشعار دیکھیے۔

مانوس ہو چکا ہوں غم زندگی سے میں
اب اضطراب دل کی شکایت نہیں رہی

اس چمن سے بہار روٹھ گئی
ہم خزاں سے بھی صلح کر لیں گے

نعیم الحق مسرور کی غزل کے یہ وہ اشعار ہیں جو اردو غزل کی کلاسیکی شعری روایت کی توسیع کرتے نظر آتے ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا تجربہ زندگی کی حقیقتوں سے آشکار ہے۔زندگی کی مشکلوں اور کلفتوں سے اسے

آشنائی ہوچکی ہے۔ زندگی کے تجربوں میں استحکام کی صورت نظر آنے لگی ہے۔ زندگی کے غم و آلام سے نہ اس کے قدم لڑکھڑاتے ہیں اور نہ اس کی طبیعت میں بے چینی پیدا کرتے ہیں۔ شاعر نے زندگی کی تمام کلفتوں اور مشکلوں پر قابو پالیا ہے۔

نعیم الحق مسرور کی غزلوں میں ترغیب، تلقین اور نئی نسل کے لیے پیغامات بھی موجود ہیں وہ ایک دردمند شاعر کا دل رکھتے ہیں اس لیے قوم کی زبوں حالی اور نوجوانوں کی بے راہ روی سے جب ان کا دل دکھتا ہے تو وہ گلستاں کی تعمیر کے لیے نوجوانوں کو یہ سودمند مشورہ بھی دیتے ہیں۔

تو نے دولت کو سمجھ رکھا ہے اصل زندگی
قوم زندہ رہتی ہے اعمال سے کردار سے
یہ زندگی جسے بزم ہاؤ ہو کہیے
یہ شور و شر کا تماشہ ہے زندگی کیا ہے
اپنے عہد وفا کا پاس رہے
عزم میں پھر کوئی نہ خم آئے
فکر تعمیر گلستاں کیجیے
دل اس غم میں گھلتا جاتا ہے

ان اشعار کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو زندگی کی حقیقتوں کا ادراک ہوگیا ہے۔ اس نے زندگی کا راز پالیا ہے۔ انسانی زندگی میں نعمتوں کی فراوانی اب اس کے داخل کا مسئلہ نہیں ہے۔ دولت وشہرت اور اس نوع کی دیگر چیزیں اب شاعر کے پاؤں کی زنجیر نہیں بن سکتیں۔ وہ زندگی کے اس شور وشر کو ہاؤ ہو سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ دراصل یہی باتیں زندگی کی حقیقتوں کا ادراک ہیں۔

نعیم الحق مسرور کی شاعری متصوفانہ خیالات کے بیان کا بھی عرفان رکھتی ہے۔ دراصل شاعر کا تعلق ایک صوفی خانوادے سے ہے اس لیے ان کی غزلوں میں صوفی فکر کا اظہار بھی موجود ہے۔ اشعار دیکھیے۔

حرم و دیر و کلیسا ہو یا مرا گھر ہو
ترے بغیر کہیں کوئی روشنی نہ ہوئی
مجھے صحرا نوردی دشت پیمائی سے الفت ہے
کوئی عالم ہو میرے دل کی حیرانی نہیں جاتی
تخلیق کائنات کی گرمی شرر میں ہے
درس تجلیات بھی شوق نظر میں ہے
مٹا دے مرے دل سے ہر نقش باطل
بس اک اپنی تصویر مسطور کر دے

انسان جب زندگی کے راز پالے تو پھر ان حدود میں داخل ہو جاتا ہے جسے ہم راہ سلوک وطریقت کے نام سے جانتے ہیں۔ مسرور اورنگ آبادی کی غزل میں متصوفانہ مضامین بہت نظر آتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ صوفیانہ مضامین شاعر کے ادراک کا ماحصل ہیں۔ شاعر اس حوالے سے پوری کائنات کو موضوع گفتگو بناتا ہے۔ وہ کائنات کے عظیم سفر پر ہے۔ کائنات کے عکس اور مناظر اس کا شعری حوالہ بن گئے ہیں۔ اس کی نگاہ کائنات کی تخلیق، تجلی اور روشنی کی طرف متوجہ ہے۔ وہ کائنات کی ان تصویروں اور مناظر میں حقیقت کے رنگ تلاش کر رہا ہے۔ اس طرح کے موضوعات نے مسرور اورنگ آبادی کی غزل کو خالص متصوفانہ بنا دیا ہے۔

غزل ایمائیت کا فن ہے۔ نعیم الحق مسرور اورنگ آبادی کی غزلوں میں ایمائی طرز اظہار کے چند خوبصورت نمونے دیکھیے۔

چاند میں چاندنی تاروں میں چمک باقی ہے
کس کی یادوں کی ہواؤں میں مہک باقی ہے
ہزار بات اڑے گی تمھیں خبر بھی ہے
نہ مجھ سے آنکھ چرا کر اِدھر اُدھر دیکھو
فلک پر جو ماہ تمام آگیا
ستاروں کی محفل ادھر ہو گئی

ان اشعار میں ایمائیت سے بخوبی کام لیا گیا ہے۔ اشاروں میں کہی گئی بات کا حسن دوبالا ہوگیا ہے۔ ان اشعار میں اشارے اس قدر تخلیقی اور شعلہ پرداز ہیں کہ قاری کے فکر وخیال کی وادی جل اٹھتی ہے۔

ہزار بات اڑے گی تمھیں خبر بھی ہے
نہ مجھ سے آنکھ چرا کر اِدھر اُدھر دیکھو

نعیم الحق مسرور اورنگ آبادی کی غزل پڑھ کر بار ہا کلاسیکی شعرا کے اشعار یاد آنے لگتے ہیں۔ مذکورہ بالا شعر کو ذہن میں رکھ کر حکیم مومن خاں مومن کا یہ شعر دیکھیے۔

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے
منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

ان دونوں اشعار میں ایک ہی بات کہی گئی ہے۔ مسرور اورنگ آبادی کی غزل میں اس نوع کے اشعار اس بات کی خبر دیتے ہیں کہ انھوں نے اردو کی شعری روایت کا نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ اردو کے شعری سرمائے پر ان کی نظر تھی۔

نعیم الحق مسرور کی غزلیں سہل ممتنع کی بھی عمدہ مثالیں ہیں۔ سہل ممتنع کی شاعری قاری کو اپنی طرف نہ صرف متوجہ کرتی ہے بلکہ شاعر کی صناعی اور اس کی کامیاب تخلیقی قوت کا اعتراف بھی کرتی ہے۔ جناب مسرور کی غزلوں کے ان اشعار میں سادگی، لطافت، شگفتگی اور دلکشی کا کمال دیکھیے جو شاعر کی فکری وفنی صلاحیتوں کا اظہار ہے۔

اب کہاں ہے وفا زمانے میں
خوب جور وستم کی بات کرو
کیا شکایت ہے آپ کو مجھ سے
سارا الزام اپنے سر لیں گے
کون مسرور ہے زمانے میں
کیوں مری چشم نم کی بات کرو
کیوں نہ مسرور ہوں بھلا مسرور
بعد مدت کے یار آتا ہے
ان پہ مسرور ناز کرتا ہوں
جو مجھے بے وفا سمجھتے ہیں

ان اشعار میں بلا کی سلاست اور روانی ہے۔ اس طرح کے اشعار کہنا آسان نہیں ہے۔ ان اشعار کو پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ گفتگو کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ شعر میں گفتگو کا انداز اختیار کرنا مشکل کام ہے۔ اسے ہی ہم سہل ممتنع کہتے ہیں یعنی شعر دیکھنے میں تو آسان اور عام فہم نظر آئے لیکن اس طرح کہنا ہر کسی کے بس کی بات نہ ہو۔ طبیعت میں موزونی ہو تو تخلیق اظہار طرح طرح کے فنی جوہر دکھاتے ہیں لیکن اس طرح کی سادگی اور گفتگو کا یہ انداز عام طور پر بڑی مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ مسرور اورنگ آبادی کی غزل میں بیان اور اظہار کا یہ انداز مختلف جگہوں پر موجود ہے۔

نعیم الحق مسرور اورنگ آبادی کی غزلوں کے اشعار کے وسیلے سے راقم نے ان کے شعری محاسن پر مختلف پہلوؤں سے گفتگو کرنے کی کوشش کی ہے اور مسرور کے شعری اختصاص کو نمایاں کیا ہے۔ میرے خیال میں سید نعیم الحق مسرور کی غزلیں اس لائق ہیں کہ ان کا شمار بہار کی اردو غزل گوئی کی تاریخ میں ہونا ہی چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب ان کے سرمائے سے ان کی محبوب ترین شے ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تو خود ان کی طبیعت میں بے نیازی اور بیزاری کا عنصر شامل ہوگیا اور شاعری کا بہترین ذوق، مشق ومزاولت اور قادر الکلامی کے باوجود وہ خود اپنی شاعری کو قابل اعتنا سمجھنے سے گریز کرنے لگے تھے جب کہ ان کی شاعری میں زندہ رہنے کے تمام امکانات موجود ہیں اور خود قنوطی رنگ وآہنگ میں ڈوبا ہوا ان کا یہ شعر جناب نعیم الحق مسرور کے شعری امتیاز وانفراد کو نمایاں کرنے کے لیے کافی ہے۔

نہ کوئی مونس ومایہ نہ کچھ متاع ہنر
فریب خوردہ مسافر کی شاعری کیا ہے

■

Dr. Qasim Fareedi
Qazi Mohalla
Aurangabad- 824101 (Bihar)
Mob.:9431632576

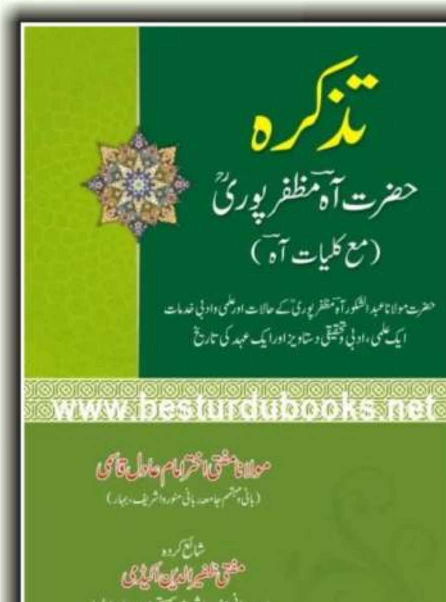

مولانا عبدالشکور آہ مظفر پوری کی غزلیہ شاعری

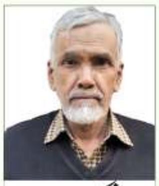

شکیل احمد

مولانا عبدالشکور آہ مظفر پوریؒ ایک ایسے علمی خانوادے کے فرد گزرے ہیں جہاں صدیوں سے علم و معرفت کی روشنی بکھرتی رہی تھی۔ آپ نے تعلیم و تعلم کے ماحول میں آنکھیں کھولیں اور اسی ماحول میں ابتدائی تعلیم بھی پائی۔ کانپور میں اپنے وقت کے نامور اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور فراغت کے بعد تدریس سے وابستہ ہوکر بقیہ زندگی اسی میدان میں گزار دی۔ آپ نے مدرسہ شمس الہدی پٹنہ، مدرسہ جامع العلوم مظفر پور اور مدرسہ دارالعلوم مئو میں مسند درس سنبھالی، صدرالمدرسین رہے۔ آپ نے سلوک و معرفت کی راہ میں بھی اپنے نقوش قائم کیے جس کی اثرات دور تک اور کئی نسلوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان اوصاف حسنہ کے ساتھ اللہ نے آپ کو شعر گوئی کی دولت سے بھی نوازا تھا، جس کا آپ نے بھرپور اور بخوبی استعمال کیا۔ شعر گوئی کی خدا داد صلاحیت ہونے کے باوجود آپ نے اپنے اس فن پر کبھی فخر کا احساس نہیں کرایا اور نہ ہی آپ کی غزلوں میں دیگر شعرا کی طرح تعلّی کے اشعار ہیں۔ حالانکہ آپ کی کلیات کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر بآسانی پہنچا جا سکتا ہے کہ آپ کی شاعری میں آمد کے ساتھ روانی اور قادرالکلامی موجود ہے۔

آپ ایک پرگو اور مختلف اصناف شاعری پر پوری دسترس رکھنے والے شاعر تھے مقام حیرت ہے کہ مدرسے میں جملہ تدریسی ذمے داریاں سنبھالنے کے ساتھ خانقاہ اور اس کے تمام متعلقات میں بھی پورا شغف رکھتے تھے اور آپ کی شہرت سلوک و عرفان کے حلقے میں دور تک تھی۔ اس پر مستزاد آپ کی شاعری اور اس مقام و معیار کی شاعری کہ تقریباً ایک صدی گزرنے کو آئے مگر اس میں تازگی اور اثر انگیزی اب بھی موجود ہے خاص بات یہ کہ اپنی منصبی ذمے داریوں کو سنبھالنے کے ساتھ اپنا کلام ڈائری میں لکھ کر محفوظ بھی کرتے گئے۔ الحمدللہ کہ ایک مدت کے بعد آپ کے پڑپوتے مولانا اختر امام عادل صاحب کے ہاتھوں اس کی اشاعت اہتمام کے ساتھ مقدر تھی جنھوں نے اس کلام کی تلاش میں قابل تحسین کوششیں فرمائیں اور ماشاءاللہ کامیاب رہے۔

حضرت آہ مظفر پوری کی غزل گوئی میری گفتگو کا موضوع ہے۔ تذکرہ حضرت آہ مظفر پوری 'مع کلیات آہ' شائع ہونے کا بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ حضرت مرحوم کی جملہ سرگرمیاں، خاندانی حالات، عہد و ماحول، اساتذہ و مربیان رفقا و ورثا سے واقف ہونے کے ساتھ آپ کی شاعری کا پس منظر سمجھنے میں بہت آسانی ہوگئی۔ مرتب محترم نے کلیات کو منتخب کلام کا نام اس احتیاط کے باعث دیا ہے کہ یقیناً حضرت آہ کا کچھ کلام دست برد زمانہ کا شکار بھی ہوا ہوگا جس کی تفصیل کتاب کے صفحات میں موجود ہے۔

کلیات دو سو صفحات اور ستر غزلوں پر مشتمل ہے۔ تقریباً ساٹھ صفحات میں مختلف اصناف شاعری اور ایک سو چالیس صفحات میں غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ غزلوں کے مطالعے کے دوران یہ بات بطور خاص سامنے آئی کہ پانچ سے لے کر نو اشعار پر مشتمل غزلوں کی تعداد صرف بیس ہے جب کہ دس سے لے کر چوبیس اشعار پر مشتمل غزلوں کی تعداد تقریباً پچاس ہے۔ ان میں بھی دس غزلیں تو اٹھارہ اور اس سے زیادہ چوبیس اشعار پر مشتمل ہیں۔ ڈیڑھ دو صدی کی مدت میں بہت کم ایسے شعرا گزرے ہوں گے جنھوں نے دو درجن اشعار پر مشتمل غزلیں کہی ہوں گی یہی نہیں غیر مروجہ بحر میں بھی ایسی غزل موجود ہے جو چوبیس اشعار پر مشتمل ہے جیسے

ہم تمھیں سے پوچھتے ہیں یہ خبر سچ ہے کہ جھوٹ...

والی غزل۔ اس قدر قادر الکلامی جس شاعر میں موجود ہو وہاں مضامین کی وسعت کا کیا پوچھنا۔

حضرت آہ کی غزلوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آپ نے اپنی غزلوں کا عنوان اسی غزل کے کسی مصرعے کو بنایا ہے۔ جیسے 'سچ ہے کہ جھوٹ' والی غزل جس کا ابھی ذکر ہوا۔ چھوٹی بحر میں غزل گوئی مشکل بھی ہوتی ہے اور فنی پختگی کی متقاضی بھی۔ حضرت آہ کی غزلوں میں چھوٹی بحر پر مشتمل ایک درجن غزلیں ہیں، جیسے

تیر دل میں اتر گئے ہوتے
دیکھنے والے تر گئے ہوتے

یا یہ غزل

تم لب بام نہ آیا کرتے
سارے عالم کو نہ شیدا کرتے

ان چھوٹی بحر کی غزلوں میں بھی مضامین کی آمد ہی آمد ہے۔ زبان بھی نہایت شگفتہ رواں، سادہ اور کہیں کہیں بامحاورہ بھی ہے اوسط اور بڑی بحر کی غزلوں میں بھی زبان کی سلاست و شستگی پر قربان جائیے جہاں روانی اور بے ساختگی کا ایک چشمہ پھوٹتا نظر آتا ہے۔

بہت سے ماہ وشوں کو جہاں تہاں دیکھا
ترستی آنکھ نے لیکن وہ پی کہاں دیکھا

13 اشعار پر مشتمل اس غزل کو بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے، جس کا مزید ایک شعر ملاحظہ فرمائیں

کمال درد کی لذت کا یہ کرشمہ ہے
ہزار رنج میں بھی دل کو شادماں دیکھا

غزل کی ایک اصطلاح 'حکایت بایار گفتن' بھی ہے اور غزل کو اردو شاعری کی آبرو بھی کہا گیا ہے 'ادب برائے ادب' اور 'ادب برائے زندگی' کی سرد و گرم آب و ہوا کے دوران بھی اُردو غزل کا چراغ ہمیشہ روشن رہا دو صدیوں کے دوران مضامین کی وسعت نے بڑا طویل سفر طے کر لیا ہے لیکن آج بھی غم جاناں اُردو غزل کا محبوب موضوع ہے اور جس دوران حضرت آہ نے غزل گوئی شروع کی اس وقت غم جاناں اپنی تمام تر رعنائیوں، نزاکتوں اور دلفریبیوں کے ساتھ اردو غزل پر سایہ فگن تھا۔ اس سے باہر کی طرف رخ کرنا، روش زمانہ کے خلاف گردانا جاتا تھا۔ چنانچہ آہ کی غزلوں میں معاملات و مراحلِ عشق اپنی تمام رنگینیوں، چاہتوں، خلوتوں اور نزاکتوں کے ساتھ موجود ہیں لیکن یہ بات حیرت کی نہیں کہ آپ کی غزلوں میں عشق مجازی کے ساتھ بلکہ اس سے بھی نمایاں عشقِ حقیقی کے جلوے نظر آتے ہیں اگرچہ یہاں بھی عرفان و سلوک کی باتیں بادہ و ساغر کے سہارے کہنے کی روایت برقرار رہی ہے یہاں چند اشعار پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں

زمیں کیا، آسماں کیا، لامکاں تک دیکھ آئیں گے
اڑا کر لے چلے گا جب ہمیں اعجاز ساقی کا
قوتِ برقی رگوں میں عشق نے ایسی بھری
تیرے عاشق اڑ کے پہنچے عرش پر سچ ہے کہ جھوٹ
مزہ اے آہ جب سے خلوت توحید کا پایا
بھرے مجمع میں رہتے ہیں، مگر سب سے کنارے ہیں
قید تنہائی ہمارے حق میں اچھی ہوگئی
خلوتِ توحید میں سب سے جدا ہم ہو گئے
گردش میں آفتاب بھی ہے، ماہتاب بھی
منزل کا تیری ملتا کسی کو نشاں نہیں
اٹھا دے پردۂ پندار پی لے جام وحدت کا
ذرا آ دیکھ کیا کیا اس میں ہیں لعل و گہر رکھے

اردو غزل کی روایت زاہد و شیخ سے چھیڑ چھاڑ کی بھی رہی ہے۔ حضرت آہ نے جس دور میں شاعری کی دنیا میں قدم رکھا یہ مضمون اکثر شعرا کی غزلوں میں بھی پایا جاتا تھا اردو

> "
> **غزل کی ایک اصطلاح 'حکایت بایار گفتن' بھی ہے اور غزل کو اردو شاعری کی آبرو بھی کہا گیا ہے 'ادب برائے ادب' اور 'ادب برائے زندگی' کی سرد و گرم آب وہوا کے دوران بھی اُردو غزل کا چراغ ہمیشہ روشن رہا دو صدیوں کے دوران مضامین کی وسعت نے بڑا طویل سفر طے کر لیا ہے لیکن آج بھی غم جاناں اُردو غزل کا محبوب موضوع ہے**
> "

غزل کے اسی مزاج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ نے موقع بہ موقع شوخی و طنز کے پیرایے میں اسی رنگ و آہنگ کے شعر بھی کہے اور زبان و بیان کے لطف کے ساتھ زندہ دلی اور قدرے دل لگی کا لہجہ بھی اپنایا

جناب شیخ کو بھی کر لیا ہے اپنا دیوانہ
پرانی بدچلن بنت عنب معلوم ہوتی ہے
واعظ کو کبھی عشق بتاں ہو نہیں سکتا
پتھر پہ کوئی رنگ عیاں ہو نہیں سکتا

حضرت آہ کی غزلوں میں چند باتیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں جو یقیناً آپ کی غزل گوئی کے بنیادی اوصاف میں شامل ہیں۔ جیسے رواں اور شستہ لب و لہجے کے ساتھ بامحاورہ زبان کا استعمال، استفہامیہ انداز کلام اور مضامین کی کثرت۔ آپ کی خمریاتی شاعری ہو یا عام نظمیں، سہرے ہوں یا تہنیتی نظمیں، رباعیات ہوں یا قطعات۔ سب میں یہ خوبی موجود ہے جو آپ کی شاعری میں آمد اور برجستگی کی دلیل ہے۔ اگلی سطور میں آپ کی غزل گوئی کے جس پہلو پر بھی گفتگو ہوگی ان میں یہ خوبیاں نمایاں طور پر سامنے آئیں گی۔

اردو غزل، جس بنیاد پر مقبول خاص و عام ہے وہ ہے مضامین حسن و عشق اور اس کی جزئیات کا بیان۔ حالانکہ وقت کے ساتھ اس میں تبدیلیاں بھی آئیں اور نئے مضامین و خیالات بھی وقت کے ساتھ اس میں شامل ہوتے گئے لیکن کلاسیکی رنگ و آہنگ کی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔ حضرت آہ کا دور عشقیہ مضامین اور معاملات حسن و شباب کے ذکر کا بھی دور شباب تھا۔ جس کے نمایاں اثرات آپ کی غزلوں میں نظر آتے ہیں ذیل کے اشعار سوز و ساز زندگی، مراحل حسن و نظر، اور سوزش عشق کی اثر انگیزیوں سے مملو نظر آئیں گے

حجابِ حسن میں چھپ کے بنا لیا مشتاق
ہوائے دید میں ہر پیر کو جواں دیکھا
جلوۂ یار نہ دیکھے تو وہ بینائی کیا
درد فرقت سے نہ روئیں تو ہیں پتھر آنکھیں
جگر کے ٹکڑے اڑے دل بھی پاش پاش ہوا
تمہارے تیر نظر کا غضب نشانہ تھا
میرے آنسو کو تم قطرے نہ سمجھو صرف پانی کے
یہ تیزاب محبت ہیں، اسی سے دل پگھلتے ہیں
بکھر آئیں زلفیں جو رخسار پر
گہن لگ گیا روز شب ہو گیا
بیڑیاں پاؤں میں زلفوں کی پڑی ہیں جب سے
کوچۂ یار سے دشوار نکلنا دیکھا

کتابِ عشق کے جس جس ورق کو دیکھا آہ
لہو کی بوند سے لکھا ہوا فسانہ تھا

خیالی صورتیں اچھی سے اچھی دیکھ لیتے ہیں
مگر ارمان جس کا ہے وہ کوئی اور صورت ہے

پڑھ اے آہ پھر مطلع چلے اب دور مینائی
ہوا ہے، ابر ہے، ساقی ہے، مے ہے، اچھی صحبت ہے

کتنی پر کیف ہیں متوالی ہیں دلبر آنکھیں
گویا چلتی ہیں چڑھا کئی ساغر آنکھیں

نشاط و سرشاری، نالہ و فغاں، عشق و وفا اور راز و نیاز کے یہی مضامین جب سوالیہ لب و لہجے میں اور کب کیوں میں نظم ہوتے ہیں تو تاثیر میں قدرے اضافہ ہو جاتا ہے۔ انداز کلام میں مزید نکھار کا احساس ہوتا ہے۔ اس استفہام میں جب تجاہل عارفانہ بھی شامل ہو تو شعر کی لذت و رنگینی بھی بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

کیوں بھٹکتے پھر رہے ہو در بدر اے آہ تم
کچھ تو سوچو کیوں دل برباد ویرانہ بنا

یہی طریقِ محبت ہے کیا زمانے میں
ہوا ہر ایک الگ جس سے دوستانہ تھا

یہ کیسے مست ہیں، مستی میں بھی ہوشیار رہتے ہیں
بہک کر بھی نہیں کہتے کبھی کچھ راز ساقی کا

کس کی آمد کے منتظر ہو تم
کیوں نرالا ہے رنگ محفل کا

بادۂ مستی کا آنکھوں میں بھرا ہے کیوں خمار
ہاں کہیں ڈھلتی رہی ہے رات بھر سچ ہے کہ جھوٹ

نالہ کیا ہے اور فغاں کیسی
کچھ کہوں بھی تو ماجرا دل کا

جہاں ہمدم نہ ہو کوئی کسی کا
رہیں اے آہ کیوں ایسے مکاں میں

کس دن ترا خیال ہمیں جان جاں نہیں
گزری وہ کون رات کہ آہ و فغاں نہیں

آہ پہلو میں درد رکھتے ہیں
تا بکے نالہ و بکا نہ کریں

ان اشعار میں باتیں تو مستی اور ہوشیاری یا آہ و فغاں اور بنت عنب کی ہوئی ہیں لیکن سوالیہ انداز کلام نے بات میں خوبصورتی اور تاثیر میں اضافہ کیا ہے، جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

غزل کے مذکورہ مضامین کو شاعر نے جب محاروں کے سہارے نظم کیا تو زبان کی حلاوت اور تاثیر کی لذت دو چند محسوس ہوتی ہے۔ آپ کی غزلوں میں سیکڑوں محاورے بڑی خوبصورتی کے ساتھ نظم ہوئے ہیں ذیل میں کچھ

غزلوں کے کسی بھی مجموعے کے مطالعے کے دوران اس بات پر بھی نظر رہتی ہے کہ یہاں کتنی غزلیں ایسی ہیں جن کے بیشتر اشعار اعلیٰ پایے کے اور بے حد پر کشش ہیں جن میں خیالات و محسوسات کی یک رنگی موجود ہو اور جو قاری کی توجہ کو فوراً اپنی طرف مبذول کر لینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ کلیات آہ کے مطالعے کے دوران ایسی کئی غزلیں سامنے آئیں جن پر نظر ٹک گئی، توجہ مرکوز ہوگئی اور ذہن و فکر کو کچھ نئے پن کا احساس بھی ہوا ان میں صرف ایک غزل جو چھوٹی بحر میں صرف سات اشعار پر مشتمل ہے نقل کرتا ہوں جو میرے موقف کی تائید کے لیے کافی ہے۔

اشعار پیش کیے جارہے ہیں۔

نگاہ ناز سے دیکھا ہمیں جب
اشاروں میں بلائیں لیں نظر کی
(بلائیں لینا)

ادھر کوئی رخصت طلب ہوگیا
ادھر آہ میں جاں بہ لب ہوگیا
(جاں بہ لب ہونا)

لحد میں نکیرین ہم کو نہ چھیڑیں
مسافر ہیں غربت کے مارے ہوئے ہیں
(غربت کا مارا ہونا)

وقتِ شانہ جو گرا غنچۂ دل چوٹی سے
زلف بل کھانے لگی سانپ کا من چھوٹ گیا
(من چھوٹ جانا)

غیر نے پٹی پڑھائی آپ کو
ورنہ اپنے قول سے پھر جائیں آپ
(پٹی پڑھانا)

گر گیا شیشہ نظر سے پڑ گیا جب اس میں بال
جان دی کس نے خط و رخسار پر سچ ہے کہ جھوٹ
(بال پڑ جانا) (نظر سے گرنا)

الفت کا راز آہ کھلا بھی تو کب کھلا
مر مٹ چکے گزر گئے جب اپنے جی سے ہم
(جی سے گزر جانا)

مذکورہ اشعار اور خاص موضوع سے متعلق اشعار کے علاوہ حضرت آہ کی غزلوں میں متعدد اشعار ایسے ہیں جنھیں ذیل میں اس لیے نقل کرنا چاہتا ہوں کہ ان اشعار کی تازگی لہجے اور تاثیر میں تقریباً ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی ذرا سی کمی نہیں محسوس ہوئی یہ اشعار حضرت آہ کے چنندہ اشعار میں نشان زد کیے جانے کے لائق ہیں۔

بے وفائی کس نے کی، کس نے وفا
خود ہی اس کا فیصلہ فرمائیں آپ

سبب کوچہ گردی کا ہم سے نہ پوچھو
جنون اور وحشت کے مارے ہوئے ہیں

لٹ لٹا کر آ رہا ہوں بزم سے
مال کیا، پہلو سے تو دل تک گیا

مکتبِ عشق میں جس دن سے قدم رکھا آہ
اپنی ہستی بھی فراموش ہوئی جاتی ہے

غزلوں کے کسی بھی مجموعے کے مطالعے کے دوران اس بات پر بھی نظر رہتی ہے کہ یہاں کتنی غزلیں ایسی ہیں جن کے بیشتر اشعار اعلیٰ پایے کے اور بے حد پر کشش ہیں جن میں خیالات و محسوسات کی یک رنگی موجود ہو اور جو قاری کی توجہ کو فوراً اپنی طرف مبذول کر لینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ کلیات آہ کے مطالعے کے دوران ایسی کئی غزلیں سامنے آئیں جن پر نظر ٹک گئی، توجہ مرکوز ہوگئی اور ذہن و فکر کو کچھ نئے پن کا احساس بھی ہوا ان میں صرف ایک غزل جو چھوٹی بحر میں صرف سات اشعار پر مشتمل ہے نقل کرتا ہوں جو میرے موقف کی تائید کے لیے کافی ہے۔

ملاحظہ فرمائیں۔

تم اگر قبر پر گئے ہوتے
مرنے والے تو تر گئے ہوتے

مکتبِ عشق کا تقاضا تھا
وہ جدھر، ہم ادھر گئے ہوتے

توڑ کر تختہ ہم نکل آتے
تم اگر قبر پر گئے ہوتے

ضبط نالہ سے کام ہے ورنہ
آسماں تک شرر گئے ہوتے

ایک دو جام بھی اگر پیتے
شیخ صاحب سدھر گئے ہوتے

مرتے دم حسرتیں نکلتیں آہ
وہ جو آکر ٹھہر گئے ہوتے

■

Dr. Shakeel Ahmad
Doman Pura Chungi
Maunath Bhanja (UP)

ایم اے کنول جعفری

کوثر چاندپوری کی تخلیقی جہات

کوثر چاندپوری کا اصل نام علی کوثر ہے۔ اس خوش خصال شخصیت کو گھر کے اندر ابا جی، طبی حلقوں میں حکیم سید علی کوثر، ادبی دنیا میں کوثر چاندپوری اور عوام وخواص میں کوثر صاحب کے نام سے جانا جاتا تھا۔ کوثر چاندپوری طب کی دنیا کے بہترین نباض ہی نہیں، ادبی شاہراہوں کے نبض شناس اور اصناف ادب کے مزاج داں بھی تھے۔ ان کی پیدائش 18 اگست 1900 کو اترپردیش کے ضلع بجنور کے شہر چاندپور میں سلارا تالاب کے قریبی محلّہ کٹارمل میں ہوئی تھی۔ کوثر چاندپوری کے والد کا نام حکیم سید مظفر علی اور دادا کا نام حکیم سید منصور علی ہے۔ ان کا شمار ضلع بجنور کے نامور طبیبوں میں ہوتا تھا۔ حکیم سید مظفر علی کی شادی سیوہارہ میں ہوئی تھی، لیکن اہلیہ کے انتقال کے بعد دوسری شادی چاندپور میں ہوئی۔ انھوں نے شادی کے کچھ دنوں بعد چاندپور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کی دوسری بیوی سے پانچ بیٹے سید علی اظہر، سید علی اکبر، سید علی کوثر، سید علی غضنفر اور سید علی معطر پیدا ہوئے۔ طبیبوں کا یہ خانوادہ ضلع بجنور میں ممتاز ومعروف حیثیت کا حامل تھا۔ کوثر چاندپوری نے اپنی کتاب 'اطبائے عہد مغلیہ' میں اپنے جد امجد مولوی ظہور اللہ کا سلسلۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملنے کی بابت تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔

اس خاندان کے ایک فرد میراں سید یعقوب جاجرم سے ہندوستان آئے تھے اور زید پور میں مقیم ہوئے۔ وہاں سے اترپردیش کے شہر جون پور اور بعد میں قصبہ نہٹور میں آباد ہو گئے۔ قدیم رسالہ 'زیدیہ' اور 'تاریخ واسطیہ' میں ان امور کا تذکرہ قدرے تفصیل سے مرقوم ہے۔

حکیم سید مظفر علی طبیب کی حیثیت سے بیمار لوگوں کی خدمت میں لگ گئے۔ وہ فن طب کے ماہر ہونے کے علاوہ ایک اچھے شاعر اور عمدہ نثر نگار بھی تھے۔ اردو ادب کا اعلیٰ ذوق اور علمی شعور رکھنے کی وجہ سے انھوں نے آزادی کی جستجو کے دوران تحریک خلافت اور کئی دیگر تحریکوں کی تشہیر اور لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ بیدار کرنے کے لیے کثیر تعداد میں نظمیں کہیں۔ اِن نظموں کو کتابچوں کی شکل میں بھی شائع کیا گیا، لیکن برطانوی حکومت نے ان نظموں اور کتابچوں کو ضبط کر کے ضائع کرا دیا۔ ملک آزاد ہونے کے تین برس بعد 1950 میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انھیں چاندپور کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

حکیم سید مظفر علی کے پانچ بیٹے سید علی اظہر، سید علی اکبر، سید علی کوثر، سید علی غضنفر اور سید علی معطر تھے۔ انھوں نے اپنے تمام بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا۔ اسلامی روایات اور مذہبی اقدار کا پابند ہونے کی بنا پر سبھی کی تعلیم کی ابتدا دینیات سے ہوئی۔ وہ خود فارسی اور اردو زبان کے ماہر ہونے کے علاوہ شاعری میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنی اولاد کو بھی فارسی زبان اور اس کے علمی افکار سے واقف کرایا۔ سید علی اظہر گوالیار اور جھانسی کے درمیان دینا ریاست میں چیف انجینئر کے عہدے پر فائز تھے۔ ملک کی تقسیم ہوئی، تو یہ ہندوستان سے پاکستان چلے گئے۔ دوسرے بیٹے حکیم سید علی اکبر نے پرنسز آصفیہ طبیہ کالج بھوپال سے یونانی طب کی تعلیم مکمل کی اور چاندپور میں مطب کھولنے پر اکتفا کیا۔ تیسرے بیٹے سید علی کوثر محض 14 برس کی عمر میں 1914 میں تعلیم کی غرض سے بھوپال گئے۔ انھوں نے آصفیہ طبیہ کالج میں داخلہ لیا اور 1918 میں طبیب کامل کی ڈگری حاصل کر وہیں سکونت اختیار کی۔ چوتھے بیٹے سید علی غضنفر ریاست جاورہ میں کسٹم کمشنر کے اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔ یہ بھی بڑے بھائی سید علی اظہر کی طرح آزادی کے بعد پاکستان چلے گئے۔ پانچویں بیٹے سید علی معطر نے بھی اپنے اجداد کا پیشہ اختیار کرتے ہوئے طبابت میں کمال حاصل کیا۔ حکیم سید علی کوثر یعنی کوثر چاندپوری طبی خدمات کے دوران 1955 میں ریاست بھوپال میں افسر الاطبا کے عہدے پر فائز ہوئے اور ماہانہ وظیفہ حاصل کیا۔ 1965 میں حکیم عبدالحمید کے اصرار پر دہلی آ گئے اور ہمدرد نرسنگ ہوم میں میڈیکل آفیسر کے عہدے پر رہتے ہوئے طبی خدمات کو انجام دیا۔

اس سے قبل کوثر چاندپوری جب کبھی دہلی آتے، تو ہمدرد دواخانہ کے مہمان ہوتے۔ اسی طرح جب حکیم عبدالحمید کبھی بھوپال جاتے، تو کوثر چاندپوری کے مہمان ہوا کرتے۔ رسمی تکلفات سے دور اور برادرانہ تعلقات کی بنا پر دونوں کے درمیان خلوص کا دریا موجزن تھا۔ حکیم جی کو کوثر چاندپوری پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ ہمدرد کی دواؤں

کے تعارفی کلمات اور مختلف امراض و معالجے کے مضامین انھیں سے لکھواتے تھے۔ دہلی آنے کے بعد ہمدرد نرسنگ ہوم کی اہم ذمے داری ان کے سپرد کی گئی۔ کوثر چاند پوری بلی ماران میں رہائش پذیر ہوئے۔ روزانہ صبح نو بجے نرسنگ ہوم پہنچتے، دوپہر 12 بجے تک کیبن میں بیٹھ کر مریض دیکھتے۔ تشخیص و تجویز کے عمل سے فراغت پا کر نرسنگ ہوم میں داخل مریضوں کے بستروں کے پاس جا کر ان سے ملاقات کرتے، حال چال دریافت کرتے اور رات بھر کی کیفیت کے بارے میں معلومات حاصل کرتے۔ اگر ضرورت محسوس کرتے، تو دوا میں کسی قدر تبدیلی کرتے، ورنہ اسی کو جاری رکھتے۔ ایک بجے گھر سے آیا ہوا کھانا کھاتے اور کچھ دیر قیلولہ کرتے۔ اس کے بعد یا تو لکھنے میں مشغول ہو جاتے یا پھر مطالعہ کرنے بیٹھ جاتے۔ دوست و احباب کی آمد ہوتی، تو قیلولہ ترک کر دیتے۔ تیسرے پہر کی چائے نوش کرنے کے بعد نرسنگ ہوم چلے جاتے۔ شام کے سات بجے نرسنگ ہوم سے باہر نکل کر کبھی پیدل اور کبھی رکشے میں بیٹھ کر گھر پہنچ جاتے۔ کوثر چاند پوری نے بڑی محنت، نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ مریضوں کا علاج کر کے نرسنگ ہوم کو خدمت کا مقبول ترین مرکز بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

بھوپال میں رہائش کے دوران طالب علمی کے زمانے میں شاعری کی جانب رجحان ہوا، تو محمد زکریا مائل سے عروض کی واقفیت حاصل کرنے کے ساتھ شعر کہنے شروع کر دیے۔ کچھ عرصے یہ سلسلہ چلا اور پھر ممتاز و معروف شاعر مولانا جمیل احمد سہوانی سے اصلاح لینے لگے۔ رفتہ رفتہ شعور و آگہی میں اضافہ ہوا، تو پرانے طور طریقے کے استاد شاعر جمیل احمد سہوانی کو الوداع کہہ دیا اور مانی جائسی سے کلام پر اصلاح لینا شروع کر دیا۔ چونکہ کوثر چاند پوری عام قسم کے کلام سے ہٹ کر شاعری کرنے کا ذوق رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے اثر لکھنوی، عزیز لکھنوی، ہادی مچھلی شہری اور سیماب اکبر آبادی سے بھی اپنی غزلوں پر اصلاح لے کر فیض حاصل کیا۔

کوثر چاند پوری ایک اچھے شاعر تھے، لیکن انھوں نے شاعری پر توجہ دینے کے علاوہ اردو کے معیاری جرائد اور نثری کتب کا کثرت سے مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ اسی دوران وہ مضمون نگاری کی طرف راغب ہو گئے اور 1917 میں انشائیہ لکھنا شروع کر دیا۔ ان کے انشائیے اردو کی مشہور میگزین 'نگار' لکھنؤ، 'نیرنگ خیال' لاہور، 'ادبی دنیا' لاہور اور 'شاہکار' لاہور میں شائع ہوئے۔ کوثر چاند پوری نے 1920 تک انشائیہ نگاری کو اپنے جذبات واحساسات کی ترجمانی کے لیے موزوں پایا اور اس صنف میں کافی کام کیا۔ کوثر چاند پوری کسی ایک مقام پر ٹھہرنے یا کسی ایک صنف میں ہی طبع آزمائی کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے جس طرح صرف شاعری پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کی، ٹھیک اسی طرح وہ انشائیہ نگاری پر بھی اکتفا کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔ کوثر چاند پوری کے اندر چھپی صلاحیتیں انھیں کچھ اور کرنے کے لیے برابر اکسائے جا رہی تھیں۔ چونکہ انھوں نے مضافات شہر میں طویل مدت گزاری تھی، اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ دیہی علاقوں کے سرسبز و شاداب ماحول سے متاثر اور اونچائی سے ڈھلان کی جانب بہتے دریاؤں کے خوبصورت نظاروں سے لطف اندوز نہ ہوں۔ دیہی ماحول کو چار چاند لگاتی شادابیت سے متاثر ہونے کے نتیجے میں ان کا رجحان افسانہ نگاری کی طرف ہو گیا۔ یوں تو کوثر چاند پوری نے 1922 سے افسانے لکھنے شروع کر دیے تھے، لیکن ان کا پہلا افسانہ 1926 میں شائع ہوا۔ ان کے منجھلے صاحبزادے نعیم کوثر کے مطابق کوثر چاند پوری کا پہلا افسانہ 'گداز محبت' ماہنامہ 'پیام ہستی' امرتسر میں شائع ہوا تھا۔ ظفر احمد نظامی، رشید انجم، ڈاکٹر نازنین، پروفیسر نعمان خان نے بھی 'گداز محبت' کو ان کا پہلا افسانہ قرار دیا ہے۔ دوسری جانب خود کوثر چاند پوری کی تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا پہلا افسانہ 1924 میں شائع ہوا تھا:

'میں اب تک 'گداز محبت' کو اپنا پہلا افسانہ سمجھتا رہا، جو امرتسر کے کسی رسالے میں نامکمل شائع ہوا تھا۔ لیکن پرانی کتابوں میں مجھے رسالہ 'الکمال' لاہور دسمبر 1924 کا فائل ملا ہے۔ اس کے ماہ دسمبر 1924 میں میرا پہلا افسانہ 'فضائے برشگال کا ایک تیر' شائع ہوا ہے۔ اسی کو میں اپنا پہلا افسانہ سمجھتا ہوں۔ جو آج سے 54 سال قبل شائع ہوا تھا۔ رسالہ 'الکمال' ریاض شیرانی کی ادارت میں لاہور سے چھپتا تھا۔ میرا پہلا افسانہ کافی ترمیم و اصلاح کے بعد میرے پہلے افسانوں کے مجموعے 'دل گداز افسانے' میں شامل ہوا۔ لیکن 'الکمال' میں اصلی صورت میں شامل ہوا تھا۔'

(کوثر چاند پوری کی افسانہ نگاری: ڈاکٹر شاداب تبسم 'ادبی میراث ڈاٹ کام 02 مارچ 2022)

کوثر چاند پوری کی تحریر کے اس اقتباس سے یہ بات آئینے کی طرح صاف ہو جاتی ہے کہ ان کا پہلا افسانہ 'گداز محبت' نہیں، بلکہ 'فضائے برشگال کا ایک تیر' ہے۔ انھوں نے خوب لکھا اور زبردست لکھا۔ وہ مسلسل 65 برس تک پوری طرح فعال رہ کر اردو ادب کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کے جیسی زود نویسی بہت کم قلمکاروں کے حصے میں آتی ہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'دل گداز افسانے' 1926 میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا، تو اسے خوب پسند کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ بھوپال کی ادبی سرزمین سے کتاب کی شکل میں شائع ہونے والا یہ پہلا افسانوی مجموعہ تھا۔ اِس میں شامل سبھی 16 افسانوں میں دیہاتی زندگی، تہذیب و تمدن اور معاشرے کے منتخب موضوعات اور مسائل پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ اِس سے قبل بھوپال میں کسی فکشن نگار کا کوئی افسانوی مجموعہ شائع ہو کر منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ 'دل گداز افسانے' کے بعد کوثر چاند پوری کے مزید 13 افسانوی مجموعے اور شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ افسانہ نگار نعیم کوثر کا اپنے والد کوثر چاند پوری کی ڈائری کے حوالے سے کہنا ہے کہ قریب 23 برس تک ان کا آل انڈیا ریڈیو سے رابطہ رہا۔ انھوں نے اس دوران اپنی 75 کہانیاں ریڈیو پر سنائیں۔ دہلی منتقل ہونے کے بعد بھی خارجہ سروس میں کئی افسانے براڈکاسٹ ہوئے۔

کوثر چاند پوری نے افسانہ نگاری کی طرح ناول نگاری میں بھی خوب نام کمایا اور اردو فکشن کے بیش قیمتی خزانے میں 17 ناولوں کا اضافہ کیا۔ ایک بے نیاز مفکر، محقق، ناقد، افسانہ نگار، مضمون نگار اور حاذق طبیب نے بچوں کے لیے بھی مضامین اور کہانیاں لکھیں۔ اس ہمہ جہت فنکار کی ادب اطفال سے خاصی انسیت اور گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے بچوں کی قلبی تسلی اور ذہنی سکون کے لیے بہت کام کیا۔ ان کے شوق و ذوق کے مدنظر بڑی مفید اور دلچسپ کہانیاں لکھیں اور ایک کے بعد ایک 25 کتابیں تحریر کیں۔ پرائمری اور مڈل کلاس کے بچے ان کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ کئی نامور ادبا نے اردو ادب میں کوثر چاند پوری کے مقام کو اہمیت دی ہے۔ وہ بچوں کے لیے ڈھیروں دلچسپ اور ان کے شعور میں اضافہ کرنے والی کہانیاں لکھ کر بچوں کے قابل ادیب کے طور پر اپنی پہچان کرانے میں کامیاب رہے۔ ان کے بیٹے نعیم کوثر رقم طراز ہیں:

'اردو ادب میں کوثر چاند پوری کی بھی ایک مخصوص شناخت تھی اور ان کی تخلیقات کو ڈاکٹر اعجاز حسین، احتشام حسین، وقار عظیم، انور سدید، وزیر آغا اور عنوان چشتی نے ادب میں اہم مقام دیا ہے۔ اس طویل سفر میں انھوں نے ننھے بچوں کو اپنی فہم و ادراک سے دور نہیں کیا۔ ان کے لیے بڑی مفید اور دلچسپ کہانیاں لکھیں اور 25 کتابیں تحریر کر کے خود کو بچوں کے ادیبوں میں شمار کرایا۔'

(وقار علم و حکمت: کوثر چاند پوری، مصنفہ: ڈاکٹر نازنین خان، ص 23)

کوثر چاند پوری نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا

تھا۔ زندگی کے تئیں ان کی سوچ ترقی پسندانہ تھی۔ ان کے یہاں ترقی پسند فکر کی قربت اور اثر کی صورت نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کے یہاں ہندوستان کے گاؤں اور دیہاتوں سے اخذ کیا گیا مواد موجود ہے، جسے کافی سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔

ان کے افسانوں میں عام طور سے پلاٹ کافی مختصر ہوتا ہے۔ اختصار کو کامیاب افسانے کی خوبیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ضرورت کے مطابق کہی گئی بات کو پسندیدہ اور غیر ضروری جملوں کو افسانے کی خامی تصور کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی بات بڑی بے باکی سے وضاحت کے ساتھ کہنے پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کی زبان و بیان اغلاط سے پاک، بے عیب اور شگفتہ ہے۔ حکمت سے تعلق ہونے کی بنا پر افسانوں میں طبی نکات بھی دلچسپ انداز میں پیش کیے ہیں۔ تشبیہات کی فنکارانہ ایجاد کے علاوہ منظر آرائی پر بھی عبور حاصل ہے۔ ان کے افسانوں اور ناولوں کے کردار اپنے وقت کی سچی نمائندگی اور ماحول کی حقیقی ترجمانی کرتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کی حقیقت اور تلخ و شیریں تجربات کو بیان کرنے کے لیے ایک ماہر نباض کی طرح معاشرتی مسائل کو موضوع بناکر ان کا حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ وہ ہر طبقے اور جماعت کے ذریعے کہے جانے والے محاوروں کو بڑی ذہانت اور چابکدستی سے استعمال کرنے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔

کوثر چاندپوری بہت سلجھے ہوئے انسان اور کشادہ ذہن کے مالک تھے۔ صاف گوئی میں یقین رکھتے تھے۔ اپنی رائے کا اظہار کرنے میں لاگ لپیٹ سے کام نہیں لیتے تھے۔ جو کہتے تھے، سچ کہتے تھے اور اسی پر قائم رہتے تھے۔ ایک مرتبہ پاکستان سے ماہنامہ 'افکار' کے مدیر کی جانب سے ہندوستان اور پاکستان میں رہنے والے افسانہ نگاروں اور تنقید نگاروں کو ایک سوال نامہ ارسال کرکے یہ معلوم کیا گیا تھا کہ ان کی رائے میں پریم چند کے بعد اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار کون ہے؟ اس سوال کے جواب میں کوثر چاندپوری نے جو کہا، اسے ڈاکٹر مظفر حنفی نے کوثر چاندپوری کی کتاب 'وقار علم و حکمت' کے شروعاتی مضمون 'باتیں کوثر صاحب کی' میں ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

'کرشن چندر کے بڑے قائل تھے۔ ماہنامہ 'افکار' کراچی نے ایک سوالنامہ ہند و پاک کے افسانہ نویسوں اور نقادوں کو بھیج کر دریافت کیا کہ پریم چند کے بعد ان کے خیال میں سب سے بڑا افسانہ نگار کون ہے؟ میں نے کوثر صاحب سے پوچھا، آپ کی رائے کس کے حق میں گئی؟ فرمایا کرشن چندر کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے؟ پھر موصوف نے مجھ سے استفسار کیا، عرض کیا، میں نے تو جواب میں لکھا ہے کہ بشمول پریم چند اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار منٹو ہے۔ کہنے لگے آپ کو اپنی رائے کے اظہار کا حق ہے، لیکن کرشن چندر بہر حال سب سے بڑا افسانہ نگار ہے۔'

(مضمون: باتیں کوثر صاحب کی، ڈاکٹر مظفر حنفی، کتاب: وقار علم و حکمت: کوثر چاندپوری ص 8)

کوثر چاندپوری کے بھتیجے ڈاکٹر حامد اکبر نے بتایا کہ چچا مزاح پسند کرتے تھے۔ بچوں سے بھی مذاق کر لیتے تھے۔ چھوٹے بیٹے حلیم کوثر فوج میں ڈاکٹر تھے۔ قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر دہلی میں کلینک کھول لیا تھا۔ ایک مرتبہ کوثر صاحب مطب پر پہنچے۔ سامنے قبرستان تھا۔ دور تک پھیلی قبروں پر نظر پڑتے ہی صاحبزادے سے بولے، 'بیٹا حلیم! تمھاری کلینک تو بہت اچھی چل رہی ہے۔' حلیم

کوثر چاندپوری نے ایک طبیب رہتے ہوئے بھی شعر گوئی، افسانہ نگاری، ناول نگاری، انشائیہ نگاری، رپورتاژ، طنز و مزاح نگاری، تنقید نگاری، تحقیق نگاری اور ادارت سمیت کئی اصناف میں طبع آزمائی کی۔

سمجھ گئے اور مسکرا کر رہ گئے۔ کوثر صاحب مچھلی کے بہت شوقین تھے۔ ان کے نام اور خوبیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ انتقال سے قبل مچھلی کھانے کی خواہش ہوئی۔ حلیم بہت عمدہ سنگھاڑا لے آئے۔ مچھلی تیار کی گئی، لیکن کھا نہیں پائے۔ کہنے لگے، 'دل نہیں کر رہا ہے۔'

کوثر چاندپوری کی تخلیقات میں 'دلگداز افسانے' 1929، دنیا کی حور، 1930، 'ماہ و انجم' 1937، 'دلچسپ افسانے' 1938، 'دنیا کی حور اور دیگر افسانے' 1938، 'گل و لالہ' 1938، 'شب نابچے' 1941، 'عورتوں کے افسانے' 1941، 'رنگین سپنے' 1941، 'لیل و نہار' 1944، 'اشک و شرر' 1944، 'شعلۂ سنگ' 1963، 'رات کا سورج' 1963، 'آوازوں کی صلیب' 1973، اغوا، نوک جھونک 1944، فریدہ مومنی کی ڈائری، (ناول) 1958، 'اطبائے عہد مغلیہ' 1960، 'محبت اور سلطنت' (ناول) 1962، 'شام غزل' (ناول) 1964، پتھر کا گلاب 1968، مرجھائی کلیاں (ناول) 1968، چالاک مرغا 1946، چوہیا بیگم 1946، دانش و بینش، داستانیں، جادو کا خزانہ، طب قدیم میں دوسرے علوم کی آمیزش، 1976، راکھ اور کلیاں (ناول)، دیدۂ بینا، کارواں ہمارا (دو رپورتاژ) 1966، ماہنامہ افکار بھوپال میگزین شمارہ 004 (1946)، ماہنامہ جادہ، بھوپال 1949، موجز القانون، وقار علم و حکمت وغیرہ شامل ہیں۔

کوثر چاندپوری نہایت اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ تحریر و تصنیف و تالیف کی ایسی کون بھی نوع ہے، جس میں انھوں نے اپنے قلم سے قرطاس ابیض پر زبردست نقوش ثبت نہ کیے ہوں۔ تاریخ، سوانح طب، انشائیے، رپورتاژ، طنز و مزاح، تنقید و تحقیق، 'جادہ' میگزین کی ادارت اور نہ جانے کتنی مہمات میں ان کے تیز رفتار قلم نے اپنے جوہر دکھائے۔ کوثر چاندپوری نے ایک طبیب رہتے ہوئے بھی شعر گوئی، افسانہ نگاری، ناول نگاری، انشائیہ نگاری، رپورتاژ، طنز و مزاح نگاری، تنقید نگاری، تحقیق نگاری اور ادارت سمیت کئی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کا شاید ہی کوئی اردو رسالہ یا اخبار ایسا ہو، جس میں کوثر چاندپوری کی تخلیقات شامل نہ ہوئی ہوں۔ کوثر چاندپوری کی شمولیت شاعر، بیسویں صدی، شمع، نیا دور، آجکل، نئی دنیا، ادبی دنیا، بانو، کھلونا، شمع جنتری اور روبی سمیت کتنی ہی میگزین کے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جانے کی ضمانت ہوتی تھی۔

بزرگ، جوان، بچے اور خواتین کو بازار میں ان کی کتاب یا کسی جریدے میں تخلیق آنے کا انتظار رہتا تھا۔ لیکن افسوس کہ ادبی دنیا کی ایسی نابغۂ روزگار اور ہمہ جہت شخصیت کی بیش بہا خدمات کا اس طرح اعتراف نہیں ہو پایا، جس کے وہ بجا طور پر حق دار تھے۔ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اردو ادب کی ہمہ جہت شخصیت کوثر چاندپوری کو یاد کیا جانا اور ان کے تذکرے ہونا نہ صرف اس لیے ضروری ہیں کہ اردو سے نابلد موجودہ نسلیں اس طبیب کامل، مفکر عالی، تحقیق نگار، تنقید نگار، افسانہ نگار، مضمون نگار، ناول نگار، رپورتاژ نگار، انشائیہ نگار، مزاح نگار، شاعر اور اول درجے کے صحافی کو بھولتی جا رہی ہیں، بلکہ اس لیے بھی لازمی ہے کہ زبان و ادب سے وابستہ نئی نسل ایسی باکمال شخصیت کے ادبی و تخلیقی کارناموں سے واقفیت حاصل کرے اور ان کی کما حقہ قدر شناسی ہو سکے۔

■

M. A. 'Kanwal' Jafri
127/2, Jama Masjid,
NEENDRU, Tehsil Dhampur
District: Bijnor (U.P.) 246761
09917767622, 09675767622

ذاکر حسین ذاکر

فراق شناس

افغان اللہ خاں

پروفیسر افغان اللہ خان 1948-2008 کی ولادت اعظم گڑھ کے خالص پور میں ہوئی تھی۔ ان کے والد محمد یحییٰ خاں خالص پور اعظم گڑھ کے ایک ممتاز زمیندار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد نے ریلوے میں نوکری کر لی اور گورکھپور میں آباد ہو گئے۔ افغان اللہ خاں کی ابتدائی تعلیم خالص پور میں ہی ہوئی۔ مگر وہ بہت جلد گورکھپور آ گئے۔ وہ گورکھپور میں پلے بڑھے اور ان کی تعلیم و تربیت گورکھپور میں مکمل ہوئی اور انھوں نے اپنی کارزار زندگی کی شروعات بھی گورکھپور سے ہی کی۔ گورکھپور کے قدیم اسلامیہ کالج سے انٹر کرنے کے بعد انھوں نے گورکھپور یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔

گورکھپور یونیورسٹی سے انھوں نے سماجیات اور پھر بعد میں اردو سے پوسٹ گریجویشن کیا۔ شعبہ اردو میں وہ گولڈ میڈلسٹ تھے۔ انھوں نے پروفیسر محمود الٰہی کی نگرانی میں تحقیق کی شروعات کی۔ پی ایچ ڈی میں ان کا موضوع فراق کی شاعری تھا۔ انھوں نے فراق کی شاعری پر بلیغ مقالہ لکھا' جو بعد میں فراق کی شاعری کے عنوان سے شائع ہوا۔ 1980 میں گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بطور لکچرار ان کی تقرری ہو گئی۔ پروفیسر افغان اللہ سرزمین

گورکھپور کے ادبی' سماجی اور سیاسی زندگی سے اتنی گہرائی سے منضبط تھے کہ انھیں اعظمی کہنا بالکل بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ وہ گورکھپور کے ادب اور معاشرے کا جز و لاینفک تھے۔ صحیح معنوں میں وہ گورکھپور کے ادبی شاہین تھے۔

افغان اللہ خاں کی عملی زندگی کی اصل شناخت اس وقت شروع ہوتی ہے' جب انھوں نے 1998 میں گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کا چارج سنبھالا۔ یک بہ یک شعبہ اردو نہ صرف آرٹ فیکلٹی کا مرکز اور محور بن گیا بلکہ گورکھپور کی ادبی انجمنیں اور ادبی شخصیات بھی اس کے اہم حصے میں شمار ہونے لگے۔ ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ افغان اللہ صاحب نے پہلے سے پلان مرتب کر کے رکھا ہوا تھا کہ صدر شعبہ بننے کے بعد انھیں کیا کیا کرنا ہے۔ جب موقع ملا تو اچانک اس پلان پر کارروائی شروع ہو گئی۔ اس دوران انھوں نے گورکھپور یونیورسٹی سے ملحق ایک درجن کالجوں میں بی اے اور پی جی میں اردو موضوع کی منظوری دلوائی۔ وہ خود ان کے پینل میں شریک رہتے اور یونیورسٹی کے دیگر ارکان پر اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کر کے اردو موضوع منظور کراتے۔ یہ ایک کام ایسا ہے جو ان کے سارے کاموں پر فوقیت رکھتا ہے۔

2001 کے بعد جب افغان اللہ خان پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے، اس کے بعد شعبہ اردو میں سمیناروں' نشستوں اور ادبی پروگراموں کی باڑھ سی آ گئی۔ یہاں پہلی بار ریفریشر کورسیز چلائے گئے' جن میں پورے ہندوستان سے مختلف یونیورسٹیوں کے شعبہ اردو کے لکچرار نے شرکت کی۔ اس سے گورکھپور کے علمی اور ادبی ماحول کا دائرہ کافی وسیع ہوا۔ جیسا کہ ظاہر ہے انھوں نے شعبہ اردو اور شہر کو ایک دوسرے سے مربوط کر دیا تھا۔

جیسے شہر کی دوسری اردو داں شخصیات کا شعبہ اردو میں آنا جانا شروع ہوا اسی طرح یونیورسٹی کے دوسرے شعبہ جات کے بڑے بڑے پروفیسران بھی شعبہ اردو میں اپنا وقت گزارنے لگے۔ پروفیسر متل، پروفیسر سکسینہ، پروفیسر رضوی، پروفیسر لال، پرفیسر کے ڈی شکل، پروفیسر اصحاب علی، پروفیسر سی پی سریواستو، ڈاکٹر انکور وغیرہ کے لیے شعبہ اردو کبھی بالکل انجانا تھا اب گلشن جیسا معلوم ہونے لگا تھا۔ان کی موجودگی سے شعبہ اردو گلزار بنا رہتا۔ شعبہ تاریخ کے پروفیسر چندر بھوشن انکور نے بڑے پتے کی بات کی ہے۔ ''مجھے حیرت یہ ہوتی تھی کہ کبھی بھی انھوں نے اردو کے سنگل مین ڈیپارٹمنٹ ہونے کا رونا نہیں رویا اور اکیلے ہی سال میں ایک یا دو جلسے اور لکچر وہ شعبہ اردو میں کروالیتے تھے' جو ان کے ٹھیک نیچے واقع دس ارکان والے شعبہ تاریخ میں کبھی نہیں ہو پاتا تھا۔ اردو ادب کی معروف شخصیات سے ملاقات انھیں کے توسط سے ہو جاتی تھی۔شہر میں بھی ان کے جاننے والے بہتیرے تھے' جن میں ایک دم معمولی آدمی سے لے کر اعلیٰ شخصیات تک شمار تھیں۔وہ سب سے برابری کا تعلق رکھتے تھے۔نہ تو میں نے انھیں جھکتے دیکھا اور نہ ہی بے وجہ اکڑتے دیکھا۔''

(نقوش افغان از پروفیسر افغان اللہ میموریل کمیٹی گورکھپور مضمون جسے انسان ہونا میسر تھا از ڈاکٹر چندر بھوشن انکور)

افغان اللہ خاں شاعر تھے اور ادیب تھے۔انھوں نے شاعری میں اس لیے بہت وقت نہیں گنوایا کیونکہ انھیں نثر زیادہ پسند تھی۔

(دبستان گورکھپور از مسلم انصاری فیضی پریس گورکھپور، ص 562)

مگر شاعری سے ان کا ناطہ اس وقت سے تھا' جب انھوں نے فراق گورکھپوری پر تحقیقی مقالہ لکھنا شروع کیا۔ فراق پر تحقیق بڑی جانفشانی کا کام تھا۔فراق عام آدمی کو ٹکنے نہیں دیتے تھے۔فراق کے ساتھ کام کرنے والا شخص انتہائی بڑے دل گردے کا مالک ہوگا۔یہ ڈاکٹر افغان اللہ خان کے لیے ایک سند توصیف ہے۔انھوں نے کام بھی بہت لگن اور محنت سے کیا اور فراق پر اتھارٹی ہو گئے۔ چونکہ فراق کی شاعری پر بہت ہی گہرا اور معنی خیز کام افغان اللہ خان نے کیا ہے اس لیے یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ شاعری کی چھٹی حس سے ضرور واقف تھے اور اچھے شعر کہتے تھے۔

بند کرنا تھا کتابوں کا کہ آنکھیں کھل گئیں
زندگی جب سامنے آئی تو صورت اور تھی
سامنے آتے ہوئے نیزوں کا بڑھ کر چومنا
پیٹھ میں چبھتے ہوئے خنجر کی لذت اور تھی

ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

جسم کے جنگل میں آوارہ پھرے ہے آرزو
دست و بازو ہو رہے ہیں اپنے صحرا آشنا
حافظے کی لوح پر محفوظ ہیں لمحات دوست
روح میں پیوست ہے اک اک پرانا آشنا
روزن زنداں صلیبوں کے مکاں زہریلا شہر
کربلائے روز و شب میں کون کس کا آشنا

پروفیسر افغان اللہ خاں نے داستان' تاریخ اور سماجیات اور ہندی اردو تنازعہ پر کام کیا۔انھوں نے انشاء اللہ خاں کی ہندوی داستان رانی کیتکی کی کہانی پر بسیط مقدمہ لکھ کر شائع کیا۔رانی کیتکی کی کہانی کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔پروفیسر افغان اللہ خاں کہتے ہیں۔''رانی کیتکی کی کہانی تاریخی اور لسانی اہمیت کی حامل ہے۔نہ صرف اردو بلکہ ہندی ادب کے محقق اور نقادان کا شمار ان ادیبوں میں کرتے ہیں جنھوں نے کھڑی بولی کو ترقی دی' جس پر ہندی زبان کی بنیاد رکھی گئی۔حالانکہ اردو کی بنیاد بھی کھڑی بولی ہے' اس لیے رانی کیتکی کی زبان کو ہندوستانی یا ہندوی کہنا ہی زیادہ صحیح ہے' جس میں بیرونی زبانوں کا کوئی لفظ استعمال نہیں ہوا ہندی محققوں کا خیال ہے کہ ٹھیٹھ کھڑی بولی کی بنیاد رام پرساد نرجن نے رکھی تھی۔انھوں نے 1742 میں بھاشا یوگ وششٹھ لکھ کر کھڑی بولی میں تصنیف کی ابتدا کر دی تھی۔

(رانی کیتکی کی کہانی از انشاء اللہ خاں مقدمہ ڈاکٹر افغان اللہ خاں۔ آصف آرٹس گورکھپور دوسری اشاعت 2019 ص 16)

اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے پروفیسر افغان اللہ کہتے ہیں کہ:

بہر حال انشا کی ذہانت تھی کہ انھوں نے بلا کسی منصوبے یا تحریک کے ایسی نثر ترتیب دی جو زبان ہندوی ہندوستانی کی اہم مثال ہے جو آج ہندی اور اردو دونوں میں یکساں طور پر مقبول ہے۔ زبان کے آغاز و ارتقا کا جائزہ لینے والے ماہر لسانیات اور محققوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے کیوں کہ مقامی بولیوں نے بعد میں چل کر مختلف زبانوں کا روپ اختیار کیا۔ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے علمائے ادب اس بات پر متفق ہیں کہ انشا اپنے دعوے پر کہ اس رانی کیتکی کی کہانی میں ہندوی چھٹ کسی اور بولی کا پٹ نہ ملے۔باہر کی بولی اور گنواری کچھ اس کے بیچ میں نہ ہو بس جیسے بھلے لوگ اچھوں سے آپس میں بولتے چالتے ہیں جیوں کا تیوں ڈول رہے اور چھانہہ بھی کسی کی نہ ہو۔

(رانی کیتکی کی کہانی، ص 18)

پروفیسر افغان اللہ خاں کی زندگی میں ایک موڑ اس وقت آتا ہے' جب انھوں نے اپنے قدیمی ورثے کو سمجھنے کا فیصلہ کیا۔انھوں نے ان بکھری وراثتوں کو ادبی روایتوں سے جوڑ دیا۔اس سلسلے میں انھوں نے کئی اہم پروجیکٹ پر کام شروع کیا۔اس میں سب سے اہم 1857 کی نئی تفہیم تھی۔پروفیسر نے پہلی بار 1912 میں شائع ظہیر دہلوی کی مشہور و معروف کتاب داستان غدر عرف طراز ظہیری پر بلیغ مقالہ لکھ کر از سر نو شائع کیا۔اپنے طویل مقدمے میں پروفیسر افغان اللہ خاں نے نہ صرف حالات ظہیر دہلوی کا مفصل تذکرہ کیا ہے' بلکہ ان کی شاعری اور نثر نگاری کے انداز کا بھی مکمل جائزہ لیا ہے۔ولیم ڈیلریمپل نے اپنے ناول دلاسٹ مغل میں کئی بار اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے ناول کئی چاند تھے سر آسماں میں بھی افغان اللہ خان کے شکریے کے ساتھ طراز ظہیری کا حوالہ دیا ہے۔پروفیسر افغان اللہ نے طراز ظہیری کی اشاعت کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

''غدر 1857 کے متعلق متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں مگر تعجب کی بات ہے کہ ان کتابوں میں درج معلومات تقریباً یکساں ہیں۔بعض محققین ضرور ایسے ہیں جو شعر و ادب کے حوالے سے اسباب غدر کے متعلق نئے گوشے دریافت کرتے ہیں لیکن تعجب کی بات تو یہ ہے ظہیر دہلوی اور ان کی خود نوشت جو غدر کے چشم دید حالات پر مبنی ہے نظر انداز کر دی جاتی ہے۔یہ الگ بات ہے کہ ظہیر دہلوی کی رائے اور فیصلے سے اتفاق نہ کیا جائے۔ لیکن انقلاب 1857 پر کام کرنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔صحیح بات تو یہ ہے کہ یہ کتاب دو اعتبار سے اہم ہے۔غدر یا انقلاب 1857 کے چشم دید حالات جو اس خود نوشت میں درج ہیں وہ نہ صرف غدر کی ابتدا سے انتہا تک روداد پیش کرتی ہیں بلکہ اس دور کے سیاسی سماجی اور تہذیبی پس منظر کو بڑی تفصیل سے پیش کرتی ہیں۔

(طراز ظہیری از ظہیر دہلوی مقدمہ اور پیش کش ڈاکٹر افغان اللہ خاں، آفسیٹ پریس گورکھپور 2003 ص 8)

اپنے ورثے کو سمجھنے اور اس کی تفہیم کے اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے انھوں نے تحریک آزادی اور چوری چورا کیس پر گہری تحقیق کی۔انھوں نے آزادی کی تحریک اور چوری چورا کیس کے عنوان سے ایک مقدمہ لکھا' جو ان کی کتاب نیرنگ نظر میں پہلی بار شائع ہوا۔ اس مقالے میں پروفیسر نے چوری چورا واردات سے قبل

کے حالات سے لے کر عدم تعاون تحریک کے بعد عوام کے غصے کے نتیجے میں چوری چورا واردات وقوع پذیر ہونے تک' پوری تفصیل لکھی ہے۔''چوری چورا گورکھپور شہر سے پچیس کلومیٹر مشرق میں واقع ہے یہاں عبداللہ نامی شخص کی کوششوں سے موضع ڈومری خرد میں منڈل کانگریس کمیٹی کا مکمل انقلابی لڑا کو دستہ ظہور میں آیا۔کمیٹی میں لال محمد' نذر علی' شکاری جولاہا' موضع ڈومری اور منڈیرا بازار کے بھگوتی پردھان مقرر کیے گئے۔چوری چورا کے کانگریسی پردھانوں نے اپنے رضا کاروں کو انقلابی بنانے کی غرض سے قواعد سکھانے کی ضرورت محسوس کی۔ضلع کانگریس کمیٹی گورکھپور کو درخواست بھیج کر قواعد کی اجازت مانگی گئی۔ضلع کانگریس کمیٹی نے فوجی ڈھنگ کی قواعد کی درخواست کو رد کر دیا۔لیکن نذر علی نے عبداللہ اور اپنے دیگر ساتھیوں سے مشورہ کر کے بھگوان یادو کو ڈرل ماسٹر مقرر کر کے لال محمد کے دروازے پر باقاعدہ قواعد کا بندوبست کیا۔شروع میں تعداد کم تھی لیکن دھیرے دھیرے رضا کاروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔رضا کاروں کے اندر اسی طرح کی ٹریننگ سے ایک نئی ترنگ اور ایک نئی بیداری پیدا ہوئی۔رضا کار پوری طرح حب الوطنی کے جذبے سے شرابور ہو گئے۔

(نیرنگ نظر از افغان اللہ خاں۔ادبی مرکز جامع مسجد گورکھپور 2000، ص 134)

آگے انھوں نے جنگ آزادی کے انقلابی نوجوانوں کی رہنمائی کرنے والے نڈر اور بہادر مجاہد رام پرساد بسمل کی شخصیت پر مبسوط مقالہ تحریر کیا۔یہ مضامین ایسے ہیں جو براہ راست ادبی مواد فراہم نہیں کرتے مگر ان سے ہم اپنی سیاسی اور جنگ آزادی کی جڑوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔جیسا کہ پروفیسر افغان اللہ خاں پر تحقیق کرنے والے ڈاکٹر اشفاق احمد کہتے ہیں۔''رام پرساد بسمل افغان اللہ خاں کا نیرنگ نظر میں شامل ایک اہم مضمون ہے۔اسے اگر بسمل کا سوانحی خاکہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔اس مضمون میں افغان اللہ خاں نے بسمل کے حوالے سے تمام معلومات فراہم کی ہیں۔انھوں نے بسمل کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کی خامیوں کو بھی اپنے اس مضمون میں بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔''

(افغان اللہ خاں کی علمی و ادبی جہتیں از ڈاکٹر اشفاق احمد ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی 2022، ص 125-124)

پروفیسر افغان اللہ خاں نے رام پرساد بسمل پر لکھے اپنے مقالے کا ماخذ گنیش شنکر ودیارتھی کی کتاب رام پرساد بسمل کا نیم سوانحی خاکہ 'کاکوری کا شہید' کو بنایا ہے' بسمل کی

> ادب کو سماجی معنویت کا حامل ہونا چاہیے۔ اس لیے میں ہمیشہ ترقی پسند خیالات اور رجحانات کا طرفدار رہا ہوں لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ میں ادب کی جمالیاتی اور فنی قدروں کو اہمیت نہیں دیتا یا اس کی نفی کر رہا ہوں۔ادب اس وقت تک عظیم ادب ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ فنی اور جمالیاتی تقاضوں کو پورا نہ کرتا ہو۔

سوانح عمری کو ودیارتھی نے مرتب کیا تھا۔بعد میں یہ کتاب امر شہید کے عنوان سے شائع ہوئی۔اسے دوبارہ بنارسی داس چترویدی نے طویل مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔اس مقالے میں رام پرساد بسمل کی زندگی اور ان کے کارنامے کی بہت عرق ریزی سے عکاسی کی گئی ہے' جو اردو کے لیے بیحد اہم ہے۔اس مقالے سے معلوم ہوتا ہے کہ رام پرساد بسمل ایک کٹر آریہ سماجی ہونے کے باوجود وہ بے حد نرم دل اور ہمدرد انسان تھے۔وہ ایک خالص مسلمان اشفاق اللہ خاں سے بہت متاثر تھے' اور ان پر بے انتہا بھروسہ بھی کرتے تھے۔بسمل کے سوانحی خاکے میں اشفاق اللہ خاں کا ذکر بار بار ملتا ہے۔بسمل اعتراف کرتے ہیں کہ تم ایک سچے اور حق پرست مسلمان ہو۔اپنی پھانسی سے تین دن قبل بھی بسمل جو تین صفحات تحریر کرتے ہیں' اس میں اشفاق اللہ خاں کو یاد کرنا نہیں بھولتے۔''رام پرساد اپنے دوستوں میں کسی سے متاثر تھے تو وہ اشفاق اللہ تھے۔وہ اشفاق اللہ کو اپنے چھوٹے بھائی کی طرح مانتے تھے۔حالانکہ وہ بڑی حد تک آریہ سماجی تھے... سبھوں کو تعجب ہوا کہ میں ایک کٹر آریہ سماجی اور تم ایک مسلمان دونوں کا کیا میل۔میں نے مسلمانوں کی شدھی کیا تھا۔کچھ ہمارے ساتھی تم سے مسلمان ہونے کی وجہ سے نفرت بھی کرتے تھے... مگر تمہاری صاف گوئی نے میرا دل جیت لیا۔کبھی کبھی دوستوں کی محفل میں بات چھڑتی کہ کہیں مسلمان پر اعتبار کر کے دھوکہ نہ کھا جائیں۔ مگر جیت تمہاری ہوئی۔ (نیرنگ نظر، ص 124-123)

انقلاب اودھ اور نواب واجد علی شاہ بہت دلچسپ تجزیاتی مضمون ہے۔یہ مضمون شیخ محمد یعقوب ندیم صہبائی فیروزپوری کے نیم تاریخی ناول نواب واجد علی شاہ عرف انقلاب اودھ پر تبصرہ و تجزیہ پر مبنی ہے۔پروفیسر افغان اللہ خاں نے اپنی تحقیق کے دوران نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ندیم صہبائی نے اپنی معلومات کا ماخذ نجم الغنی خاں نجمی رام پوری کی معروف کتاب تاریخ اودھ کی جلد چہارم کو بنایا ہے۔نجمی کے پیش نظر منشی رام سہائے تمنا کی کتاب احسن التواریخ بھی ضرور رہی ہوگی' جس میں انتزاع سلطنت اودھ پر اچھی معلومات فراہم کی گئی ہے۔ندیم صہبائی خود کو نقاش فطرت کہا کرتے تھے۔ندیم صہبائی بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں کے پاپولر ناول نگار تھے' جو دو سچے عاشقوں کی موت' محبت کے عاشقانہ خطوط' ترکی شیر عرف معشوقہ انگور' رنگیلی دلہن کی پہلی رات ٹائپ کے ناول لکھا کرتے تھے۔ ندیم صہبائی کے ناول میں کچھ بے حد دلچسپ معلومات فراہم کی گئی ہیں' جو تاریخ اودھ میں نہیں ہیں۔یہ پتہ نہیں چل پاتا ہے کہ ان معلومات کے لیے ندیم صہبائی کا ماخذ کیا ہے۔ بہر حال یہ ناول واجد علی شاہ کے معاشقے' ان کی شاعری اور ان کے پری خانے کی پوری تاریخ بیان کرنے کے ساتھ ہی اس صورت حال پر بھی بحث کرتا ہے' جس میں انتزاع سلطنت اودھ کے لیے انگریزوں کو ذہنی طور پر تیار ہونا پڑا۔اس میں اجودھیا کے ہنومان گڑھی میں ہونے والے فساد کا بھی ذکر ہے' اس فساد میں واجد علی شاہ نے فسادیوں کے خلاف سخت ایکشن لیا تھا۔

افغان اللہ خاں نے ملک محمد جائسی کی پدماوت پر کام کیا اور ملک محمد جائسی کی حیات و خدمات پر مبسوط مقالہ لکھا۔پروفیسر نے ملک محمد جائسی کا جائزہ اختلافات کے آئینے میں لیا ہے۔یہ ایک اہم مضمون ہے' جس میں ہندی نقادوں کے اختلافات کا مفصل بیان ہے۔افغان اللہ خاں اعتراف کرتے ہیں کہ جائسی پر جتنا کچھ لکھا گیا اختلافات بڑھتے ہی گئے۔ڈاکٹر افغان اللہ خاں کہتے ہیں کہ ہندی کے محقق جائسی کے متعلق صرف دو باتوں پر متفق ہیں ایک ان کے نام کے ساتھ محمد جڑا ہوا ہے اور دوسرے وہ جائس کے رہنے والے تھے۔اسی کے ساتھ انھوں نے ہندی اردو تنازعے پر بھی ایک مضمون لکھا ہے' جسے سمجھنے کے لیے جائسی کا مطالعہ بہت اہم تھا۔ان کی اہم کتاب نیرنگ نظر میں جتنے مضامین شامل ہیں وہ سب

تاریخی نقطہ نظر سے لکھے گئے ہیں۔ اگر ان مضامین کو ہم مروجہ ادبی روایت کے حوالے سے دیکھیں تو وہ سبھی مضامین اس کی نفی کرتے نظر آئیں گے۔ لیکن ادب میں ان کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کرتے ہوئے افغان اللہ خاں کہتے ہیں۔ ''ادب کو سماجی معنویت کا حامل ہونا چاہیے۔ اس لیے میں ہمیشہ ترقی پسند خیالات اور رجحانات کا طرفدار رہا ہوں' لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ میں ادب کی جمالیاتی اور فنی قدروں کو اہمیت نہیں دیتا یا اس کی نفی کر رہا ہوں۔ ادب اس وقت تک عظیم ادب ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ فنی اور جمالیاتی تقاضوں کو پورا نہ کرتا ہو۔ ادب محض تفنن طبع کی چیز نہیں ہے' ادب کے نام پر لایعنی تخلیق وتجربہ نقصان دہ بھی ہے اور گمراہ کن بھی' بالکل اسی طرح نظریاتی وابستگی میں شدت پسندی اور ماضی کے ادب کو فرسودہ قرار دینے کا بھی مخالف ہوں۔''

(نیرنگ نظر،ص 5)

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے پروفیسر افغان اللہ خاں کا سب سے اہم کارنامہ 'فراق کی شاعری' ہے۔ فراق کی شاعری ایک تحقیقی مقالہ ہے' جس پر افغان اللہ صاحب کو 1978 میں گورکھپور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی تھی۔ مگر یہ مقالہ دس سال بعد 1988 میں شائع ہوا۔ 691 صفحے پر محیط یہ مقالہ جلد ہی فراق کی زندگی اور فن پر ایک اہم ماخذ کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ پروفیسر افغان اللہ نے فراق کی شاعری پر کام کرتے ہوئے فراق کو مختلف زاویے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ جب مقالہ لکھا گیا تو فراق زندہ تھے۔ جب اس کی اشاعت کا وقت آیا تو ان کی وفات ہو چکی تھی۔ افغان اللہ نے اپنے مقالے کو کتابی شکل میں شائع کرنے سے قبل گزشتہ دس سالوں میں ہونے والی تبدیلیوں کو بھی شامل کیا ہے۔ فراق کی وفات کے بعد ماہنامہ نیا دور لکھنؤ نے فراق نمبر شائع کیا۔ اس میں دنیا بھر سے اتنے مضامین آ گئے کہ نیا دور کو دو سال کے اندر دو شماروں میں ان مضامین کو سمیٹنا پڑا۔ ان میں فراق کی خامیوں اور شخصی کوتاہیوں کے متعلق ایسے ایسے مضامین شامل ہوئے' جنھیں ان کی زندگی میں کوئی لکھنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ افغان اللہ کہتے ہیں ''اس نمبر میں کچھ مضامین ایسے ہیں جو صرف اظہار عقیدت کی حیثیت رکھتے ہیں اور چند مضامین تو ایسے ہیں جیسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون نگار حضرات شاید اس بات کے منتظر تھے کہ فراق کب مریں اور کب وہ اپنے دل کے پھپھولے پھوڑیں۔''

(فراق کی شاعری از ڈاکٹر افغان اللہ خاں' آفسیٹ پریس نخاس گورکھپور 1988، ص 679)

فراق کی شاعری کی اشاعت کے بارہ سال بعد ان کی کتاب 'دستاویز انسانی' میں فراق پر کئی اہم مضامین شائع ہوئے۔ جیسے فراق اور پنڈت جواہر لال نہرو' فراق اور پریم چند' فراق بحیثیت رباعی نگار' فراق کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب اور اس کا تشخص' فراق کی شاعری پر مغربی ادب کے اثرات وغیرہ۔ ان تمام مضامین کی بنیاد ان کی کتاب 'فراق کی شاعری' فراہم کرتی ہے۔ دستاویز انسانی میں شامل ایک اہم مضمون 'فراق کے الٹے سیدھے اپنے خیالات کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ ان کی کتاب فراق کی شاعری چالیس سال پہلے لکھی گئی مگر اس کی نثر میں آج بھی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ بعد کے دنوں میں انھوں نے اپنی نثر میں مزید سادگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کے مجموعے دستاویز انسانی 'نیرنگ خیال' 'تنقیص اور انتخاب کلام فراق میں' ان کی تحریر کا جو انداز ہے' اس میں بھاری بھرکم نظریات کو بھی بے حد آسان اور بے تکلف پیرایۂ بیان میں پیش کیا گیا

> **پروفیسر افغان اللہ کہتے ہیں۔ "یہ صحیح ہے کہ فراق بنیادی طور پر شاعر تھے' مگر ساتھ ہی ساتھ ایک اچھے صاحب طرز نثر نگار بھی تھے اور نقاد بھی' جب فراق پر کچھ لکھا جاتا ہے تو ان کے نثری کارناموں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ فراق کے بڑے شاعر والی امیج' ان کے دیگر کارناموں پر حاوی ہو جاتی ہے' اور ان کے نثر پارے پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔**

معاملات میں' پروفیسر نے اس صورت حال کا بھی محاسبہ کیا ہے' جنھیں وہ اپنی تھیسس میں شامل نہیں کر سکے تھے۔ انھوں نے فراق کا تصور حسن وعشق کے موضوع پر مقالہ تحریر کرتے ہوئے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فراق بطور شاعر بہت عظیم تھے مگر وہ ایک ناقد کی حیثیت سے بھی اہمیت کے حامل تھے۔ اردو میں عام طور پر فراق کی تنقید پر خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ پروفیسر افغان اللہ کہتے ہیں۔ ''یہ صحیح ہے کہ فراق بنیادی طور پر شاعر تھے' مگر ساتھ ہی ساتھ ایک اچھے صاحب طرز نثر نگار بھی تھے اور نقاد بھی جب فراق پر کچھ لکھا جاتا ہے تو ان کے نثری کارناموں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ فراق کے بڑے شاعر والی امیج' ان کے دیگر کارناموں پر حاوی ہو جاتی ہے' اور ان کے نثر پارے پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ بحیثیت نقاد فراق کے تنقیدی مضامین کا مجموعۂ اندازے' کے نام سے ان کی زندگی ہی میں منظر عام پر آکر قبول عام حاصل کر چکا تھا... ان کا مختصر سا کتابچہ اردو کی عشقیہ شاعری اپنی نوعیت کی پہلی اور بہترین کتاب ہے۔ فراق نے شاعری کو نئے انداز اور نئے نقطہ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔'' (فراق کی شاعری،ص 682)

افغان اللہ خاں کی نثر میں بہت سادگی اور صفائی ہے۔ انھوں نے آسان لفظیات کا استعمال کرتے ہوئے

ہے۔ وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں اس میں وزن ہوتا ہے مگر اسے وہ بہت آسان لفظیات کے ساتھ قاری کے سامنے رکھتے ہیں۔ ان کے جملوں میں اضافتوں اور انجانی ترکیبوں کا استعمال مفقود ہے۔ فراق کی شاعری کے حرف آغاز میں انھوں نے فراق کی شاعری کے فکری پہلو کو بہت سادگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ افغان اللہ خاں کی ان چند سطور کو ہم ان کے پیرایۂ بیان کے معیار کے طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ ''فراق کی شاعری کا بتدریج ارتقا کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی شاعری کے ابتدائی دنوں میں روایتی اسلوب کے پیرو تھے۔ موضوع کے لحاظ سے بھی اردو اسلوب کے اعتبار سے بھی۔ مختصراً یوں کہا جائے کہ اس زمانے میں فراق کی شاعری کا اپنا کوئی کردار نہیں تھا' اور نہ اس طرح کی کوئی پہچان یا شناخت تھی جس کی بنا پر آج وہ جانے پہچانے جاتے ہیں اور ایسا ہونا ضروری بھی تھا کیونکہ ہر شاعر اپنی شاعری کے ابتدائی دنوں میں مشق سخن کے لیے اساتذہ کی پیروی کرتا ہے۔''

(فراق کی شاعری،ص 570-569)

■

Zakir Husain Zakir
Shanti Nagar Ward No 10
Near Sant Pushpa School
Distt & Post: Deoria- 274001
Mob.:9415276138

فہیم الدین

فراموش کردہ ادبی شخصیت

سلیم جعفر

صوبۂ راجستھان سیاست اور تاریخ کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ علم وادب کے لحاظ سے بھی بڑی قدر و منزلت کا مستحق ہے۔ یہاں اردو زبان وادب نے خوب ترقی کی منزلیں طے کیں۔ راجپوتانہ کی اس سرزمین میں اردو زبان وادب کے ایسے ماہرین ہوئے جنھوں نے اردو شعروادب کے فروغ میں اپنا اہم رول ادا کیا۔ راجستھان کی ان شخصیات میں پروفیسر محمود شیرانی، اختر شیرانی، ثابت لکھنوی، بسمل سعیدی، مشتاق احمد یوسفی وغیرہ پیش پیش رہے ہیں۔

پروفیسر محمود شیرانی اردو تحقیق کی تاریخ میں نقش اول تسلیم کیے جاتے ہیں۔ صوبۂ راجستھان کے لیے یہ ایک اہم بات ہے کہ محمود شیرانی کے بعد سرزمین جے پور سے تعلق رکھنے والے سلیم جعفر نے ان کی روایت کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ آگے بڑھا کر تنقید وتحقیق کے میدان کو مزید روشن کیا۔ سلیم جعفر، محمود شیرانی کے بعد راجستھان کے دوسرے بڑے اہم محقق تسلیم کیے جاسکتے ہیں۔

مگر افسوس ہے کہ سلیم جعفر جیسے ماہر لسانیات، محقق اور عروضی کی مستند سوانح کی شیرازہ بندی ابھی تک نہ ہوسکی ان کے مفصل اور مستند سوانحی کوائف کی کوئی تصنیف ہمیں حاصل نہیں ہوئی ہے تاہم راقم نے جوں توں ان کے حالاتِ زندگی کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ سلیم جعفر کا اصل نام محمد حبیب اللہ قریشی تھا۔ اردو شاعری میں ان کا تخلص حبیب تھا۔ آپ اردو نثر میں قلمی نام 'سلیم جعفر' اور ہندی، سنسکرت میں 'اربدیش' اختیار کرتے تھے۔

سلیم جعفر قصبہ کرسی ضلع بارہ بنکی صوبہ اتر پردیش میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش سے متعلق مصنفین میں اختلافات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی نے ان کی تاریخ پیدائش 1890 کے آس پاس بتائی ہے جب کہ ڈاکٹر شاہد احمد جمالی نے سلیم جعفر کی تاریخ پیدائش 1893 لکھی ہے اور احترام الدین احمد شاغل نے تذکرہ شعرائے جے پور میں لکھا ہے کہ حبیب 1301ھ میں بروز شب برأت کرسی میں پیدا ہوئے۔

ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ سلیم جعفر کی تاریخ پیدائش کے متعلق احترام الدین احمد شاغل کا بیان زیادہ قرینِ قیاس اور مستند معلوم ہوتا ہے جس کی تائید پروفیسر فیروز احمد نے بھی کی ہے۔ پروفیسر فیروز احمد اپنی تصنیف 'تحقیقات' میں لکھتے ہیں کہ سلیم جعفر کرسی ضلع بارہ بنکی (اتر پردیش) میں 1301ھ مطابق 1884 میں پیدا ہوئے تھے۔

سلیم جعفر کے والد کا نام محمد نور اللہ تھا۔ جو جے پور ریاست میں ملازم تھے۔ اس لیے سلیم جعفر کم عمری میں ہی والد کے پاس جے پور چلے آئے تھے۔ ان کی تقریباً چار شادیاں ہوئیں۔

انھوں نے جے پور میں ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ احترام الدین احمد شاغل تذکرہ شعرائے جے پور میں رقمطراز ہیں:

''بچپن ہی میں اس وجہ سے جے پور آگئے کہ آپ کے والد یہاں ریاست میں ملازم تھے اول گھر پر تعلیم پائی پھر یہیں کے مدارس سے 'منشی عالم' اور 'ایف-اے' پاس کیا۔ ہندی اور سنسکرت کے عالموں سے یہ دونوں زبانیں بھی سیکھیں اور کثرت مطالعہ سے اچھی استعداد حاصل کرلی۔''

(تذکرہ شعرائے جے پور از احترام الدین احمد شاغل، 1958، ص 220-21)

سلیم جعفر نے تعلیم جاری رکھی۔ انھوں نے بی اے میں داخلہ لیا تھا مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکے تھے۔ سلیم جعفر کی تعلیم وتربیت اور مختلف زبانوں میں ان کی مہارت کے متعلق الیاس عشقی لکھتے ہیں:

''بی اے میں ناکام ہونے کے بعد انھوں نے تعلیم کو خیر باد کہہ کر پہلے غالباً ریلوے میں کلرکی کی تھی۔ اس کے بعد گورنمنٹ کے پولیٹکل ڈپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرلی تھی۔ تعلیم میں ناکامی سنسکرت میں ان کی غیر معمولی شغف کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اصل میں جو وقت انھیں کالج کی تعلیم کو دینا چاہیے تھا وہ سنسکرت کی زبان کے حصول کے سلسلے میں پنڈتوں کی خدمت میں گزار دیا تھا اور وہ اس پر کبھی افسردہ یا شرمندہ نہ ہوئے تھے۔ ہمارے شہر جے پور کا سنسکرت کالج برصغیر کے دو قدیم اور مشہور کالجوں میں سے ایک ہے۔ اس میں علوم سنسکرت کے چند عظیم ترین عالم اور ماہر اساتذہ موجود تھے اور اس کے ادھیکیش (پرنسپل) مہامہو پادھیائے شری گردھر شرما تھے۔ میں نے اس کالج کے بعض اساتذہ کو قریشی صاحب کے متعلق یہ کہتے سنا ہے کہ مسلمان ہونے کے باوجود انھوں نے سنسکرت زبان وادب میں غیر معمولی استعداد پیدا کرلی ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ سنسکرت کی طرح ہندی بھی انھوں نے پنڈتوں سے پڑھی تھی۔ انھیں عربی زبان خاطر خواہ معیار تک نہیں سیکھ سکنے کا ہمیشہ افسوس رہا۔ وہ فرانسیسی اور جرمن زبانیں بقول خود اپنے (Workable) کام چلانے کے قابل جانتے تھے۔ لاطینی، یونانی، عبرانی اور قدیم فارسی (پہلوی) انھوں نے سیکھی تھی۔ مرہٹی، گجراتی، راجستھانی وہ بولتے اور سمجھتے تھے۔ انگریزی فارسی اور اردو پر قادر تھے۔''

(حبیب اللہ قریشی (سلیم جعفر/اربدیش) از الیاس عشقی ماہنامہ

> **سلیم جعفر کااہم کارنامہ 'گلزارِ نظیر' ہے۔ انھوں نے نظیر اکبر آبادی کے کلام کو 'گلزارِ نظیر' کے نام سے مرتب کیا۔ گلزار نظیرتدوینِ متن کا اہم کارنامہ ہے۔ یہ کتاب 1951 میں ہندوستانی اکیڈمی، صوبۂ متحدہ الٰہ آباد سے شائع ہوئی۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں سلیم جعفر نے طویل مقدمے کے ساتھ نظیراکبر آبادی کے کلام کوتین حصوں میں تقسیم کیا ہے اور آخرمیں کلام نظیرکی مبسوط فرہنگ پیش کی ہے۔ سلیم جعفر نظیریات کے ماہرتھے۔**

سیپ، کراچی، شمارہ 66، ص 142)

سلیم جعفر انگریزی حکومت میں ملازم رہے تھے۔ احترام الدین احمد شاغل ان کی ملازمت کے متعلق لکھتے ہیں کہ :

''اول آپ ڈی ٹی ایس آفس بھٹنڈہ میں ملازم ہوگئے پھر دہلی میں رہے اور ایک عرصے تک آبو میں رہے۔ 20-1919 میں سیتان علاقہ ایران میں بھی مامور ہونے کا موقع ملا۔ گورنمنٹ ہند کی ملازمت سے پنشن کے بعد 1945 سے 1947 تک ریاست قرولی کی کونسل کے سکریٹری رہے وہاں سے مستعفی ہوکر جے پور چلے آئے اور 1948 میں پاکستان چلے گئے۔''

(تذکرہ شعرائے جے پور از احترام الدین احمد شاغل، ص 221)

سلیم جعفر اور دیا نرائن نگم کے درمیان گہری دوستی تھی۔ سلیم جعفر ان کے اخبار 'زمانہ' کانپور کے ایک اہم قلمکار تھے۔ میری تحقیق یہ کہتی ہے کہ زمانہ کانپور میں منشی پریم چند کے بعد سلیم جعفر نے سب سے زیادہ مضمون لکھے ہیں۔ سلیم جعفر اور دیا نرائن نگم کی دوستی اور محبت کا اندازہ ان خطوط سے بھی ہوتا ہے جو وقتاً فوقتاً دیا نرائن نگم نے سلیم جعفر کو لکھے تھے۔ محمد ایوب واقف نے 'مکاتیبِ نگم' میں دیا نرائن کے وہ تین خطوط شامل کیے جو سلیم جعفر کو لکھے گئے تھے۔ ان خطوط سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دونوں میں گہری دوستی اور دلی محبت تھی۔ دیا نرائن کو ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا اور وہ چاہتے تھے کہ سلیم جعفر ان کے پاس آ کر رہنے لگیں۔ دیا نرائن جب علیل ہوئے تو ایک لمبے عرصے تک سلیم جعفر نے 'زمانہ' رسالے کی ادارت آبو، راجستھان میں رہتے ہوئے سرانجام دی۔ الیاس عشقی اپنے مضمون میں اس کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''آخری تقریباً پندرہ سالہ سال میں پہلے وہ زمانہ کے حصہ نثر اور نثر سمیت پورے رسالے کو ایڈٹ کرتے رہے لیکن ادارت کے باوجود انھوں نے کبھی رسالے پر بحیثیت ایڈیٹر یا معاون مدیر کے اپنا نام چھپوانا پسند نہ کیا، مدیریت کا کام انھوں نے پہلے منشی دیا نرائن نگم (ایڈیٹر زمانہ) کی طویل علالت کے دوران نثر کے حصے کی ادارت سے شروع کیا تھا اس زمانے میں ایڈیٹر کی حیثیت سے نگم صاحب کا نام چھپتا رہا جب رفتہ رفتہ سارے رسالے کی ادارت کی ذمہ داری ان پر آپڑی تب بھی انھوں نے اپنا نام رسالے پر نہ چھپوایا۔ دیا نرائن نگم چاہتے تھے کہ قریشی صاحب اپنا اصلی یا قلمی نام رسالے پر ان کے ساتھ چھپوائیں مگر قریشی صاحب اس پر رضامند نہ ہوئے۔ وہ کہتے تھے کہ وہ رسالے کو دیا نرائن نگم کے انداز میں اس رسالے کی روایت کے مطابق مرتب کرتے تھے۔ یہ ان کا رسالہ تھا۔''

(حبیب اللہ قریشی (سلیم جعفر/ اربدیش) از الیاس عشقی، ماہنامہ سیپ، کراچی، شمارہ 66، ص 134)

سلیم جعفر کا اہم کارنامہ 'گلزارِ نظیر' ہے۔ انھوں نے نظیر اکبر آبادی کے کلام کو 'گلزارِ نظیر' کے نام سے مرتب کیا۔ گلزار نظیر تدوینِ متن کا اہم کارنامہ ہے۔ یہ کتاب 1951 میں ہندوستانی اکیڈمی، صوبہ متحدہ الہ آباد سے شائع ہوئی۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں سلیم جعفر نے طویل مقدمے کے ساتھ نظیر اکبر آبادی کے کلام کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے اور آخر میں کلام نظیر کی مبسوط فرہنگ پیش کی ہے۔ سلیم جعفر نظیریات کے ماہر تھے۔ اردو کے ناقدین نے نظیر اکبر آبادی کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جبکہ سلیم جعفر ان ناقدین کے خیالات کے سخت خلاف تھے۔ شیفتہ نے نظیر اکبر آبادی کو ایک بازاری شاعر کہہ کر ان کی تمام تخلیقات کو شاعری ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ سلیم جعفر شیفتہ کے اس متعصبانہ رویہ سے حیران تھے۔ جب کہ رشید حسن خاں نے 'انتخابِ نظیر اکبر آبادی' کے دیباچے میں 'گلزارِ نظیر' کو قابل قدر تسلیم کیا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں کہ:

''نظیر کا کلیات بار بار چھپا ہے۔ سب سے اچھا نسخہ وہ ہے جسے مولوی عبدالغفار شہباز نے مرتب کیا تھا اور 1900 میں مطبع نول کشور سے شائع ہوا تھا۔ مخمور آبادی کا مرتبہ انتخاب روحِ نظیر اور سلیم جعفر کا انتخاب گلزارِ نظیر (شائع کردہ ہندوستانی اکیڈمی) بھی قابلِ لحاظ ہیں۔ ان دونوں میں کچھ نہ کچھ اضافے اور تصحیحات ہیں۔ ...... 'گلزارِ نظیر' سے خاص طور پر مدد لی گئی ہے۔''

(انتخاب نظیر اکبر آبادی، مرتبہ رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ، دہلی، 1992، ص 8)

سلیم جعفر کی دوسری اہم تصنیف 'تحقیق اللغات' ہے۔ یہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا نسخہ ہندوستان میں موجود نہیں ہے۔ میر پور خاص پاکستان کے باشندے بشیر عنوان صاحب کے پاس اس کا قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ بشیر عنوان تحقیق اللغات سے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''انھوں نے 1954 سے 1956 کے درمیانی عرصے میں 'تحقیق اللغات' کے نام سے ایک اشتقاقی لغت بھی تالیف کی۔ اس لغت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قریشی صاحب نے اردو زبان میں رائج ایسے الفاظ کے اشتقاقات بتائے ہیں جو ہندی اور فارسی زبانوں سے اردو میں داخل ہوئے ہیں اگر چہ لغت اگست 1956 میں مکمل ہو چکی تھی مگر تا حال شائع نہیں ہو سکی۔''

(بشیر عنوان، میر پور خاص، رسالہ دنیا زاد کتابی سلسلہ، کراچی، شمارہ نمبر 15، اگست 2005، 281)

آپ اپنے عہد کے ہندو پاک کے مشہور و معروف رسائل میں کثرت سے لکھا کرتے تھے۔ آپ کے تقریباً سو سے زیادہ مضامین دستیاب ہو چکے ہیں۔ جو مدینہ، زمانہ، اردو ادب، ہندوستانی، ساقی، نگار، خیام، عالمگیر، ہمایوں، نیا دور (کراچی)، پھول، قومی زبان (پاکستان) وغیرہ رسائل میں شائع ہو کر اردو ادب کے قیمتی زیور کی حیثیت بنے ہوئے ہیں۔ آپ کے مضامین تحقیقی، تنقیدی، لسانی، شخصی، تبصراتی، سماجیاتی، تاریخی، علم عروض اور ترجمہ سے متعلق ہیں۔ اس طرح سلیم جعفر کے مضامین مختلف نوعیت کے ہیں جن سے آپ کی علمی استعداد کا علم ہوتا ہے۔

سلیم جعفر نے اپنی بہت سی کتابیں دوستوں کو لکھ کر دیں جو آج ان کے نام سے منسوب ہیں۔ ان کی کچھ تصانیف شائع بھی نہ ہو سکیں جیسے مطالعاتِ فارسی، تحقیق اللغات، کلامِ کبیر، شیکسپیئر کے ڈراموں کے اردو ترجمے وغیرہ۔ سلیم جعفر کا بیشتر ادبی سرمایہ مضامین و مقالات کی شکل میں حاصل ہوتا ہے جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ اگر ان مضامین و مقالات کو کتابی شکل دی جائے تو تقریباً تین چار کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔

■

Faheemuddin
Research Scholar, Govt Arts College
Kota University- 324001 (Rajasthan)
Mob.:9829991733

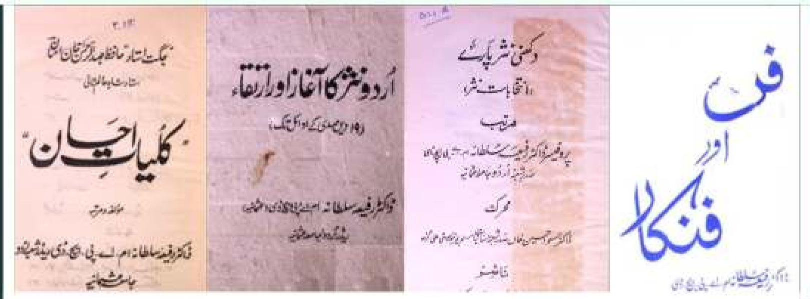

محمد شفیع بھٹ

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی ادبی جہات

اردو ادب کے سرمائے میں مردوں کے دوش بدوش جن خواتین نے بیش بہا اضافہ کیا ہے ان میں ایک نام ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کا بھی ہے۔ آپ کا تعلق اورنگ آباد سے تھا جو کہ ہندوستان کا وہ علاقہ ہے جہاں سے اردو زبان وادب کے تناور درخت کی تخم ریزی ہوئی ہے۔ آپ عثمانیہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھیں۔ یہ ادارہ ہندوستان کی سیاسی، سماجی، ادبی، علمی اور تہذیبی زندگی کے اعتبار سے ایک منفرد اور اعلیٰ مقام ومرتبہ رکھتا ہے۔ اردو زبان کے جید علما، ادبا اور شعرا کی گہری وابستگی اس ادارے سے رہی ہے اور رفیعہ سلطانہ بھی اس تابندہ وتابناک ادارے سے منسلک رہی ہیں۔ آپ اس ادارے کی ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری حاصل کرنے والی پہلی خاتون ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے آپ میں علمی وادبی ذوق وشوق اور اعلیٰ تعلیم کی حصولیابی کی روح پھونکی ہے۔ آپ خوش قسمت تھیں کہ آپ کو جامعہ عثمانیہ میں اردو ادب کی قدآور ہستیوں سے کسبِ فیض کا موقع ملا۔ جن ادبی ہستیوں کی صحبت ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کو میسر رہی ان میں پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، حکیم شمس اللہ قادری شامل ہیں۔ آپ نے ایک متنوع اور ہمہ جہت زندگی گزاری ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو میں درس وتدریس کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے تئیں آپ کی گراں قدر خدمات ہیں۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ بیک وقت محقق، نقاد، مدون، فکشن نگار اور اعلیٰ پایے کی استاد تھیں۔ انھیں فارسی اور انگریزی زبان وادب سے گہرا شغف تھا۔ اردو زبان پر بھی انھیں عبور حاصل تھا اور اپنی تقاریر اور تصانیف میں کوثر میں دھلی ہوئی زبان کو برتا ہے۔ وہ انگریزی ادب اور مغرب کی جدید تحریکوں سے بے حد متاثر تھیں۔ انھوں نے اپنے مضامین کے توسط سے اردو والوں کو نہ صرف ان تحریکوں سے روشناس کرایا ہے بلکہ جدید ادب اور نئے ادیبوں کے ساتھ کلاسیکی ادب اور اساتذہ کو بھی ان عصری تحریکوں کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی سعی کی ہے۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک کتابچے بعنوان 'حیدرآباد' سے کیا ہے۔ اس کتابچے کو انھوں نے 1944 میں ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد کی فرمائش پر تحریر کیا تھا۔ یہ کتابچہ نہ صرف مصنفہ کے اپنے وطنِ عزیز کی محبت ومودت اور فطری لگاؤ کا آئینہ دار ہے بلکہ ادبِ اطفال کا بھی ایک قابلِ قدر نمونہ ہے۔ چھ ابواب میں منقسم اس کتابچے کو حیدرآبادی بچوں کے لیے لکھا گیا ہے تاکہ وہ اپنے شہر کی تاریخ وروایات، تہذیب وثقافت اور مشہور تاریخی مقامات سے واقف ہو جائیں۔ مصنفہ نے اس مختصر تصنیف میں نہایت ہی آسان، سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے اور اس بات کا بھی خاص طور پر لحاظ رکھا کہ کوئی ایسی بات یا کوئی ایسی تفصیل سامنے نہ آئے جو بچوں کی سمجھ سے بالاتر ہو۔ 'موتیوں کا شہر' کے نام سے مشہور شہر حیدرآباد کی مختصر تاریخ، قدرتی وسائل، تہذیب وروایات، شائستگی وآداب، رہن سہن، آثارِ قدیمہ، تاریخی مقامات، ذرائع نقل وحمل غرض پورے شہر کا نقشہ اس کتابچے میں بڑے دلچسپ انداز میں کھینچا گیا ہے۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی پہلی تحقیقی تصنیف 'اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ' ہے۔ یہ تحقیقی کام انھوں نے ایم اے کے مقالے کے لیے تحریر کیا اور 1962 میں مجلس تحقیقاتِ اردو، حیدرآباد سے شائع ہوا۔ اس میں مصنفہ نے اردو ادب کی نشو ونما میں خواتین کی حصے داری کو سامنے لایا ہے۔ اس سے قبل کسی بھی ناقد یا ادیب نے خواتین کی ادبی خدمات کے اس اہم رول کی جانب توجہ نہیں کی۔ مصنفہ حرفِ اول میں لکھتی ہیں:

''اردو ادب اور خواتین ایسا موضوع ہے جس پر اب تک کسی اہلِ قلم نے قلم اٹھانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ چند تذکرے خواتین کی شاعری کے متعلق لکھے گئے۔ لیکن وہ اول تو صرف شاعری سے تعلق رکھتے تھے۔ دوسرے ان میں تحقیقی مواد کدوکاوش سے فراہم نہیں کیا گیا تھا۔''

(اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، مجلس تحقیقاتِ اردو، حیدرآباد، 1962، ص الف)

سات ابواب پر مشتمل کتاب ہذا میں مصنفہ نے مختلف ادوار کے تحت شاعرات اور خواتین نثر نگاروں کے مکمل ادبی کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ قدیم ادب کی نشو ونما دکن میں ہوئی، مرد شعرا کے ساتھ ساتھ وہاں کی شاعرات کی بھی کثیر تعداد ملتی ہے۔ ان کے ادبی کارناموں سے اردو دنیا کو روشناس کرانا مصنفہ کی بے پناہ محنت ومشقت کا بین ثبوت ہے۔ دورِ جدید خاص تحقیق وکاوش سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں مصنفہ نے ادب کی مختلف اصناف بالخصوص ناول، افسانہ اور شاعری کے الگ الگ باب قائم کر کے خواتین قلم کاروں کی ادبی خدمات کا تفصیلی وتنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس طرح یہ تصنیف اردو ادب میں خواتین کے اہم کردار پر قابلِ تحسین تحقیق ہے۔

'اردو نثر کا آغاز وارتقا (19 ویں صدی کے اوائل تک)' مصنفہ کی دوسری تصنیف ہے۔ یہ ان کے پی ایچ ڈی مقالے کا عنوان تھا جسے انھوں نے پروفیسر عبدالقادر سروری کی زیرِ نگرانی 1955 میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا ہے۔ گیارہ ابواب پر مشتمل یہ مقالہ 1962 کو کتابی صورت میں منصۂ شہود پر آیا۔ اس تحقیقی کام کے لیے مصنفہ نے اچھوتے موضوع کا انتخاب کیا تھا۔ اس موضوع سے متعلق مواد کے لیے انھیں مختلف ہندوستانی کتب خانوں کی خاک چھاننی پڑی اور کافی محنت ومشقت اور عرق ریزی کے بعد اس دقت طلب کام کو انجام تک پہنچا دیا۔ فورٹ ولیم کالج سے قبل کے اردو نثری کارناموں کا تذکرہ بہت ہی مختصر تھا۔ قدیم نثر کی مکمل تاریخ اور کئی اہم نثری شہ پاروں سے اردو دنیا کو واقف کرانے کے لیے مصنفہ کا یہ تحقیقی کام بیش قیمت اور ناقابلِ فراموش ہے۔

'فن اور فنکار' ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے گیارہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو مختلف اوقات میں مختلف موضوعات پر قلم بند کیے گئے ہیں۔ کتاب میں شامل سبھی مضامین تنقیدی نظریہ کے حامل ہیں جس سے مصنفہ کا تنقیدی نقطۂ نظر واضح ہو جاتا ہے۔ ان تنقیدی تحریروں سے انھوں نے اپنے نئے زاویوں اور معیاروں سے اردو ادب کے نامور کلاسیکی شعرا وادبا جیسے میر تقی میر، بہادر شاہ ظفر اور نذیر

احمد کے فن پاروں کو پرکھنے اور جانچنے کی سعی کی ہے۔ مذکورہ مجموعے کے تنقیدی مضامین کو پڑھنے کے بعد مرتب مضامین کے مطالعے کی وسعت اور تنقیدی ادراک کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ سیدہ جعفر رقمطراز ہیں:

''ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'فن اور فنکار' خواتین کے ادب کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کے یہ مضامین ان کی علمیت اور تنقید کے فن سے گہری واقفیت کے غماز ہیں... ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی تنقیدیں وقیع اور ان کی رائیں متوازن ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین میں فنی اصول کا احترام موجود ہے۔ انصاف پسندی ان کی تنقید نگاری کا جوہر ہے۔ اپنے تنقیدی مضامین میں وہ دوسروں کے ادبی محاکموں اور انتقادی فیصلوں کو دہرا کر مطمئن نہیں ہوگئی ہیں۔ اپنی ناقدانہ صلاحیتوں اور علمی نقطۂ نظر پر ان کا یہ اعتماد ان کی تنقید نگاری کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔''

(سیدہ جعفر، خواتین اور تنقید نگاری، مشمولہ: اردو میں نسائی ادب کا منظر نامہ، مرتبہ: قیصر جہاں شعبۂ اُردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 2004، ص 221،224)

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کا ایک اور کارنامہ 'اقبال سخن' ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اردو کے نابغۂ عصر شاعر علامہ اقبال کی حیات اور ان کے کلام کی روح کو سادہ و سلیس انداز میں اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس میں اقبال کا مطالعہ ایک نئے زاویۂ نظر سے کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال کے کلام اور شخصیت پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور لکھا جارہا ہے۔ ان پر مزید لکھنے میں اکثر و بیشتر دہراؤ سا محسوس ہوتا ہے لیکن رفیعہ سلطانہ نے مذکورالذکر کتاب کی ترتیب ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے دی ہے جو ابتدائی جماعتوں کے طالب علموں کے لیے نہایت ہی سود مند اور مد و معاون ثابت ہوں گے۔ مرتب تصنیف دیباچہ میں لکھتی ہیں:

'اقبال سخن' کو میں نے بعض جامعات کے اساتذۂ اردو کے مشورے سے مرتب کیا تھا۔ اس کی ضرورت یہ محسوس کی گئی تھی کہ جامعہ کی جماعتوں کے لیے اقبال کے کلام کا ایک ایسا انتخاب وقت کا بڑا تقاضا تھا، جو ان کی شاعری کی نشو ونما کے سارے ادوار اور خصوصیات پر حاوی ہو اور ساتھ ہی مختصر اور مفید بھی ہو۔''

(ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، اقبال سخن، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان حیدرآباد دکن، 1958)

تحقیق وتنقید کے علاوہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے تدوین متن میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اس حوالے سے سب سے پہلا وقیع کام اردو کے ابتدائی دور کے شاعر برہان الدین جانم کی نثری تصنیف 'کلمة الحقائق' کی ترتیب وتدوین ہے۔ مرتبہ نے اس قدیم رسالے کو چار نسخوں کی بنیاد پر مرتب کرکے 1961 میں مجلس تحقیقاتِ اردو، حیدرآباد دکن سے شائع کیا ہے۔ اس کے شروع میں انھوں نے بڑا جامع اور ہمہ گیر قسم کا مقدمہ لکھا ہے جس میں مصنف کے احوالِ زندگی، ادبی کارنامے اور اسلوبِ نگارش پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد رفیعہ سلطانہ نے 1967 میں آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی کے اربابِ اقتدار کے ایما پر 'دکنی نثر پارے (انتخاب نثر)' مرتب کیا ہے۔ قدیم دور کے دکنی مصنفین کے نثری شہ پاروں کو تین عناوین گنجینۂ فکر، وجدانِ فن اور سبدِ گل کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ مرتبہ نے اس پر ایک مبسوط مقدمہ تحریر کرکے آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی سے شائع کیا۔

نثری کارناموں کی تدوین وترتیب کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو شاعری کے عہدِ زریں کے غیر معروف شاعر 'جگت استاد' حافظ عبدالرحمٰن خان احسان کی کلیات کو مدون ومرتب کرکے 1968 میں شائع کیا۔ احسان میر وسودا اور ذوق وغالب کے ہم عصر تھے اور شاہ نصیر، ذوق اور ممنون سے ادبی چشمک بھی رہی ہے۔ احسان مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کے استاد رہ چکے ہیں۔ عربی وفارسی کے ماہر تھے اور علمِ عروض میں طاق بھی۔ 'کلیاتِ احسان' میں مولفہ ومرتبہ نے احسان کے کلام کی ترتیب وتہذیب کے ساتھ ساتھ ان کے خاندان، ان کی ولادت، ان کا عہد، سفرِ لکھنؤ، احسان کا نظریہ شعر، اپنے عہد کی عکاسی، اولاد، ذاتی وجاہت اور وفات ومدفن تک کے احوال پر بہت تحقیقی معلومات فراہم کی ہیں۔ مرتبہ نے اس اہم کارنامے سے نہ صرف اردو قارئین کو اس گمنام استادِ شاعر سے روشناس کرایا ہے بلکہ اردو کے کلاسیکی ادب میں بیش بہا اضافہ بھی کیا ہے۔

تخلیقی ادب میں ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے فکشن کی دو کتابیں 'دودِ چراغِ محفل' اور 'کچے دھاگے' یادگار چھوڑی ہیں۔ 'دودِ چراغِ محفل' غالب پر لکھا ہوا ڈراما ہے اور 'کچے دھاگے' ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اول الذکر تصنیف اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کی حیات اور ان کے کارناموں پر مبنی ایک ڈراما ہے۔ ڈرامے کا عنوان مصنفہ نے غالب کے ہی شعر سے منتخب کیا ہے۔ شعر یوں ہے۔

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا، سو پریشان نکلا

ڈراما ہذا تین ایکٹ اور تیرہ مناظر پر مشتمل ہے۔ ڈرامے کے پہلے ایکٹ کو ولادت، دوسرے کو جوانی اور تیسرے ایکٹ کو ادھیڑپن کا عنوان دیا گیا ہے۔ ہر ایکٹ کو زمان ومکان کے لحاظ سے منقسم کیا گیا ہے۔ پہلا ایکٹ آگرہ میں 1797 سے 1816 تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں تین مناظر ہیں جن میں غالب کی پیدائش سے لڑکپن تک کے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ دوسرا ایکٹ دہلی میں 1816 سے 1847 پر محیط ہے۔ پانچ مناظر کے اس ایکٹ میں مصنفہ نے مرزا غالب کی زندگی کے درمیانی حصے کو پیش کیا ہے۔ اس میں غالب کے ایامِ شباب دکھائے گئے ہیں اور وہ ہمہ وقت شعر پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تیسرے ایکٹ میں بھی پانچ مناظر ہیں اور یہ ایکٹ بھی دہلی میں 1847 سے 1869 کے دور کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں غالب کا بڑھاپے میں قدم رکھنے سے وفات تک کے واقعات سے روبرو کروایا گیا ہے اور غدر کے پرآشوب دور کا ذکر بھی ہوا ہے۔ غالب غدر کی خونریزی سے بچ جاتے ہیں لیکن فرنگی لٹیرے ان کے بھائی یوسف مرزا کو قتل کردیتے ہیں۔ غالب کی حویلی میں بھی فرنگی سپاہی گھس آتے ہیں اور غالب پر بھی گرفتاری کی نوبت آتی ہے لیکن کسی طرح محفوظ رہتے ہیں۔ ڈراما ہذا کے آخری سین میں غالب اور حالی ایک دوسرے سے ہم کلام ہیں بعد ازاں حالی کی موجودگی میں ہی غالب کی موت واقع ہوجاتی ہے۔

افسانوی مجموعہ 'کچے دھاگے' نو افسانوں پر مشتمل ہے۔ جس میں زیر و بم، نئے پرانے، کچے دھاگے، کھنڈر، بیس سال بعد، بھنور اِرسیا، دلِ ناداں، نور وظلمت اور رومیو جولیٹ جیسے افسانے شامل ہیں۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے افسانوں کا کینوس جاذبِ توجہ ہے جس میں زندگی کے متنوع رنگ موجود ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں صنف اِناث کے مسائل، فرسودہ رسوم و روایات کے خلاف احتجاج، غمِ ذات اور غمِ عشق کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت کا تنوع، اس کا حزن و یاس، اس کی مسرت وانبساط اور اس کی ستم شعاری جیسے موضوعات کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

غرض جامعہ عثمانیہ کی مایہ ناز خاتون ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اردو ادب کے مختلف میدانوں تنقید، تحقیق، تدوین وترتیب اور تخلیق میں لازوال کارنامے انجام دیے ہیں۔ اردو کے تحقیقی وتنقیدی میدان میں خواتین کی شراکت نہایت قلیل ہے اور جن خواتین نے فقط قدیم ادب کی تحقیق وتنقید کو کارِ ادب کے طور پر اختیار کیا ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ رفیعہ سلطانہ ان ہی خواتین میں سے ایک ہیں۔ ماضی کی گرد میں گم شدہ دفینوں کی نقاب کشائی ان کی عرق ریزی اور جانفشانی کا ثبوت ہے۔ اردو ادب کے تئیں ان کی یہ خدمات بے حد وقیع، موقر اور قابلِ رشک ہیں۔

■

Dr Mohd Shafi Bhat
Lecturer (C) Model Govt. Degree College
Charar-i-Sharief, Budgam 191112 (J&K)
Mob:6005706273
Email:bhattshafi786@gmail.com

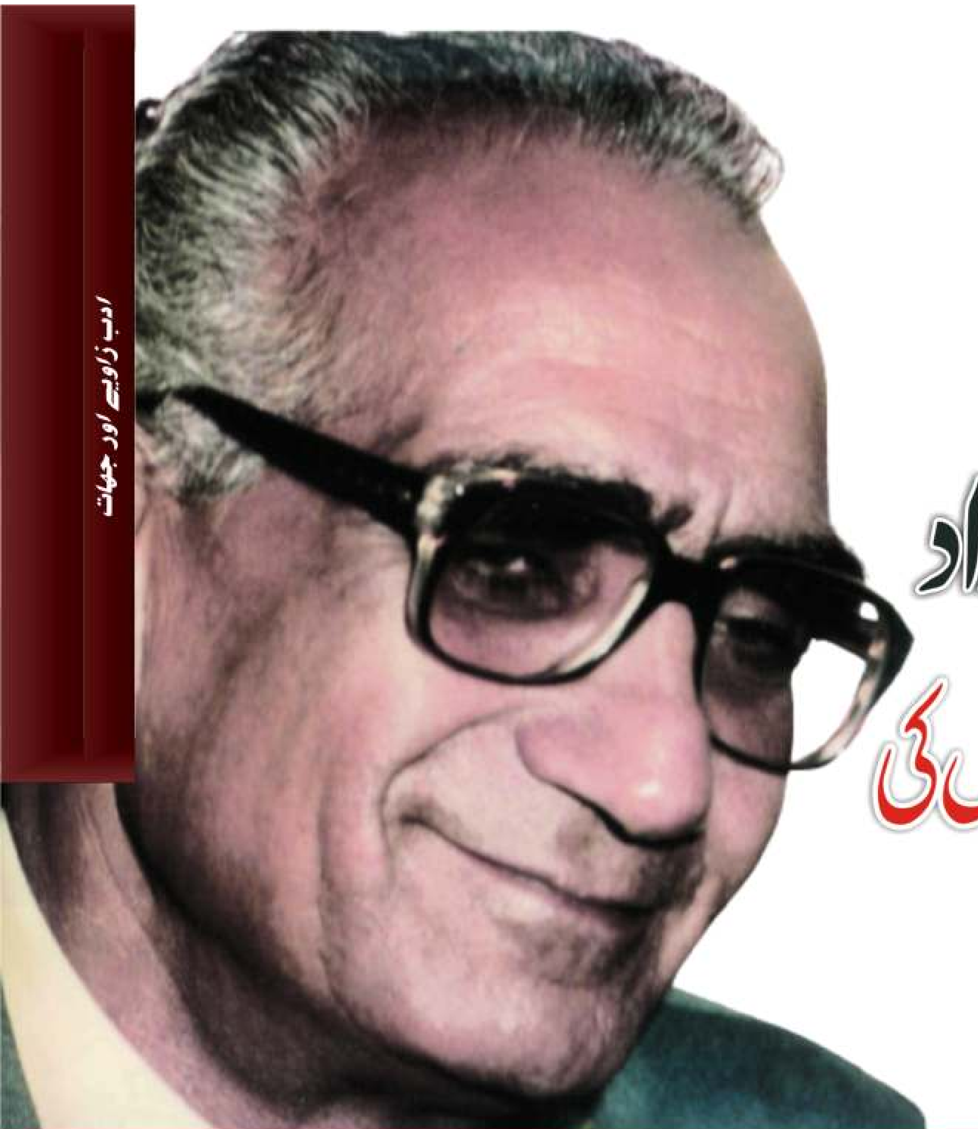

احمد امتیاز

جگن ناتھ آزاد کی نظموں میں شعری عمل کی جہتیں

جگن ناتھ آزاد کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ بنیادی طور پر وہ ایک شاعر تھے لیکن ان کے کارنامے کسی ایک شعبے تک محدود نہیں تھے۔ ان کے تفاعل کی جہتوں میں شاعری کا مقام بہت بلند ہے لیکن انھوں نے صحافت، درس و تدریس اور انتظامیہ کے فرائض بھی انجام دیے۔ شاعری میں غزلوں اور نظموں کے علاوہ رباعیات، قطعات، نعت و منقبت، سلام اور شخصی مرثیے لکھے۔ نثر میں سفر نامے، خودنوشت، خاکے اور تنقید لکھی۔ تنقید میں اقبالیات ان کا خاص میدان تھا۔ وہ کلاسیکی ادب اور علم الشعریات سے بخوبی واقف تھے۔ انھیں مغربی ادب، تحریک اور رجحان کا بھی خوب علم تھا۔ ان تمام جہتوں نے اُن کی فکر کو ایک خاص قسم کی کشادگی اور فہم کو مختلف انداز کی وسعت عطا کی تھی۔ اسی فکر وفہم نے اُن کی شاعری اور تنقید کو زندگی کے گوناگوں تجربات سے مالا مال کیا تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں اپنے عہد کی بھرپور عکاسی کی اور انسان کی پامال تہذیبی صورت حال کو پیش کیا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں تقسیم کے کرب کو ایک خاص عنوان عطا کیا اور مسلسل و متواتر خواب شکنی کو نئے اسلوب سے آشنا کیا۔ سیاسی اخلاقیات اور اخلاقی سیاسیات کے درمیان حواس باختہ زندگی اور زیست بسری کو شعری جامہ پہنایا۔ اس پیش کش میں اُن کا شعری لحن کبھی بلند آہنگ، کبھی نرم رَو، کبھی جذبات آمیز تو کبھی سادہ نظر آتا ہے لیکن غصہ اور نفرت کا جذبہ کہیں نظر نہیں آتا۔

جگن ناتھ آزاد کی نظموں میں محض جذباتی رَو یا میلان کارفرما نہیں ہے۔ ان کی شاعری کے جن بہترین تفاعل نے مجھے متاثر کیا، اُن میں سے ایک یادوں کی باز آفرینی ہے۔ ایسی بہت سی نظموں میں ہمیں شکوہ، شکایت اور تلخ و شیریں تجربات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لیکن انھیں نظم کے اجتماعی آہنگ سے کسی طور جدا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس قسم کے رویے سے اُن کی نظموں کا کینوس بہت وسیع ہوگیا ہے۔ ان کی اکثر نظموں میں تخلیقی جوہر اور لسانیاتِ شعری کی کشادگیوں کا احساس ہوتا ہے اور یہی کشادگی نظمیہ حقیقت کو ایک نئی حقیقت کے قالب میں ڈھالنے اور اُن میں نئے تخلیقی امکانات پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ وہ اپنی نظموں میں روزمرہ کو بڑی خوبی کے ساتھ برتتے ہیں بلکہ اسما و الفاظ اور مصطلحات کا بھی برجستہ استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی نظموں میں تخلیقی رَو کے طور پر نئے نئے لسانی زمرے خلق ہوئے ہیں جو عمومیت پر قائم ہونے کے باوجود تخصیص کی کوئی نہ کوئی رمق اپنے جلو میں ضرور رکھتے ہیں۔

جگن ناتھ آزاد کا ذہن مصورانہ فکر رکھنے والا ذہن ہے۔ وہ کسی شے کی بجائے اشیا کی جُھرمٹ خلق کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کو کسی ایک اسلوب کا شاعر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اقبال، جوش اور فیض کے اسلوبِ شعری سے انھوں نے خوب فائدے اٹھائے ہیں۔ بعض نظموں میں اگر انھوں نے اپنی آواز کو پایا بھی ہے اور انھیں ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کی کوشش بھی کی ہے تو بھی وہ زیادہ دور اور دیر تک اسے برقرار نہیں رکھ سکے ہیں۔ اس کے باوجود آزاد نے بعض بے حد عمدہ مختصر نظمیں کہی ہیں جن میں تخلیقی رچاؤ بھرپور ہے۔ آزاد طبعاً طویل نظم کے شاعر ہیں اس لیے توضیح، تعمیم اور طوالت میں

انھیں زیادہ تسکین حاصل ہوتی ہے۔ غور کریں تو ایسی نظموں میں ہمیں فنی ضبط اور ارتکاز کا گہرا شعور بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نظم کی بافت کو چست درست رکھنا، موضوع اور مقاصد کی مرکزیت کو قائم رکھنا، آسان نہیں ہوتا۔ آزاد کے دور کے بیشتر نظم گو شعرا کے یہاں زبان کو برتنے کی جو تکنیک رائج تھی اُس میں زبان کو گرفت میں رکھنے کے بجائے خود شاعر زبان کا محکوم ہو جاتا تھا۔ جہاں زبان کے بہاؤ پر قابو رکھنے کی ضرورت تھی وہاں نظم گو شعرا تمام تر حقوق زبان کو ودیعت کر دینے میں اپنی کامیابی سمجھتے تھے۔ آزاد کے شعری تجربوں میں بھی کم و بیش ویسی ہی طولِ کلامی موجود ہے۔ جو نظم کم سے کم الفاظ میں سمٹ سکتی تھی اسے وہ لفظ بہ لفظ اور مصرع بہ مصرع پھیلا دیتے ہیں۔ یہ طریقہ ان کی علیحدہ شناخت کی راہ میں رکاوٹ بنی۔ وہ اکثر نظم میں چند عمدہ مصرعے کہنے کے بعد بیان کی کشش پر توجہ مرکوز کر لیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ زبان و بیان کی کشش اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے تاہم بیان کا اختصار کسی بھی نظم کو پر اثر بنانے میں زیادہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ نظم میں مکرر دہرائے جانے والے موضوعات و مسائل گہری معنویت پیدا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ نظم کی خودرَوی بھی متاثر ہوتی ہے اور ایک نظم میں دوسری نظموں کی گونج بھی سنائی دینے لگتی ہے۔

جگن ناتھ آزاد کی شاعری پر ہم موٹے طور پر تین زاویوں سے گفتگو کر سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اردو کی شعری روایت کی توسیع میں ان کا کیا مقام و مرتبہ ہے؟ دوسرا یہ کہ اپنے فکری اور فنی رویوں میں اُن کی ترجیح 'انکار' کی کس روش پر ہے؟ یعنی یہ 'انکار' کی روش انحراف کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے یا بغاوت کی۔ تیسرا یہ کہ ان کے شعری متن کے ترکیبی عوامل اور تخلیقی سرچشموں کے سراغ کی گنجائش کس حد تک ہے؟ جگن ناتھ آزاد کے تعلق سے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ اردو کی ادبی روایت کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ شعری زبان کی باریکیوں اور لطافتوں کا بھی انھیں بخوبی علم تھا۔ طبعاً ان کا ذہن کلاسیکی تھا اور وہ اپنی فکر میں جس قدر چست تھے، زبان و لسان کے تخلیقی عمل میں بھی اسی قدر محتاط تھے۔ ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ تقسیم کے کرب کی نوعیت پر مشتمل ہے لیکن ان کی نظمیں اور بعض نظموں کے حصے تخلیقی احساس اور معنی خیز لسانی تجربے کے مظہر ہیں۔ جمنا کے کنارے، بادِ خزاں، دیارِ محبوب کو جاتے ہوئے، صدائے بازگشت، ترکِ تعلق کے بعد، پس پردہ، نئی محفل، طوفان کے بعد، ایک منظر، کنا رِوادی، امید موہوم، گم شدگی، وطن میں آخری رات، جیسی نظموں میں جگن ناتھ آزاد، اُس جگن ناتھ آزاد سے قطعاً مختلف نظر آتے ہیں جو اپنی کئی نظموں میں ایک واقعہ گو کا کردار ادا کرتے ہیں۔ فریبِ نظر، پناہ گزیں، کل رات کو، تیرے شہر میں مَیں نے دیکھا تھا، افکارِ پریشاں، تجدیدِ وفا، احساسِ ندامت، جنونِ وفا، یورپ کی پہلی جھلک، سوہو کی ایک رات، وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو محض ایک خاص تاریخی پس منظر رکھتی ہیں۔ تاہم ملک کی سیاسی بساط پر کھیلے گئے دل خراش کھیل کا اظہار اور تخلیقی لسانی تجربے کا عمل، ان نظموں میں نئے معنی کا سراغ ضرور دیتا ہے۔

آزاد کی بعض نظمیں ایسی ہیں جو بے حد Pathetic ہونے کے باوجود اپنی فضا، سچائی، جذبۂ اِخلاص کی معصومیت اور پاکیزگیِ خیال کی وجہ سے عمدہ تاثر فراہم کرتی ہیں۔ جیسے ان کی ایک نظم ہے: 'پناہ گزیں'، اِس نظم کی بافت، تفصیلات و جزئیات کے ساتھ بخوبی منسلک ہے۔ اس میں تقسیم ملک کے کرب کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ اس گونج میں آزاد کی آواز کو ہم بڑی آسانی سے پہچان سکتے ہیں۔ نظم کچھ یوں ہے۔

خموشیوں میں حادثوں کی داستاں لیے ہوئے
دلِ حزیں میں درد و غم کا اک جہاں لیے ہوئے
نگاہ میں حدیثِ جَورِ دوستاں لیے ہوئے
رواں ہے ایک قافلہ
مکاں کسی کا جل گیا کسی کا گھر اُجڑ گیا
کسی سے کوئی زندگی کا آسرا بچھڑ گیا
لٹی ہوئی بجھی ہوئی جوانیاں لیے ہوئے
رواں ہے ایک قافلہ
اگرچہ دور آچکے دھڑک رہے ہیں دل ابھی
قدم میں کپکپی سی ہے نظر ہے مضمحل ابھی
خموش لب پہ حشرِ نالہ و فغاں لیے ہوئے
رواں ہے ایک قافلہ
بجھی بجھی نگاہ میں امید بھی ہے یاس بھی
نظر میں حوصلے بھی ہیں محیط ہے حراس بھی
غرض عجیب رنگ کی کہانیاں لیے ہوئے
رواں ہے ایک قافلہ
بیانِ نطق میں زبانِ شعر میں نہ آسکے
جسے فقط نگاہِ غم نصیب ہی سنا سکے
تباہیوں کی وہ مہیب داستاں لیے ہوئے
رواں ہے ایک قافلہ

ہدیۂ نیاز، گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم، بھوپال، حوری ندانم یا پری، ماتمِ سالک، یہ خاک ہے محرمِ جدائی، محسن کی راکھ وغیرہ جیسی طویل نظم میں شاعر کا داخلی تجربہ بھی عود کر آیا ہے۔ ایسی نظموں میں ہم ایک ایسی نا راست زبان سے بھی دوچار ہوتے ہیں جس میں کہیں استعارے کی چمک اور پیکر کی دمک نے سارے تناظر کو متحرک بنا دیا ہے۔ جگن ناتھ آزاد کے یہاں اُس دور کے دیگر نظم گو شعرا مثلاً: وحید اختر، سلیمان اریب، راہی معصوم رضا، ندا فاضلی وغیرہ کی طرح اسلوبی تنوع پیدا کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ زبان کا استعمال اور بحور و آہنگ کے برتاؤ کے اعتبار سے بھی ہمیں ان کے یہاں تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثلاً: نظم 'اے دلِ بے قرار دیکھ' کا یہ بند۔

دامنِ لالہ زار میں عالمِ پُر بہار دیکھ
کلّۂ کوہسار پر جلوۂ زر نگار دیکھ
آبِ رواں کی بات کیا خاک پہ ہے نکھار دیکھ
اے دلِ بے قرار دیکھ

یا نظم 'اے کوہِ مسینا' کے یہ بند دیکھیں۔

در ماندہ مسافر کے لیے منزلِ تسکین
یا بحر کی موجوں میں ہے تو ایک سفینہ
اے کوہِ مسینا
سسلی کو یہ کہتے ہیں کہ اٹلی کی ہے خاتم
سسلی جو ہے خاتم تو ہے تُو اس کا نگینہ
اے کوہ مسینا

مذکورہ نظموں کی محض وقتی اہمیت ہے لیکن آزاد کے ذہنی سفر میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ نظمیں آزاد کے ایک خاص نقطۂ نظر کی غماز ہیں۔ انھیں زیادہ مؤثر اور پرکار بنانے کے لیے آزاد نے استعجابی لہجہ اختیار کیا ہے۔ آزاد نے جن کو اپنا تخاطب بنایا ہے۔ ان کی سائیکی کا خوب خیال رکھا ہے۔ کسی بھی شاعر کے انفراد کے تعین میں اس کا خاص انتخاب رہتا ہے۔ آزاد نے بھی زبان کی فہم کے ساتھ عوام کے ایک خاص طبقے سے خطاب کیا ہے۔ اسے ہم آزاد کے تخلیقی شعور کی بہترین نمائندگی کا نام دے سکتے ہیں۔ جگن ناتھ آزاد کی بیش تر نظمیں، جن میں چند کا نام اوپر لیا جا چکا ہے، ہمیں اپنے طریق لسان اور موضوع کو برتنے کے لحاظ سے بھی ایک مختلف قسم کے طرزِ احساس سے متعارف کراتی ہیں۔ ان کی نظموں میں خطابت کا انداز بھی ہے، شور آگیں آہنگ بھی ہے اور کہیں کہیں غیر متعلق طول کلامی بھی ہے لیکن ان سب کے باوجود نظموں میں جو تخلیقی رویہ ہے وہ نظم کہنے کے مقصد کو بھرپور طریقے سے متعین کرتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد نے اپنی نثری تحریروں میں 1857 سے لے کر 1947 تک کے درمیانی وقفے پر اپنے خیالات

آزاد نے جن کو اپنا تخاطب بنایا ہے۔ان کی سائیکی کا خوب خیال رکھا ہے۔ کسی بھی شاعر کے انفراد کے تعین میں اس کا خاص انتخاب رہتا ہے۔آزاد نے بھی زبان کی فہم کے ساتھ عوام کے ایک خاص طبقے سے خطاب کیا ہے۔ اسے ہم آزاد کے تخلیقی شعور کی بہترین نمائندگی کا نام دے سکتے ہیں۔

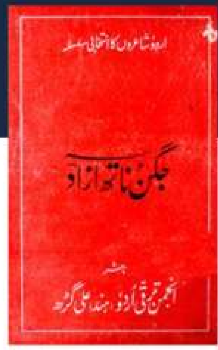

کا اظہار کیا ہے۔ظاہر ہے کہ اس دور کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات نے ہر ایک کو کرب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ تقسیمِ ملک کے بعد کے مسائل نے آزاد پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ان کے کلام میں وطن سے ہجرت کا کرب سب سے زیادہ ہے۔وہ بار بار ماضی کی طرف پلٹتے ہیں اور ناسٹلجیائی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ملک کی تہذیب اور قدروں کو پامال ہوتے ہوئے دیکھ کر وہ بے چین ہوتے ہیں۔ان کی شاعری میں ہندوستان کی مختلف صورتِ حال کو نظم کیا گیا ہے جن سے ان کی شاعری کے مقصد کا تعین ہوتا ہے۔ابتدا میں وہ بھی شاعری کو الہامی چیز ہی خیال کرتے تھے لیکن پھر 'آسمانی برکت' کہنے پر مجبور ہوئے۔انھوں نے لکھا ہے کہ ''ماحول کے اثر سے نہ میں آزاد ہوں نہ میری شاعری''۔سیاسی صورتِ حال اور عوامی مسائل، ان کی شعری ترجیحات میں کیوں کر اہمیت اختیار کرتے ہیں اور اس کے پیچھے کون سے اسباب کارفرما ہیں؟ بتانے کی ضرورت نہیں۔ان کے تجربے اور مشاہدے جس طرح ان کی نظموں میں پیوست ہیں وہ اصلاً ان کے باطن کی آواز ہی ہے۔ ان کی نظموں میں جس طرح پیکروں کا سلسلہ قائم ہوتا ہے اور وہ جس طرح احتساسی کیفیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں، وہ جلال کے وجود کو جمال کے نرم آگیں احساس میں بدل دیتے ہیں۔ان کی نظموں میں جہاں تخلیقی عمل کی طلسماتی کیفیت خود بخود الفاظ کا مناسب انتخاب کر لیتی ہے اور اسے استعاراتی و علامتی معنوں تک پہنچا دیتی ہے، وہاں تخلیقیت کے رنگ کو بھی گہرا کر دیتی ہے۔تخلیقی، طلسماتی، پُراسرار روحانی عمل اور سرّی تجربوں سے گزرنے کے بعد ہی اس قسم کی نظم وجود میں آسکتی ہے۔

اے کشورِ ہندوستاں/اے خطۂ جنّت نشاں/اے سجدہ گاہِ قدسیاں/اے منبعِ انوارِ حق/اے کعبۂ روحانیاں/اے قبلۂ عرفانیاں/اونچا رہے تیرا نشاں/وہ عرفیِ شیریں زباں/وہ فیضیِ جادو بیاں/وہ مشہدیِ نکتہ داں/سرمد، کلیم و آملی/سب شاعرانِ دُرفشاں/تیرے ہیں گنجِ شائگاں/اونچا رہے تیرا نشاں/اے کشورِ ہندوستاں

یا۔

ہر خشت میں آباد ہے افکار کی دنیا
ہر رنگ میں ہے جذبۂ بیدار کی دنیا
ہر نقش میں خوابیدہ ہے اسرار کی دنیا
تعمیر ہے تیری کہ ہے انوار کی دنیا
کیا تجھ سے کہوں کیا ہے تری اوجِ مقامی
تو عالمِ فانی میں ہے اک نقشِ دوامی
اے معبدِ ارباب یقیں! حاصلِ ادراک
اے منزلِ انوارِ گہن جلوہ گہہِ پاک
ہستیِ دوامی سے عبارت ہے تری خاک
کیا گردشِ ایّام ہے کیا گردشِ افلاک
دنیا ہے تری نورِ فزا روزِ ابد تک
ہے ساز ترا نغمہ سرا روزِ ابد تک

(نظم: 'دہلی کی جامع مسجد')

علی سردار جعفری کے بعد جگن ناتھ آزاد ہی ہیں جنھوں نے پیکروں کو اتنی خلاّقی اور گہری حسّیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔جگن ناتھ آزاد حسّی پیکر خلق کرنے کے ساتھ ساتھ داخلی ترنم پر بھی بہت زور دیتے ہیں۔اس لیے ان کی بیش تر نظموں میں ترنّم کا بہاؤ قاری کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔کنارِ راوی، ایک مشکل، بُرا نہ مان، نظر میں نہ خبر میں، ماتمِ سالک وغیرہ ایسی ہی نظمیں ہیں جن میں ترنّم کا بہاؤ، قرأت اور سماعت دونوں لحاظ سے، اپنا گرویدہ بنا لیتی ہیں۔'کنارِ راوی' کے چند اشعار ملاحظہ کریں جس میں ترنم کی داخلی رَو اور احتساسی پیکر کی عمل آوری سے نظم کس قدر مؤثر بن گئی ہے۔

یہ وقتِ شام یہ آبِ رواں یہ تنہائی
سکوتِ شام میں قدرت کی محفل آرائی
فضا میں تین طرف سے ہجومِ ظلمت کا
اور ایک سمت شفق کا وہ رنگِ زیبائی
بجھی وہ چشمِ زدن میں شفق کی شمعِ حیات
فلک پہ چار طرف گھر کے تیرگی چھائی
وہ بزمِ عالمِ بالا میں جلوۂ مہتاب
زمیں کا حسن بڑھانے کو چاند نی آئی
ہر ایک موج سے اندازِ دل کشی ظاہر
ہر اک حباب سے بے پردہ رازِ رعنائی
کہاں وہ محفلِ رنگیں کہاں وہ بزمِ نشاط
کہاں یہ عالمِ ہُو اور فضائے صحرائی
ٹھہر ٹھہر دلِ شاعر! یہ وہ نظارہ ہے
کہ جس کے چاند ستارے بھی ہیں تماشائی
تماشا گاہِ زمانہ کو دیکھنے والے!
یہ دیکھ خاک میں سوتا ہے نورِ سینائی

جگن ناتھ آزاد نے نقطۂ نظر کی فوقیت کو تسلیم کرنے کے باوجود اپنے عہد کے نظریات کی تبلیغ کو وسیلہ نہیں بنایا۔ انھوں نے فن کی جمالیات اور اس کی قدر کو اوّلیت دی۔ اس لیے جب ہم اُن کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو زندگی کی جبریت کے باوجود محبت اور ایثار و کرم کا جذبہ، حقیقت کے ارضی زاویے کے ساتھ منسلک نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں جو نیا احتساسی دائرہ مرتب کیا وہ نہ تو ہنگامی موضوعات پر اساس رکھتا ہے اور نہ ہی رومان پر بلکہ ان کے یہاں بیانیہ کی تعبیر جذباتی لطافت پر فکری خشت بندی سے عبارت ہے۔یہ اپنی نظموں کے ذریعے نہ تو احتجاج کی دعوت دیتے ہیں اور نہ ہی سماجی اقدار کے خلاف ردِعمل پر اُکساتے ہیں۔ان کی نظموں کی داخلی آنچ مدّھم مگر غم کی آنچ تیز ہے۔ان کے یہاں مبنی بر انصاف معاشرے کی تمنا کا اظہار ملتا ہے جو ان کی نظموں کو بامعنی بناتا ہے۔اخلاصِ تجربہ اور کمالِ زبان دانی نے مل کر ان کی شعری دنیا کی تعمیر کی ہے۔اس لیے ہر موضوع کے پیچھے احساس کی شدّت اور جذبے کا خلوص کارفرما نظر آتا ہے۔اسی طرزِ خاص کے ساتھ زندگی بھر انھوں نے شاعری کی، جس کی جھلکیاں اُن کی اکثر نظموں میں بکھری ہوئی ہیں۔ان کی شاعری کا یہ خاص انداز ہمیشہ تازہ دم رہے گا اور شعری ادب کی تاریخ میں وہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

■

Dr. Ahmad Imteyaz
Associate Professor,
Department of Urdu, Arts faculty
University of Delhi, North campus, Delhi-110007
Email: imteyaz.urdu@gmail.com
Mobile: 9899754685

اردو فکشن میں زمیندارانہ معاشرے کی عکاسی

سمی اقبال

زمیندارانہ معاشرے میں زمینیں بالا دستی کی علامت تھیں۔ دولت وثروت کا منبع اور اثر و رسوخ کا سرچشمہ تھیں۔ زمینداری کے خاتمے کے ساتھ ہی سماج میں زمینداروں کا اثر اور دبدبہ جاتا رہا کیوں کہ یہ معاشی بدحالی کے شکار ہونے لگے۔ کشادہ حویلیوں میں عیش وعشرت کی زندگی گزارنے والے اور عیش ونشاط کی محفلیں سجانے والے دانے دانے کے لیے محتاج ہو گئے تھے۔ مفلسی، ناداری، بے کاری اور تنہائی ان کا نصیب بن گئی تھی۔ باوجود اس کے یہ پرانے اقدار وروایات کی اب بھی پاسداری کر رہے تھے اور ان کے محافظ بنے ہوئے تھے۔ حالانکہ اس فعل پر وہ خود شرمندہ تھے اور ان کا ضمیر لعنت وملامت کر رہا تھا۔ سماج میں ایسے افراد کی بھی کوئی کمی نہیں تھی جو انھیں جبر وتشدد کی علامت سمجھ رہے تھے اور ان کی بے بسی، کنگالی اور دست نگری پر قہقہہ لگا رہے تھے۔ واقعی نئی تبدیلیوں کے سبب ان کی زندگی قابل رحم ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ ان کی زندگی کی تمام رنگینیاں پھیکی پڑ گئیں۔ ان کی وضع داریوں نے چہار دیواری کے اندر کی خستہ حالی کو باہر نہیں آنے دیا۔ لیکن عسرت میں ان کی وضع داریوں کا نباہ بھی کب تک ہو سکتا تھا! بہر حال ان کی مفلسی اب پوشیدہ نہیں رہی۔ معاشی دیوالیہ پن نے انھیں دست نگر ہونے پر بھی مجبور کیا۔ اب سماج میں ان کی حیثیت ایک مقروض کی تھی۔ کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا اور یہ محنت ومشقت کے عادی تھے نہیں! جمع پونجی کا ساتھ کب تک چلتا! نتیجتاً گھر کی قیمتی اشیا فروخت ہونے لگیں۔ جن حویلیوں کے دروازے پر لنگر بانٹے جاتے تھے انھیں حویلیوں کے مکینوں کو لنگر کی صف میں کھڑا ہونا پڑا۔ لذیذ اور ذائقے دار کھانے نوش فرمانے والے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے در در کی ٹھوکریں کھا رہے تھے اور نان بائیوں کی گلی میں جا کر لذیذ کھانوں کی خوشبو سے تسکین حاصل کر رہے تھے۔ مہمان نوازی کو اپنے وقار سے وابستہ کرنے والے دوسروں کی چوکھٹ پر اس آسرے میں بیٹھے رہتے کہ اس گھر کے مکین جب خود کھا چکیں گے تو انھیں بھی کھانے کے لیے پوچھیں گے۔ زمینداری کے خاتمے نے زمیندار خاندانوں کے آپسی رشتوں میں بھی دراڑیں ڈال دیں۔ ان کے باہمی تعلقات میں وہ پچھلے زمانے کی گرمی باقی نہ رہی۔ ان کے رشتے میں رسہ کشی اور تناؤ کے عناصر پیدا ہو گئے۔ رشتوں کا زوال بھی انھیں اندر سے کمزور کرتا گیا۔ دوست دشمن بن گئے۔ جائیداد کے بٹوارے کی نوبت آئی۔ جائیداد جو غریبی اور عسرت میں زندگی کا سب سے بڑا سہارا ہوتی ہے وہ بھی جاتی رہی۔ غرض کہ چاروں طرف سے مصیبتوں نے انھیں آگھیرا۔ ان سے نجات پانے کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ ہر حال میں انھیں مصیبتوں کا سامنا تھا۔ جب زمیندار گھرانے کے خاندانوں کا یہ حال تھا تو سیکڑوں کی تعداد میں ان خاندانوں سے منسلک وہ تمام شاگرد پیشہ افراد کا کیا حشر ہوا ہوگا جن کی روزی روٹی ان حویلیوں سے وابستہ تھی! وہ تمام پیشہ ور جو زمینداروں کی حویلیوں سے منسلک تھے اور اپنی قسمت کی روٹی کھا رہے تھے وہ بھی اچانک سے بے روزگار اور بے گھر ہو گئے۔ جو لوگ پشتوں سے ملازمت کرتے آئے تھے بہت بڑی تعداد میں بے روزگاری کی مصیبت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ کسانوں اور دستکاروں کے ساتھ ان پیشہ وروں کی زندگی بھی تباہ و برباد ہو گئی۔ ہندوستان میں زمینداری کے خاتمے کا اثر صرف زمیندار طبقے تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ متوسط اور نچلے طبقے کے لوگ بھی شدید طور پر متاثر ہوئے تھے کیوں کہ ان کی روزی روٹی زمینداری کی بدولت ہی چل رہی تھی۔ تقریباً ایک دہائی تک غریبی اور تنگ دستی کی مار جھیلنے کے بعد اعلیٰ طبقے نے بھی روزگار کی تلاش شروع کر دی اور اسی سلسلے میں بڑے بڑے شہروں کی جانب روانہ ہوئے۔ کچھ خاندانوں نے غیر ملکوں کی سرحد میں قدم رکھا۔ اب یہ اپنی معیشت کو از سر نو مستحکم بنانے کے لیے بلا جھجک محنت و مشقت کرنے لگے۔ ان کی اولادوں نے خود کو زندگی کی رفتار میں شامل کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دی اور اس جدوجہد میں انھیں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔

اردو ناول نگاری کے زمانہ آغاز سے لے کر بیسویں صدی تک لکھے گئے اکثر ناولوں میں جاگیردار و زمیندار طبقے کی زندگی موضوع بحث رہی ہے۔ بیشتر ناولوں میں اس طبقے کے خصائص، ان کے عادات واطوار، ان کا روزمرہ، ان کی وضع داری، ان کی انصاف پسندی، ان کی غریب پروری، ان کی بے عملی، ان کے مظالم، ان کی آسائش و زیبائش اور ان کی مذہبی رواداری کی سچی عکاسی ملتی ہے۔ زمینداری کا خاتمہ ایک ایسا سانحہ تھا جس نے اردو ادیبوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ دراصل اردو کے ایسے قلم

کاروں کی کثیر تعداد تھی جو بذات خود زمیندار گھرانے کے پروردہ تھے۔ انھیں اپنے آبا و اجداد کی وراثت کے لٹنے کا غم بھی تھا اور آنے والی نئی تبدیلیوں کا احساس بھی۔ اس لیے ان کی تحریروں میں اس نظام کے زوال کی نوحہ گری بھی ملتی ہے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا ہادی رسوا، پریم چند، عصمت چغتائی، عزیز احمد، قرۃالعین حیدر، کرشن چندر، قاضی عبدالستار، خدیجہ مستور، عبداللہ حسین، جیلانی بانو اور عبدالصمد وغیرہ ایسے ہی ناول نگار ہیں جنھوں نے نظام زمینداری سے پیدا ہونے والی صورت حال کا مختلف پہلوؤں سے احاطہ کیا ہے۔ کچھ نے زمینداری کے تاریک اور استحصالی پہلوؤں کو پیش کیا ہے اور کچھ نے صرف زمینداری کے سائے میں پلنے والے اقدار کے خاتمے کو موضوع بنایا ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ زمینداروں کا نام آتے ہی ہماری نظروں کے سامنے ظلم و استحصال اور جبر و استبداد کی بہت ہی صاف ستھری تصویر بنتی ہے لیکن یہ تصویر زمینداروں کی زندگی کا محض ایک رخ ہی پیش کرتی ہے۔ ان کی زندگی کا دوسرا رخ بھی ہے جو انسانی قدروں کا طرف دار، مثبت اقدار و روایات کا پاسدار اور مشترکہ تہذیب اور مذہبی رواداری کا علمبردار ہے۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں جو ناول لکھے گئے ان میں اس جاگیردارانہ معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے جو زوال پذیر تھی۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ معاشرے کے افراد کو خود ان کی اور ان کے معاشرے کی پستی کا علم نہ تھا یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ علم ہوتے ہوئے بھی یہ حقیقت سے نظریں چرا رہے تھے۔ انیسویں صدی میں رتن ناتھ سرشار اور مرزا ہادی رسوا دونوں ایسے ناول نگار تھے جنھوں نے اپنے ناولوں میں اس معاشرے کے جیتے جاگتے نقوش پیش کیے ہیں۔ ان کے ناولوں میں جاگیرداروں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں مثلاً مذہبی عقائد، شادی بیاہ کی تقریبات و رسومات، تفریحی مشاغل، معاشی مسائل اور طبقاتی امتیازات کے علاوہ نظریاتی اختلافات، سماجی برائیاں اور خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ یہ دونوں فنکار اسی معاشرے کے افراد تھے جو معاشرتی مسائل کو لوگوں کی نفسیات پر اثر انداز ہوتے دیکھ رہے تھے۔ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد لکھنؤ کی رنگینیوں کا دور ختم ہو چکا تھا لیکن لکھنؤ کی فضا میں ان رنگینیوں کا خمار باقی تھا۔ لکھنؤ کی گلیوں میں شادیانے اب بھی بجتے تھے۔ محفلیں اب بھی بجتی تھیں۔ ہر روز کی طرح شامیں اب بھی گلزار تھیں لیکن فطری طور پر ان محفلوں کا رنگ مدھم پڑ چکا تھا۔ لوگ ماضی کی یادوں میں کھوئے رہتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ از سرِ نو اختر پیا کی حکمرانی لوٹ آئے گی۔ پھر سے دربار لگے گا اور صاحب فن کو منھ مانگا انعام ملے گا۔ لیکن یہ سب خام خیالی تھی، حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ اسی امید کے ساتھ دن گزر رہے تھے۔ حقیقی زندگی بہت آگے نکل چکی تھی جبکہ ان لوگوں کی زندگی ابھی مجلسوں تک ہی محدود تھی۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں کسانوں اور زمینداروں کی زندگی کو موضوع بنانے والوں میں پریم چند کا نام سرفہرست ہے۔ پریم چند کے ناول 'گوشۂ عافیت' اور 'گئو دان' کے بغور مطالعہ سے پریم چند کا نظریہ بہت واضح ہو جاتا ہے۔ پریم چند خود بھی اسی معاشرے کے باشندہ تھے۔ زمیندارانہ اقدار و روایات، زمینداروں کی وضع داریاں اور مہمان نوازیاں انھیں عزیز تھیں۔ اس لیے برطانوی عہد میں ٹوٹتے ہوئے ان قدروں کا انھیں ملال تھا۔ دراصل اس طبقے کی زندگی میں جو اچھائیاں تھیں پریم چند بھی ان اچھائیوں کے مرید تھے۔ وہ مشترکہ خاندان کے قائل تھے اور اس سے بھی زیادہ بڑوں کی عزت کے قائل تھے، لیکن جاگیرداروں اور زمینداروں کے سپوتوں کے ہاتھوں ہی یہ قدریں تیزی سے بدل رہی تھیں جو پرانے زمینداروں کی طرح پریم چند کے لیے بھی تکلیف کا باعث تھی۔ پریم چند کو ان سے ہمدردی تھی اور معاشرے میں ان کی گرتی ہوئی ساکھ سے یہ بیزار تھے۔ پریم چند پرانے زمینداروں اور کسانوں کے رشتوں میں باوجود استحصال کے ایک اپنائیت بھی پاتے ہیں۔ یہاں استحصال تو ہے مگر استحصال کا پرتشدد اور جابر روپ نہیں ہے۔ اس لیے محنت کش انسانوں کی مظلومی کی تصویریں تو ان کے ناولوں میں ملتی ہیں مگر ظلم کے خلاف نفرت اور بغاوت کا وہ جذبہ نہیں ملتا ہے جس میں اس نظام کو جلا کر راکھ میں تبدیل کر دینے کی قوت بھی ہو۔ یہ پریم چند کی ہمدردانہ کوشش کا ہی نتیجہ ہے کہ ناول کے اخیر میں زمیندار طبقے کے کردار اپنی حرکتوں پر نادم ہوتے ہیں اور اپنی غلطیوں پر پچھتاتے ہیں۔ قاری بھی اس طرح کرداروں کی بدلتی ہوئی سوچ کے سامنے ان کی غلط روشوں کو فراموش کر دیتا ہے۔ پریم چند قاری کی ہمدردی بھی ساتھ لے کر چلنا چاہتے ہیں اور اسی لیے ایسا اسلوب اختیار کرتے ہیں جو اس طبقے کو محض ظالم نہیں بناتا بلکہ وہ بھی ہمیں حالات کا شکار نظر آتا ہے۔ پریم چند نے پربھاشنکر کی جس نیکی، شرافت، معصومیت، سادگی، وضع داری، سادہ لوحی اور داد خواہی کا ذکر کیا ہے وہ بیسویں صدی میں معدوم ہو چکی تھی۔ اس لیے زمینداروں کی یہ تمام خوبیاں ہمیں انیسویں صدی کی معلوم ہوتی ہیں۔ وہ خاندان کے وقار کے تحفظ کے لیے اپنی ساری دولت قربان کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ وہ وضع داری اور خاندانی آن بان کی بیڑیوں سے بندھے ہوئے تھے اس لیے بیٹے کی گرفتاری پر بھی عدالت جانا انھیں گوارا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے اسامیوں سے ہمدردی رکھتے تھے اور ان پر بے جا ظلم و زیادتی پسند نہیں کرتے کیوں کہ یہ ان کی روایتی وضع داری اور اخلاقی رویے کے منافی تھا۔ ہم اس ہمدردی کو ان کی اصول پسندی، حق پروری اور انسانی اقدار کا پاس و لحاظ نہیں کہہ سکتے۔ ایک طرف تو پریم چند 'گوشۂ عافیت' کے ایک کردار پریم شنکر سے یہ کہلواتے ہیں کہ 'بڑے بڑے زمیندار اور تعلقہ دار سب کے سب ڈاکو ہیں' مگر انھیں قصوروار نہیں مانتے بلکہ اس نظام کو مانتے ہیں، جس نظام کے زیر سایہ یہ طبقہ عیش پرست بن چکا تھا۔

گئو دان کو پریم چند کا فنی معجزہ کہا جاتا ہے۔ اس ناول میں ایک طرف تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسانوں کے استحصال پر ہی جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام قائم ہے لیکن دوسری طرف فنکار کے دل میں زمیندارانہ نظام کے تئیں ہمدردانہ رویے کو بھی ہم محسوس کرتے ہیں۔ یہی ہمدردانہ جذبہ ہے جو انھیں قطعی طور پر اس طبقے کی مخالفت سے انھیں باز رکھتا ہے۔ دراصل اس نظام کی جو چند اچھائیاں ہیں وہ انھیں باغیانہ رویہ اختیار کرنے سے روکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک جگہ تو وہ رائے صاحب پر طنز کرتے ہیں لیکن دوسری جگہ ان کے ہر فعل کو مجبوری کا نام دے کر اسے حق بجانب ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ باتوں سے تو وہ کسانوں کے بڑے ہمدرد بنے ہوئے تھے مگر ان کا عمل ظالمانہ اور سفاکانہ ہی رہتا ہے۔ وہ اپنے مظالم کا ذمہ بہت خوش اسلوبی سے مختاروں اور کارندوں کے سر ڈال دیتے ہیں۔ رائے صاحب کے یہ دوہرے معیار صرف ان کی ذاتی تصویر پیش نہیں کرتے بلکہ یہ اس پورے طبقے کی بھی تصویر پیش کرتے ہیں۔ مگر پریم چند ان تمام الزامات سے بری کرنے کی ایک شعوری کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جب بھی وہ اس طبقے کے ظلم پرور افراد کو پیش کرتے ہیں تو ساتھ میں اسی طبقے کے کچھ ایسے افراد کو بھی ابھارتے ہیں جن کی نیکیاں ان کی برائیوں کو بھلا دیتی ہیں۔ پریم چند 'گئو دان' میں رائے اگر پال کے ہر فعل کو درست ثابت کرتے ہیں۔ اس طبقے کے بعض افراد میں رحم دلی، سخاوت، بہادری، خودداری، شرافت نفس وغیرہ دیکھنے کے بعد وہ ان کے مظالم کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس طبقے کے خلاف پریم چند کوئی باغیانہ جذبہ نہیں رکھتے بلکہ ہمدردانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ کسانوں کے استحصال کے پیچھے انھیں ان کی مجبوریاں نظر آتی ہیں۔

ہوری بھی ہر جگہ رائے صاحب کے اعمال کو حق بجانب قرار دیتا نظر آتا ہے۔ شاید پریم چند کی جاگیردارانہ نظام سے ہمدردی اسے اصلی رنگ میں دیکھنا یا دکھانا پسند نہیں کرتی تھی۔ جاگیرداروں کے متعلق پریم چند کا ذہنی رویہ یہی ہے جو ہم 'گئو دان' میں دیکھتے ہیں۔ پریم چند ایک طرف کسانوں کے ہمدرد نظر آتے ہیں تو دوسری طرف زمینداروں کے بہی خواہ ہیں۔ جب وہ کسانوں کی نظر سے جاگیرداروں کو دیکھتے ہیں تو زمیندار انھیں ظالم نظر آتا ہے۔ لیکن جب وہ جاگیرداروں کی نظر سے دیکھتے ہیں تو اس مظالم کے پس پردہ انھیں جاگیرداروں کی مجبوریاں نظر آتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر اکثر و بیشتر ان زمینداروں کی زندگی پیش کرتی ہیں جن کی معیشت کا انحصار دیہاتوں میں ان کی زمینداریوں سے حاصل ہونے والی لگان پر تھا مگر شہروں کی وسیع اور کشادہ حویلیوں میں بڑی بڑی پارٹیاں منعقد کرتے تھے۔ مصنفہ نے جاگیردارانہ طبقے کی تہذیبی اقدار و روایات، مذہبی رواداری اور اخلاقی پستی کی پیشکش تک ہی خود کو محدود رکھا ہے۔ ناول 'میرے بھی صنم خانے' میں تقسیم ہند کے سانحہ تک پہنچتے پہنچتے قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں جذباتیت کا رنگ کافی گہرا ہو جاتا ہے۔ مشترکہ تہذیب، مذہبی رواداری اور قومی آزادی کے سنہرے خواب چکنا چور ہو چکے تھے۔ مصنفہ جاگیردارانہ طبقے کے جدید تعلیم سے آراستہ روشن خیال نوجوانوں کو مشترکہ ہندوستانی تہذیب اور مثبت اقدار و روایات کا علمبردار خیال کرتی ہیں اور تقسیم ہند کو 'بلائے ناگہانی' کے طور پر پیش کرتے ہوئے تاریخی حقیقت کو نظرانداز کر دیتی ہیں۔ مصنفہ نے جذباتی لگاؤ، ذاتی ہمدردی اور ایک مخصوص طبقے میں ہردلعزیزی کی بنا پر جاگیردارانہ طبقے کو کہیں سے بھی تقسیم کے لیے ذمے دار نہیں ٹھہرایا ہے۔ تقسیم اور ہجرت کے بعد زمینداری کے خاتمے نے ہندوستانی معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ جاگیردارانہ اقدار و روایات ٹوٹنے بکھرنے لگیں جس کا مصنفہ کو ملال ہے۔ حالانکہ اس طبقے کی زندگی خود کھوکھلی اور مصنوعی ہو چکی تھی مگر یہ اپنے 'خاندانی' ہونے پر نازاں تھے اور اپنی تہذیبی وراثت پر بہت حد تک مغرور بھی تھے۔ باوجود مختلف خامیوں کے خود کو برتر سمجھنے کے مغالطے میں مبتلا تھے۔ ان تمام نقائص کے باوجود بھی یہ مصنفہ کی اپنی دنیا کے لوگ تھے جو روایات، وضع داری اور کلچر کے پابند تھے اور اسی لیے یہ لوگ انھیں عزیز تھے۔

قرۃ العین حیدر نے 'آگ کا دریا' میں ہندوستان کی ڈھائی ہزار سال کی تہذیب کا خاکہ پیش کیا ہے۔ ناول ویدک عہد سے شروع ہو کر مغلیہ خاندان کے دور حکومت، مغلیہ سلطنت، انگریزی مداخلت اور پھر ملک کی تقسیم اور اس کے بعد ہندوستان پاکستان میں پیدا شدہ مسائل کو اجاگر کرتا ہوا ختم ہوتا ہے۔ انگریزی حکومت میں تحریک آزادی کے دور اور تقسیم کے بعد کے چند سالوں میں زمیندارانہ طبقہ اپنے مخصوص کلچر اور اقدار و روایات کے ساتھ اپنے معاشرے کا احساس دلاتا ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے نئے لکھنؤ کو ہی اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ لیکن اس نئے لکھنؤ میں بھی پرانا شہر ہر جگہ موجود نظر آتا ہے۔ انھیں اس شہر کے وضع دار لوگوں سے بڑی عقیدت اور محبت تھی۔ اسی عقیدت نے ان کی عینک کو دھندلا کر دیا تھا۔ مصنفہ صرف ان کا ہنر دکھاتی ہیں اور ان کے عیب پوشیدہ رکھتی ہیں۔ حالانکہ کہیں کہیں ان کی خامیاں بھی اجاگر ہوتی ہیں مگر مصنفہ ارادتاً ایسا نہیں کرتیں۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں طبقہ اشرافیہ کی عورتوں کی جو تصویریں ملتی ہیں ان کی دنیا غفران منزل، گلفشاں، سنگھاڑے والی کوٹھی سے لے کر کلبوں اور یونیورسٹیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ لڑکیاں بیک وقت فلسفہ، سائنس، تاریخ، جغرافیہ، آرٹ، کلچر، تہذیب اور سیاست سارے علوم پر دسترس رکھتی ہیں اور ایک رومانی دنیا میں زندگی بسر کرتی ہیں۔ دراصل ان کی خوب صورت اور قابل رشک زندگیوں کو پیش کرنے میں وہ ہندوستان کے نوے فیصد عوام کی کراہتی ہوئی زندگیوں کو نظرانداز کر دیتی ہیں۔ وہ اسی جاگیردارانہ معاشرے میں پس ماندہ طبقے کی عورتوں کے استحصال، ان کی مظلومیت اور بے بسی کی جانب توجہ نہیں دیتیں۔ قرۃ العین حیدر کو مخصوص طبقے کی نوحہ گر بھی کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس الزام سے بری ہونے کے لیے انھوں نے 'چاندنی بیگم' کی تخلیق کی۔ اس ناول میں ناول نگار نے اعلیٰ طبقے کے علاوہ معاشرے کے نچلے اور کمزور طبقے کو بھی شامل کیا ہے۔ اس ناول میں فرقہ پرستی کو فروغ دینے والی سیاست بھی ہے اور جاگیردارانہ نظام میں پسماندہ و نادار طبقوں کا معاشی استحصال بھی۔ بعد میں حقارت آمیز لہجے میں پکارے جانے والے پست طبقے کو اعتماد حاصل کرتے اور معاشی ترقی و خوشحالی کی راہ پر گامزن ہوتے دکھایا گیا ہے، لیکن یہ محنتی طبقے مصنفہ کی پسند نہیں ہیں اس لیے متوسط طبقے کی طرح انھیں بھی ان کے کلاس بیک گراؤنڈ سے الگ کر کے پیش نہیں کیا گیا ہے۔ جاگیردار طبقہ انگریزوں کی رہائش اور طرز زندگی کو اپنا کر فخر محسوس کرتا تھا، لیکن جاگیرداری کے خاتمے کے بعد جب معاشی بد حالی کا دور شروع ہوا تو ان کے طرز زندگی میں بھی گراوٹ آنے لگی اور یہ عام لوگوں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ معاشی بد حالی نے مزدوری کرنے پر مجبور کیا۔ اودھ کے جاگیردارانہ معاشرے کے زوال کی عکاسی اور قدیم گنگا جمنی تہذیب کی موت قرۃ العین حیدر کے بنیادی موضوعات ہیں، جن کی گرفت سے ان کا فن مکمل طور پر آزاد نہیں ہو پاتا۔

قاضی عبدالستار نے زمیندارانہ معاشرے کو پیش کرتے ہوئے ایک سے زائد ناول اور مختلف افسانے لکھے ہیں۔ قاضی عبدالستار خود جاگیردار گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور اسی گھرانے میں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی تھی۔ اس لیے اس طبقے کے شب و روز کو قریب سے سمجھنے کا نہ صرف موقع حاصل ہوا تھا بلکہ انھیں اس کا ذاتی تجربہ بھی تھا۔ اس لیے ان کے ناول تصوراتی کم اور تجرباتی زیادہ ہیں۔ زمینداروں کی مٹتی ہوئی تہذیب، ایک نئے نظام کی نمود، بدلتے ہوئے حالات سے پیدا شدہ بے اطمینانی اور ماضی کی بازیافت نے ان کی ذہنی، فکری اور تخلیقی میلان کو توانائی عطا کی ہے۔ اودھ کے جاگیردار گھرانوں کا معاشی زوال ان کا محبوب موضوع ہے۔ قاضی صاحب نے بیشتر ناولوں میں خصوصاً آزادی سے قبل اور آزادی کے کچھ بعد کے زمیندار اور تعلقہ دار طبقے کے ٹوٹتے بکھرتے اقدار، تہذیبی میراث اور وضع داریوں کے پس منظر میں ان کی المناکی اور کرب کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ 'شب گزیدہ' بھی اسی زمرے کی ایک کڑی ہے۔ جس میں آزادی سے قبل کے زمینداروں کے مابین آپسی رسہ کشی، دو نظریوں اور دو اقدار کے بیچ جنگ اور جاگیرداروں کی شکست خوردگی و بے بسی کو دکھایا گیا ہے۔ ناول 'شب گزیدہ' اودھ کے تعلقہ دار کنبے اور ان کے جاگیردارانہ اقدار و طرز معاشرت کے گرد گھومتا ہے اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ ناول کسانوں اور زمینداروں کی زندگی کا جیتا جاگتا مرقع ہے۔ کسان صدیوں سے اپنی محنت و مشقت سے زمینداروں کا پیٹ بھرتا اور ان کی عیش و عشرت کا سامان مہیا کرتا آ رہا ہے جبکہ وہ خود دانے دانے کا محتاج ہے۔ قاضی عبدالستار جاگیردارانہ نظام سے جذباتی لگاؤ رکھنے کے باوجود اس کی خامیوں پر پردہ نہیں ڈالتے بلکہ انھیں اجاگر کرتے ہیں۔ اس معاشرے میں مزدوروں اور کسانوں پر ظلم کیے جاتے تھے، انھیں ستایا جاتا تھا اور ان کا جنسی، ذہنی اور معاشی استحصال کیا جاتا تھا، مصنف نے ان تمام نکات کو ایمانداری سے اجاگر کیا ہے۔ دیہات اور قصبات کے شب و روز پر فنکار کی گرفت

بہت مضبوط ہے۔ تاریخی شعور اور بدلی ہوئی سچوئشن سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں زمیندار محض ظالم نہیں اور کسان محض مظلوم نہیں۔ بلکہ لٹتے ہوئے زمیندار جو آن بان کو قائم رکھنے کے جتن کرتے ہیں، خاموش فریادی کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف کسانوں کا ابھرتا ہوا طبقہ دولت اور طاقت کو حاصل کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس طبقاتی شعور اور اقدار کی کشمکش کو قاضی صاحب نے بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی روایتی تصویر انھیں ظالم و جابر بنا کر پیش کرتی ہے لیکن ان کا ایک نقش اور ابھرتا ہے جو ان کی نیک نیتی، رحم دلی اور انصاف پسندی کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ ناول میں بڑے سرکار کا کردار جاگیر داروں کی روایتی تصویر پیش کرتا ہے۔ وہ شان و شوکت اور وضع داری کے نام پر اپنے فرسودہ تصورات اور ذہنی سخت گیری کو تقویت پہنچاتے ہیں جو اس طبقے کے خاتمے کی بڑی وجہ تھی۔ جبکہ جمی کے کردار سے ایک روشن خیال اور جدت پسند جاگیردار کی شبیہ اجاگر ہوتی ہے۔ سرشار، رسوا، پریم چند اور قرۃ العین حیدر کی طرح قاضی صاحب نے بھی اودھ کی زندگی کو موضوع بنایا ہے لیکن فیوڈل تہذیب کے جس المناک پہلو کو انھوں نے 'شب گزیدہ' میں پیش کیا ہے، وہ زمیندار معاشرے کی بہت ہی سنگین اور مکروہ صداقت ہے۔

زمیندارانہ نظام کو عام طور سے کسانوں، مزدوروں اور غریبوں کا استحصال کرنے والا نظام سمجھا جاتا ہے اور ہمارے افسانوی ادب میں زیادہ تر اسی پہلو کو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی ہے جس کا اظہار قاضی عبدالستار کے ناولوں میں خاص طور سے 'شب گزیدہ' میں ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے سیاسی و سماجی تبدیلیوں کے عہد میں جاگیرداروں کی شکست خوردہ ذہنیت کی مکمل عکاسی کی ہے۔ مروجہ نظام سے کہیں مصنف کی ہمدردی کا احساس ہوتا ہے تو کہیں نفرت کا۔ قاضی صاحب کی یہ فکری کشمکش، ان کی حقیقت نگاری کا ترجمان ہے۔ قاضی صاحب کی ہمدردی زمینداروں سے ہے، اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کا تعلق زمیندار گھرانے سے تھا بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ انھوں نے جاگیرداروں کے زوال کو دیکھا اور محسوس کیا تھا۔ پریم چند کے دیہات سے قاضی صاحب کے دیہات تک آتے آتے بنیادی سطح پر کئی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ پریم چند کے زمانے میں زمیندار دیہی معاشرے کا حکمران تھا اور قاضی صاحب کے دیہات کا زمیندار حاشیے پر آ چکا تھا۔ انھوں نے زمینداروں کو دوسروں کا دست نگر ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ حالات اتنے بدل چکے تھے کہ کسان، زمینداروں کو کھانا کھلا رہا تھا، کپڑا پہنا رہا تھا۔ معاشرہ اس قدر تبدیل ہو چکا تھا کہ زمیندار جن پر ظلم وستم کرتے تھے، بہت حد تک بنیادی ضروریات کی تکمیل کے لیے یہ ان کے احسان مند تھے۔

اردو فکشن نگاروں کے متعلق یہ بات سچ ہے کہ ان کی پرورش و پرداخت جاگیردارانہ معاشرے میں جاگیردارانہ اقدار و روایات کے زیر اثر ہوئی تھی اور ان میں سے بعض فنکار تو بڑے بڑے جاگیردار خاندانوں کے ہی چشم و چراغ تھے اور بعض فنکار کسی نہ کسی صورت میں ان سے وابستہ تھے۔ بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر ان کی وابستگی نے ہی انھیں زوال پذیر زمیندارانہ معاشرے کی زندگی کے تاریک اور روشن ہر پہلو کے تجربے و مشاہدے کا موقع فراہم کیا۔ اسی مشاہدے اور تجربے کی بنا پر اردو کے تمام ناول نگاروں نے اعتراف کیا ہے کہ جاگیردار طبقہ ہی دیہاتی معاشرے کا مرکز و محور تھا اور یہاں جاگیردار طبقے کا ہی حکم چلتا تھا۔ اس لیے اس مرکز سے وہ تمام زندگیاں جڑ جاتی ہیں جو اس کے اطراف میں سانسیں لے رہی تھیں۔ اس طرح یہ کہنا نا مناسب نہ ہوگا کہ یہ طبقہ محض ایک طبقے تک محدود نہیں تھا بلکہ ایک وسیع فکر کے دائرے میں یہ ایک مکمل معاشرہ تھا جس کا مرکزی نقطہ ایک جاگیردار ہوتا تھا۔ اس لیے فنکاروں نے جب قلم اٹھایا تو انھیں مرکز میں رکھ کر اس پورے زوال پذیر معاشرے کی عکاسی کی جس کے رگ رگ سے وہ واقف تھے۔ انیسویں صدی میں یہ کام سرشار اور رسوا جیسے ناول نگاروں نے بہت ہی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دو تین دہائیوں میں بھی پریم چند جیسے بڑے فنکار نے سب سے پہلے جاگیرداروں اور کسانوں کے باہمی رشتے کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ بعد کی دہائیوں میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور عزیز احمد جیسے فنکاروں نے بھی اس زوال پذیر طبقے کی زندگی پر اپنے مخصوص نظریے سے خامہ فرسائی کی۔ ان فنکاروں نے جو ناول لکھے ہیں وہ معاشرتی نوعیت کے ہیں۔ تقسیم کے بعد معاشرتی نوعیت کے ناول بہ نسبت زیادہ تعداد میں لکھے گئے۔ تقسیم اور ہجرت کے سانحے سے اردو معاشرے کو بحرانی دور سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ مصیبتوں کے بادل چھٹنے کے بعد مصنفین نے جب قلم اٹھایا تو زمینداری کے زوال اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشی و ثقافتی تبدیلیوں کو قلم بند کیا۔ اس ضمن میں تخلیق کاروں نے اس معاشرے کے مسائل اور معاشرے کے سربراہ طبقے کی الجھنوں اور پریشانیوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ ان کے ناولوں میں قدیم اقدار اور جدید تقاضوں کے مابین عدم ہم آہنگی، مشترکہ تہذیب اور زمیندارانہ نظام کے خاتمے پر اضطراب اور مایوسی کی کیفیت کا اظہار ملتا ہے وہیں دوسری طرف اس نظام کے

تاریک اور استحصالی پہلو کی بھی عکاسی ہوئی ہے۔ زمیندارانہ معاشرے کے خصائص اور نقائص دونوں پہلوؤں کی پیشکش میں اردو کے ناول نگار زندگی اور سماج کی مختلف حقیقتوں کو پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسے ہی فنکاروں میں قاضی عبدالستار کے ساتھ عبدالصمد اور جیلانی بانو و خدیجہ مستور کا نام بھی لیا جانا چاہیے جنھوں نے اس طبقے کی زندگی کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا اور ان کے جبر وظلم کے ساتھ ان کی مجبوریوں اور مظلومیوں کو بھی غیر جانب دار ہو کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے نظام جاگیرداری کے زیر سایہ پلنے والی منفی قدروں کو بھی بڑی حقیقت پسندانہ انداز سے ظاہر کیا ہے۔ قاضی عبدالستار نے ترقی پسند تحریک کی دی ہوئی اس طبقاتی شناخت پر بھی ضرب لگائی ہے جس میں زمیندار ہمیشہ ظالم و جابر تھا اور کسان ہمیشہ سے مظلوم و محروم۔ قرۃ العین حیدر نے زمینداری کے خاتمے کے بعد زمیندار طبقے کے ساتھ وقوع پذیر ہونے والے سانحے کو بڑے ہمدردانہ اور عقیدت مندانہ جذبے سے پیش کیا ہے۔ تقسیم کے بعد بڑی تعداد میں لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک میں ہجرت کر گئے، نتیجتاً وہ اقدار، وہ تہذیب اور وہ پوری دنیا جو ایک خاص مقام سے تعلق رکھتی تھیں اچانک ختم ہو گئیں اور ان کی جگہ ایک ملی جلی دنیا نے لینی شروع کر دی۔ یوپی میں لکھنؤ ایک ایسی جگہ تھی جہاں سب سے زیادہ مہاجر پہنچے۔ لکھنؤ اس وقت تک اپنی مخصوص تہذیب، مخصوص اقدار اور روایتوں سے مسلسل وابستہ تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جو اہل زبان کی بستی کہلاتی تھی۔ اسی شہر نے پرانی روایتوں اور پرانی قدروں کو برقرار رکھا تھا۔ مہاجرین کی آمد کے ساتھ ہی یہ روایتیں، یہ اقدار، یہ تہذیب سبھی مائل بہ زوال ہو گئیں۔ قرۃ العین حیدر نے نہ صرف ان حالات کو بیان کیا ہے بلکہ ان اقدار کے مٹنے کا ناسٹلجیا بھی ان کے ناولوں میں صاف نظر آتا ہے۔ نہ صرف قرۃ العین حیدر بلکہ کم و بیش ان تمام فکشن نگاروں کی ہمدردیاں دم توڑتے ہوئے زمیندارانہ طبقے کے ساتھ نظر آتی ہیں جنھیں زمیندارانہ معاشرے کی وضع داریوں اور تہذیبی آب و تاب نے بے حد متاثر کیا ہے۔

■

Dr.Simmi Iqbal
Assistant professor,
Dept.of Urdu
S.N.Sinha College,
Jehanabad, Bihar-804408
Mobileno:8130845047

عزیز احمد خان

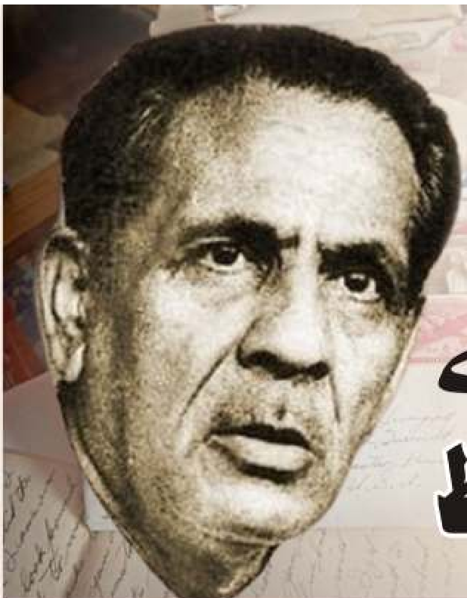

فراقِ گورکھپوری کے غیر مطبوعہ خطوط

فراق گورکھپوری کے خطوط کا ایک مجموعہ 'من آنم' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد فراق کے خطوط کا کوئی مجموعہ منظر عام پر نہ آسکا۔ فراق کے غیر مطبوعہ خطوط کی تعداد کتنی ہوگی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ البتہ کچھ غیر مطبوعہ مکتوب انجمن ترقی اردو ہند، دہلی کے آرکائیوز میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف مشاہیر ادب نے اپنے نام لکھے مکتوب کو مرتب کر کے شائع کیے ہیں، ان میں فراق کے خطوط بھی شامل ہیں۔ اس طرح 'نقوش' کے خطوط نمبر میں دو خط شامل ہیں۔ پہلا خط اردو کی مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس واجدہ تبسم کے نام تحریر کیا ہے اور دوسرا خط نادم سیتاپوری کو لکھا ہے۔

فراق گورکھپوری نے ایک خط 9 اگست 1945 کو الہ آباد سے واجدہ تبسم کو لکھا ہے:

''مائی ڈیئر واجدہ!

غیر متوقع طور پر تمھارا محبت بھرا خط ملا۔ میر کو غم نے مغرور بنادیا تھا۔ مجھے میرے غم نے صرف غمگین بنادیا ہے، مغرور نہیں بنایا۔ اس لیے تعریفیں مجھے غمگین ہی رہنے دیتی ہیں۔ اگر چہ ایک غم آمیز خوشی بھی بہ مقتضائے انسانیت مجھے حاصل ہوجاتی ہے۔ کیونکہ تمہاری تعریف خلوص و محبت پر مبنی ہے۔ اس لیے مجھے خوشی ہوتی اور مجھے اپنا یہ شعر یاد آگیا۔

دی مجھے تم نے آج دادِ سخن
درد نے درد کو سلام کیا

''واجدہ! میرے اچھے اشعار (اگر میرے کچھ اشعار کو اچھا کہا جا سکے) خود میرے رقیب ہیں۔ اچھا اب میرے جس سیدھے سادے شعر کی وضاحت تم نے چاہی ہے کچھ اس کے بارے میں۔ رونا غم زندگی یا احساس زندگی کے اظہار کا ایک ردِعمل ہے۔ رونے میں وہ رونا بھی شامل ہے جسے گریۂ صدا، گریۂ بے اشک حتی کہ آہ بے نفس تک بھی کہہ سکتے ہیں۔ اداسی بھی رونے کی ایک لطیف قسم ہے۔''

(نقوش خطوط نمبر شمارہ نمبر 109 اپریل مئی 1968 ص 430)

مندرجہ بالا اقتباس میں غالب نے غم کو اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے مولانا آزاد نے راحت و الم کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ لیکن فراق نے سیدھے طور پر اپنی غم زدہ زندگی کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اپنی شادی کی جس ناکامی اور اپنی بیوی کے متعلق اپنی آپ بیتی میں جو کچھ لکھا ہے اس کی رقت انگیزی، گداز اور درد کی بازگشت ان کے خط میں صاف سنائی دیتی ہے۔ اس کے علاوہ رونے کی تشریح بھی بخوبی کیا ہے۔ فراق نادم سیتاپوری کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اردو شاعری کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔ وسیم تو کیا خود ریاض خیر آبادی اب اوراق پارینہ ہو چکے ہیں۔ میرے پاس تو دو تین اشعار بھی حضرت وسیم کے نہ ہیں نہ کبھی تھے۔ بڑی مشکل سے انھوں نے میری ایک یا ڈیڑھ غزلیں دیکھی تھیں اور کوئی خاص اصلاح نہیں دے سکے تھے۔ احتراماً میں ان کو اپنا استاد تسلیم کرتا ہوں۔'' (ایضاً، ص 452)

اس خط میں فراق نے واضح کیا ہے کہ انھوں نے وسیم سے صرف دو غزلوں پر اصلاح لی اور انہیں احتراماً اپنا استاد تسلیم کرتے ہیں۔

فراق گورکھپوری نے رسالہ ایشیا کے مدیر اور اردو کے مشہور انشائیہ نگار ساغر نظامی کو بھی مکتوب لکھے جو رسالہ ایشیا جون 1941 کے مکاتیب نمبر میں شائع ہوئے۔ ایک مجلس میں جب ساغر نظامی اپنا کلام پڑھ رہے تھے، تو فراق ہنس رہے تھے۔ فراق کی یہ حرکت انھیں ناگوار گزری جس کا انھوں نے خط کے ذریعے اظہار کیا۔ اس کے جواب میں فراق نے اپنی طرف سے ایک خط میں صفائی پیش کی۔ حالانکہ فراق ساغر نظامی پر یا ان کے کلام پڑھنے پر نہیں ہنس رہے تھے بلکہ ان کی غیر موجودگی میں کچھ گھنٹے پہلے ہوئی دلچسپ باتوں کو لے کر وہ خواہ مخواہ ہنس رہے تھے۔ پھر بھی فراق نے اپنی اس حرکت پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے ساغر نظامی کے ناراض ہونے پر اپنا غصہ بھی جتایا۔ معافی مانگتے ہوئے فراق لکھتے ہیں:

''دوست مجھے معاف کردو اور معاف نہ کرو تو جو سزا چاہو دو۔ یہ الفاظ کسی فوری جذبے سے نہیں لکھے۔ میں کسی پر مضحکہ آمیز طریقہ پر ہنسنے کو گناہ سمجھتا ہوں خدا کے وجود سے انکار کو گناہ نہیں سمجھتا ہاں یہ بھی صاف کردوں کہ بات چیت میں اس دن میں تم کو چھیڑ ضرور رہا تھا لیکن اس لیے کہ تمھیں بھی ہنسی آئے۔ تم پر ہنسنے کو نہیں بلکہ تمھارے ساتھ ہنسنے کو۔ میرا ہی شعر سنو۔

عشق کے صدق و صفا رشک جہاں ہیں لیکن
کوئی الزام دیا چاہے تو الزام بہت

(رسالہ ایشیا، جون 1941، ص 100-99)

ساغر نظامی نے فراق سے رسالہ ایشیا کے لیے نثر میں کسی تخلیق کا مطالبہ کیا تو اس کے جواب میں فراق نے لکھا ہے کہ ''نثر مجھ سے مانگ کر ہرن پر گھاس کیوں لادنا چاہتے ہو'' اور نثر کے بدلے ایک نظم 'تجدید امروز' کے عنوان سے بھیج دی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فراق نثر میں جو لکھتے تھے وہ یا تو کسی مضمون کے جواب میں لکھتے تھے یا پھر اپنی ضروریات کے مدنظر یا پھر بہت زیادہ تقاضا کرنے پر لکھتے تھے۔ ساغر نظامی کے مطالبے پر ایک نظم بعنوان 'فلسفۂ دہریت' بھیجتے وقت ایک خط میں اپنے مذہبی عقیدے کا ذکر کرتے ہوئے فراق لکھتے ہیں:

''حسب ارشاد اپنی ایک تازہ ترین نظم بعنوان 'فلسفہ دہریت' ایشیا کے لیے حاضر خدمت کر رہا ہوں۔ میں وحدت وجود کا قائل ہوں اور وہ وجود میرے ایمان میں صرف مادہ ہے۔'' (ایضاً، ص 102)

فراق نے اسی طرح 'زمانہ کانپور' میں ایک مضمون 'کون سی راہ' پڑھنے کے بعد اس کی تعریف میں مراسلہ لکھا کہ میں بھی دنیا کے لیے اور خاص کر ہندوستان کے لیے مادیت اور دہریت کے فلسفے کی بڑی ضرورت محسوس کر رہا

ہوں جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اس فلسفے کے کچھ پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کفر، گناہ، رندی اور مستی، شراب اور عشق مجازی، صنم خانوں کے جلوے خشک مذہبیت کے خلاف نعرہ زنی کے ثبوت ہیں۔ فراق کے مطابق ہندوستان میں گوتم بدھ نے سرے سے خدا، روح اور مادّہ سب سے انکار کیا اور سنسار کو ایک ہستی نمانیستی قرار دیا اس کے متعلق فراق لکھتے ہیں:

''جدید سائنس اور فلسفہ نے مادہ کی جو ماہیتیں دریافت کی ہیں ان سے فلسفۂ مادیت اور دہریت کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ فلسفہ ہم میں یہ صلاحیت پیدا کر دیتا ہے کہ ہم ایک شخصی یا غیر شخصی خدا کے وجود سے انکار کریں۔ روح کے وجود سے انکار کریں، صرف مادّے کا وجود مانیں اور مادّے کے حیات بخش تصور سے نئے عقائد نئے اخلاق، نئی تہذیب قائم کریں اور اپنے شعور کی پوری پوری تشفی کریں۔'' (زمانہ کانپور، اکتوبر 1940، ص 258)

مندرجہ بالا خطوط سے فراق کا جو فلسفۂ زندگی ہے وہ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ اس کے متعلق اور بھی بہت سے دلچسپ واقعات ہیں جن سے فراق کے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہیں کہ وہ خدا، دیوی دیوتا، روح، یوم حساب، جنت، دوزخ وغیرہ پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

فراق گورکھپوری اور احمد صدیق مجنوں بہت اچھے دوست تھے۔ فراق کو جس نے بہت قریب سے دیکھا، وہ مجنوں گورکھپوری ہیں ان کی قربت اور اخلاص کا اندازہ لگانے کے لیے یہ دو فقرے کافی ہیں۔ کہتے ہیں:

''میں نے مشاعروں اور ادبی محفلوں سے باہر فراق کو فراق کبھی نہیں کہا۔ وہ روز اول سے میرے لیے رگھو پتی تھے۔ جس طرح میں ان کے لیے ملاقات کی پہلی تاریخ سے مجنوں تھا۔'' (ایضاً، ص 258)

فراق کی شاعری میں زبان و بیان کی غلطیوں کا اعتراف مجنوں نے بھی کیا ہے لیکن وہ دوسرے معترضین کی طرح اسے اہمیت نہیں دیتے۔ ان کا کہنا ہے کہ متقدمین اور معاصرین کا کلام بھی ان خامیوں سے پاک نہیں۔ مجنوں گورکھپوری نے قائم چاند پوری پر ایک مضمون لکھا جس میں انہوں نے میر اور درد کو قائم پر فوقیت دی تھی اس کے متعلق ایک خط میں مجنوں کو فراق لکھتے ہیں:

''اچھا یہ بتاؤ کہ اگر میر اور درد اپنی 'تغزلی جرأت' Lyrical courage اور رنج والم پر تغزلی فتح sorrow Lyrical conqvest of pain & کی وجہ سے اگر یقین اور قائم وغیرہ پر فوقیت رکھتے ہیں تو غالب اور مومن کہاں ٹھہریں گے؟ آتش اور مصحفی تو 'نشاط غم' ضرور دیتے ہیں۔ جرأت اور داغ اس بلندی پر یا ان گہرائیوں میں ہیں ہی نہیں بلکہ نسبتاً سطحی شاعر ہیں۔ باوجود اس دھوم دھام کے جوان کے کلام میں اتنے پر لطف انداز سے موجود ہے۔''

(مجنوں نکات مجنوں (ادبی تنقیدیں) بزم احباب نمبر 1، کتابستان الہ آباد-1957 ص 195)

مجنوں نے فراق کے اس خط کو بہت اہم قرار دیا ہے۔ فراق کو ایک خط میں اس مختصر مگر جامع خط کی تعریف کرتے ہوئے اسے 'ایوان' میں شائع کرنے اور خود اس پر اظہار خیال کرنے کو کہتے ہیں۔ اس خط کو ایوان میں شائع کرنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مقصد نہ صرف یہ تھا کہ ایسی دلچسپ اور مہتم بالشان بحث صرف دو ذاتوں تک کیوں رہے بلکہ اردو خواں طبقہ دیکھ لے کہ تنقید دراصل کس کو کہتے ہیں اور اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں، اور ہمارے دوست رگھو پتی سہائے جوگا ہے ماہے صرف اردو غزلیں اشاعت کے لیے بھیجتے رہتے ہیں اس مشکل اور حوصلہ شکن فن میں کیسی دست گاہ رکھتے ہیں تم نے تو نصف خط میں اردو غزل میں پورا محاکمہ کر دیا جو مختصر اور مجمل ہوتے ہوئے بھی کسی طرح ناتمام نہیں کہا جا سکتا۔ اگر اس طرح کبھی کبھی خط ہی میں قلم برداشتہ اس قسم کی بحث چھیڑ دیا کرو تو نہ صرف مجھ پر اور 'ایوان' پر احسان کرو گے بلکہ اردو ادب کی اس سے بہت بڑی خدمت ہوتی رہے گی۔'' (ایضاً، ص 188)

اس اقتباس سے فراق کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ فراق مجنوں کے مضمون پر مزید بحث کرتے ہوئے اسی خط میں لکھتے ہیں:

''تمھارے مضمون سے مجھے اختلاف بالکل نہیں۔ تم کو شاید یاد ہو کہ جب پہلے پہل یقین وغیرہ کا جادو تم پر چلا تھا تو تم نے مجھ سے حیرت ظاہر کی تھی کہ میر، درد وغیرہ سے آخر یقین، تاباں یا قائم کو کم کیوں کر مانا جائے۔ میں نے اس وزن Weight اور پختہ مغزی کی طرف کچھ سوچ کر اشارہ کیا تھا جو میر کے وہاں ہے۔ اور گھلاوٹ کی اس انتہا کا ذکر کیا تھا جس میں انتہائی فکری قوت، انتہائی جذباتی قوت اور انتہائی تخیل سب ایک ہو جاتے ہیں اور جو درد کے وہاں اتنا نہیں ہے یا اس درجہ پر نہیں ہے جتنا کہ میر کے یہاں موجود ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ عہد ایلیزبتھ کے دوسرے شاعروں کے کلام یا ڈراموں میں بھی شیکسپیئر سے ایک دلکش مگر پر فریب مشابہت مل جاتی ہے۔ لیکن اس زورمند غزلیت Sineway Lyricism یا تغزل کے اس رگ و پے Lyrical mnscle کا پتہ نہیں ہے جو شیکسپیئر میں ہے یہی نسبت میر اور ان کے عہد کے دوسرے شعرا میں ہے۔ معیار یہاں بھی زورمندی اور توانائی Strenghth ہے۔'' (ایضاً، ص 187)

فراق نے اردو کے مشہور ادیب رام لعل کے نام بھی مکتوب لکھے ہیں۔ فراق سے رام لعل کی ملاقات 1960 میں الہ آباد میں فراق کی رہائش گاہ پر ہوئی۔ اس پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے رام لعل لکھتے ہیں:

''میں نے آگے بڑھ کر عقیدت کے جوش میں ان کے پاؤں چھو لینے چاہے تو انھوں نے جلدی سے اپنے پاؤں کھینچ لیے اور بولے ''یہ بالکل غلط طریقہ ہے۔ ملنے کا ایسا ہندی والے کرتے ہیں تم تو اردو والے ہو۔ میرے ساتھ ہاتھ ملاؤ اور سامنے کی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔''

(رام لعل: دریچوں میں رکھے چراغ، شانتی نکیتن ڈی 2990 لکھنؤ 1991، ص 24)

فراق گورکھپوری نے 27 دسمبر 1964 کو مظہر امام کے مجموعہ کلام 'زخم تمنا' پر اپنے تاثرات بھیجے تھے اس خط میں فراق مظہر امام کو ایک کہنہ مشق شاعر قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مظہر امام صاحب کے کلام کا مجموعہ 'زخم تمنا' کے نام سے شائع ہو گیا ہے ان کی شاعری لطافت احساس اور طباعت احساس اور طباعت فکر کی خوبصورت مثال ہے۔ ان کے یہاں ایک ایسا چیٹلا پن اور نشاط آمیز دل گرفتگی ہے جو ان کے کلام کو انفرادیت بھی عطا کرتی ہے اور دل نوازی بھی۔ یہ مجموعہ اس لحاظ سے قابل ستائش ہے کہ شاعر نے حساس اور پرخلوص انداز میں اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ یہ بات ریاضت اور مشق سے حاصل ہوتی ہے۔''

(امام اعظم ڈاکٹر مرتب، مظہر امام کے نام مشاہیر ادب کے خطوط نصف ملاقات، اردو ادبی سرکل دربھنگہ، 1994 ص 196)

اسی طرح علیم صبا نویدی کے مجموعہ کلام 'طرح نو' پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ سرسری طور پر تبصرہ کرتے ہوئے انھیں مشق سخن جاری رکھنے کی صلاح دیتے ہوئے مزید کہتے ہیں کہ اس بات کا خیال رہے کہ مضمون کا نیا پن کہیں آپ کو لے نہ اڑے۔ جب ہم دونوں مجموعوں پر فراق کی آرا کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف مظہر امام کے مجموعہ کلام پر انھوں نے نہایت جامع اور بلیغ تبصرہ کیا ہے، اس کی وجہ ان کی خوبصورت شاعری ہے اس کے برعکس علیم صبا نویدی کے مجموعہ کلام پر جو تبصرہ کیا ہے وہ ایک رسمی تبصرہ ہے۔

فراق گورکھپوری نے جگن ناتھ آزاد کو بھی خطوط لکھے ہیں۔ آزاد نے فراق کو اپنے مجموعہ کلام پر مقدمہ لکھنے کو کہا تھا اس کے جواب میں فراق 24 جولائی 1949 کو لکھتے ہیں:

''محبی خطوط ملے اور آپ کے مجموعے کا چھپا ہوا مسودہ بھی...... بتاؤ بھئی آزاد اب کیا کروں کیا نہ کروں۔ اپنے آپ سے شرمندہ ہوکر رہ جاتا ہوں۔ دیکھو اقبال ایسا شاعر بھی برسوں کی چپ سادھ لیا کرتا تھا۔ کچھ دنوں کے لیے آپ کو اوسر اور بنجر رکھتا ہے۔ ممکن ہے وقت کی غیبی آبیاری سے تخلیق پھر شاداب ہوجائے آمین''

(امین بنجارہ مرتب، سلام و پیام (مشاہیر کے خطوط جگن ناتھ آزاد کے نام) جلد اول۔ ایورگرین کمپیوٹرس پبلشرز جموں 2002 ص 36)

فراق اس خط میں جگن ناتھ آزاد کی کتاب پر مقدمہ لکھنے میں ہوئی تاخیر پر بڑے دلچسپ انداز میں معذرت پیش کرتے ہیں۔ فراق علامہ اقبال کو یا ان کی شاعری کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اقبال کی نظم پر ایک مضمون تو لکھا لیکن بدنامی اور ڈر کی وجہ سے اسے اپنے نام سے نہ چھپوانے کی گزارش کرتے ہوئے 24 نومبر 1949 کو جگن ناتھ کو لکھتے ہیں:

''محبی و مخلص! نوازش نامے ملے۔ بیمار پڑ گیا ہوں۔ پریشانی میں جواب لکھ رہا ہوں۔ بھائی دیکھو اقبال کی نظم پر مضمون اگر 'ماحول' میں چھپواؤ تو میرا نام ہرگز ہرگز نہ دیا جائے۔ ان ناموں میں سے کوئی نام چن لیجیے (1) آرگس (2) ایک نام کیا لوں کوئی اللہ کا بندہ ہوگا (3) کیا کہنا ہے (4) ترجمان حماقت (5) نقاد'' (ایضاً ص 37)

فراق گوکھپوری نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے نام بھی خطوط ارسال کیے تھے۔ ان خطوط کو فرمان فتح پوری نے 'نصف الملاقات، مشاہیر کے خطوط مع سوانح کوائف' میں شامل کیا ہے۔ اس کتاب میں فراق کے 14 خطوط شامل ہیں۔ 8 مارچ 1952 کو کراچی پاکستان میں بین المملکتی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ فرمان فتح پوری نے فراق کو اس مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی اور ان کی دعوت پر فراق پاکستان تشریف لے گئے۔ فرمان فتح پوری نے فراق سے اپنے بہت پرانے مراسم کا ذکر کرتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ مجھ سے پہلے بھی بعض اداروں اور انجمنوں نے انھیں پاکستان بلانا چاہا لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ فرمان فتح پوری کو لکھے گئے فراق کے خطوط اسی مشاعرے کے تعلق سے ہیں یا اس کے بعد کے ہیں۔ خیر اسی مشاعرے کے بہانے فراق اور فرمان فتح پوری میں کچھ دنوں تک خط و کتابت رہی۔

فراق نے فرمان فتح پوری کو جو مکتوب لکھے ہیں ان میں چند ہی ایسے مکتوب ہیں جن میں ادبی بحث کی گئی ہے۔ ورنہ تمام خطوط میں مشاعرے اور اس کی آمد و رفت میں ہونے والے اخراجات کے متعلق باتیں کی گئی ہیں۔ البتہ 'نگار پاکستان' کا جب 'نیاز فتح پوری' نمبر نکلنا تھا تو انھوں نے نہ صرف ایک جامع مضمون نیاز فتح پوری کی ادبی خدمات پر سپردِ قلم کیا بلکہ خطوط میں بھی ان کی علمی و ادبی اہمیت کا کھل کر اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے تمام محاسن کا بھی ذکر کیا ہے۔

مطرب نظامی نے اپنی کتاب 'فراق گورکھپوری ذہنی خاکوں میں' میں فراق کے چند خطوط شامل کیے ہیں۔ اس کتاب میں شامل فراق کا ایک خط صابردت مدیر 'فن و شخصیت' کے نام ہے۔ فراق نے صابردت کی ادبی خدمات کی تعریف کی ہے۔ اس کتاب میں فراق کا ایک خط جو محمد طفیل ایڈیٹر 'نقوش' کے نام ہے، شامل ہے۔ اس خط میں فراق نے محمد طفیل سے اپنے روابط اور دوستی کو ہندو پاک کے درمیان دوبارہ بھائی چارے اور امن قرار دیتے ہیں۔ فراق گورکھپوری لکھتے ہیں:

''میرے دل و جگر بھائی طفیل وہ دن تو آیا کہ میرے دل و دماغ اور کلیجے کے جو دو ٹکڑے ہو گئے تھے جن میں سے ایک پاکستان میں رہ گیا اور صرف آدھا ہندوستان میں اب وہ دونوں ٹکڑے پھر مل گئے میرا دل و دماغ اور کلیجہ پورے کا پورا پاکستان میں بھی ہے اور پورے کا پورا ہندوستان میں بھی ہے محبت بڑے سے بڑے فاصلے کی بھی نفی نہیں شاعر اعظم ٹیگور نے کیا خوب کہا ہے ع

کہ ہم کئی ہیں اس لیے اور بھی ہم ایک ہیں

کیونکہ جو خلائیں ہمارے ٹکڑے ہوجانے سے پیدا ہوجاتی ہیں انہیں ہم محبت سے بھر دیتے ہیں۔''

(مطرب نظامی، فراق گورکھپوری ذہنی خاکوں میں، نظام آفسیٹ پریس لکھنؤ، 1993 ص 450)

فراق نے اس خط میں یہ واضح کیا ہے کہ دونوں ممالک کے سیاست داں چاہے جتنے نفرت کے بیج بوئیں لیکن عوام کے دلوں میں آپسی بھائی چارہ اور محبت قائم رہے گی اور ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے رہیں گے۔

جوش ملیح آبادی کو لکھے گئے فراق کے دو خطوط بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔ فراق نے جوش کو بہت تفصیل سے لکھا ہے اس خط میں فراق نے جوش کو مصلحت سے کام لینے اور 'پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر' نہ کرنے کی ہدایت دی ہے۔ جوش کا ایک انٹرویو جو علامہ اقبال کے تعلق سے تھا اور اسے جوش کی وفات کے بعد شائع ہونا تھا لیکن اس انٹرویو کو کچھ لوگوں کی سازش کی وجہ سے جوش کی زندگی میں ہی شائع کر دیا گیا جس کی وجہ سے انھیں پاکستان میں بہت ساری پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس واقعہ کے متعلق فراق لکھتے ہیں:

''تمھارا ایک بیان جو خفیہ انٹرویو تھا، یعنی اس کو تمھارے مرنے کے بعد شائع ہونا چاہیے تھا مگر تمھارے حاشیہ برداروں نے اس کو قبل از وقت شائع کر کے راز فاش کر دیا اور تمھارے اوپر عتاب نازل ہونے لگے۔ میرے نزدیک یہ تمھاری غلطی تھی پاکستان میں رہ کر اقبال کی مخالفت دانشمندی نہیں اور صحیح بات تو یہ ہے کہ تم اقبال کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔'' (ایضاً ص 455)

فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی کے بہت اچھے دوست تھے۔ فراق نے اپنی رباعی کے مجموعہ 'روپ' کو جوش کے نام انتساب کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فراق نے اس خط میں جوش کو ایک مخلص دوست کی حیثیت سے ان کی تمام خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کیا ہے۔ فراق یوں تو متعدد بار لکھ چکے اور کئی مواقع پر اپنے دہریہ ہونے کا اعلان کر چکے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ مختلف مذاہب کے عظیم رہنماؤں کی عزت و احترام کرتے تھے۔ 'حرم' کے ایڈیٹر مولانا مومن نے جب فراق سے اپنے رسالے کے لیے کچھ نگارشات کی درخواست کی تو اس کے جواب میں فراق لکھتے ہیں:

''آپ نے 'حرم' کے لیے مجھ سے کچھ لکھنے کے لیے فرمایا ہے۔ لیکن اس کو میں اپنی بدقسمتی کہوں یا خوش قسمتی کہ ابھی تک حرم و دیر سے واقف ہی نہیں ہوا بقول غالب ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں جاتی

میں عام طور پر مذہبی شاعری کو پسند نہیں کرتا لیکن اس سے یہ مطلب بھی نہیں کہ دنیا کے عظیم انسانوں کی قدر سے گریز کروں میں پیغمبر اسلام کو دنیا کا سب سے بڑا جینیس مانتا ہوں۔ ان کے اخلاق حمیدہ، اوصاف باطنی اور اوصاف ظاہری روح انسانی میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ ان کی تعریف کرنا صرف مسلمانوں ہی پر فرض نہیں بلکہ دنیا کے ہر انسان پر فرض ہے۔ جہاں تک میں نے تاریخ عالم کا مطالعہ کیا ہے اس میں دیگر اقوام کے مفکرین بھی آپ کے مداح ہیں۔ سرولیم سور جس نے پیغمبر اسلام کی سوانح عمری مخالفانہ نقطۂ نگاہ سے لکھی ہے۔ مگر وہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ جوانی میں بھی آپ کا چال چلن پاک اور بے عیب تھا۔'' (ایضاً ص 477)

اس خط میں فراق نے ایک نعتیہ رباعی بھی لکھی ہے۔ فراق کے مکتوب کا مطالعہ کرنے سے ان کی زندگی کے مخفی گوشے بھی وا ہو جاتے ہیں۔ ان کے مکتوب سے ہمیں ادبی بحث کے علاوہ اس دور کے سیاسی و سماجی حالات کا بھی پتہ چلتا ہے۔

■

Dr. Aziz Ahmad Khan
House No 9, 2nd Floor, Shadab Colony
Mahanagar,
Lucknow-226006 (UP)
Mob.: 8684943650

اردو افسانہ اور رومانی اسلوب

عرفان رشید

لفظ رومانیت کو انگریزی میں Romanticism کہتے ہیں۔ رومانیت اصل میں ایک ثقافتی تحریک تھی جس کا آغاز 17 ویں صدی کے نصف آخر میں فرانس میں ہوا تھا۔ یہ تحریک Classism کلاسیزم (یونانی اور لاطینی فنی تصورات) کے خلاف ایک ردعمل تھی۔ اس میں تخیل کو منطق پر ترجیح دی جاتی ہے، لیکن اس کا طرۂ امتیاز داخلیت، جذبے اور وجدان کی ترجمانی ہے۔ کلاسکیت عقلیت کا نشان تھی اس میں لاطینی اور یونانی اصول وضوابط کی بھرمار تھی۔ اس نے زندگی اور اس کی رعنائیوں کو محض چند اصولوں میں قید کر لیا تھا۔ عقلیت، اصول پرستی، تقلید اور میانہ روی اس تحریک کے بنیادی لوازمات ہیں اور انھی اصول وضوابط کی زنجیر کو فرانسیسی مفکر روسو نے توڑ ڈالنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کہا ہے: " Man is born free and everywhere he is in chains" یعنی انسان آزاد پیدا ہوا لیکن زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس قول کے بعد ایک زبردست انقلاب برپا ہوا اور مختلف ممالک میں اس تحریک نے اپنے پر پھیلائے۔ دوسرا محرک انقلاب فرانس اور صنعتی انقلاب نے خاموش قوتوں کو نئی سوچ اور فکر عطا کی ہے۔ جاگیردارانہ سماج نے جن قوانین پر لوگوں کو لبیک کروایا تھا ان کی زنجیریں لڑکھڑا رہی تھیں۔ فرسودہ قوانین کے خاکے بے جان نظر آرہے تھے اور وقت کا تقاضا تھا کہ نئے اصولوں کی بساط بچھائی جائے۔ اس طرح سے ایک نئے سانچے میں ادب کو فروغ ملا جسے دنیا رومانیت Romanticism کے نام سے یاد کرتی ہے۔

لفظ رومانیت کے حوالے سے محمد حسن یوں رقمطراز ہیں:

''رومان کا لفظ 'رومانس' سے نکلا ہے اور رومانس (رومان) زبانوں میں اس قسم کی کہانیوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو انتہائی آراستہ اور پر شکوہ پس منظر کے ساتھ عشق ومحبت کی ایسی داستانیں سناتی تھیں جو عام طور پر دور وسطی کے جنگ اور خطر پسند نوجوانوں کی مہمات سے متعلق ہوتی تھیں اور اس طرح اس لفظ سے تین خاص مفہوم وابستہ ہوگئے۔

1: عشق ومحبت سے وابستہ تمام چیزوں کو رومانوی کہا جانے لگا۔

2: غیر معمولی آراستگی، شان وشوکت، آرائش، فراوانی اور محاکاتی تفصیل پسندی کو رومانوی کہنے لگے اور

3: عہد وسطی سے وابستہ تمام چیزوں سے لگاؤ اور قدامت پسندی اور ماضی پرستی کو رومانوی کا لقب دیا گیا۔

(پروفیسر محمد حسن، اردو ادب میں رومانوی تحریک، عاکف بک ڈپو، دہلی، 1999، ص 12-13)

کلاسیکی ادب کی تحریک نظم وضبط، مختلف اشیا کے امتزاج فکر جذبات اور عمل کو ایک منضبط طریقے سے دیکھنے کا نام ہے جبکہ رومانوی تحریک کا دائرہ وسیع ہے۔ اس تحریک کے حوالے سے لوگاس اپنی کتاب "Decline and fall of the Roman Empire" میں لکھتے ہیں:

''رومانیت کی گیارہ ہزار تین سو چھیانوے تعریفیں ہیں، کسی نے اس کو تحیر کی نشاۃ الثانیہ کہا ہے اور کسی کی نظر میں یہ تخلیقی شعور کا غیر معمولی ارتقا ہے۔''

(A History of English literature by Legouis p .No. 99)

جب اس تحریک نے فرانس سے اپنا سفر طے کر کے یورپ کے مختلف نہاں خانوں میں جگہ پائی تو اس لفظ کی نوعیت ہی بدل گئی۔ اب اس کو ایک اصطلاح کے طور پر ادب میں استعمال کیا جانے لگا۔ روسو کے بعد جرمنی میں شلیے اور شیگل کے خیالات نے رومانی آزادی کے خیالات عام کیے۔ انگریزی شاعری میں ورڈس ورتھ، کولرج، گوئٹے، ولیم بلیک اور کیٹس نے اس تحریک کو تقویت عطا کی۔ اسی بنا پر ورڈس ورتھ کو انگریزی شاعری میں رومانوی تحریک کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ اس میں خارجیت سے زیادہ داخلیت پر زور دیا جاتا ہے اس لیے کئی مفکروں نے اس کا دوسرا نام 'انفرادیت' رکھا ہے۔

20 ویں صدی کے اوائل میں انگریزی زبان کو ہندستان میں تدریسی زبان کا درجہ حاصل ہوا تو اس کا براہِ راست اثر نوجوانوں پر پڑا۔ انھوں نے مغربی فنون لطیفہ کے ساتھ ساتھ ادب میں کلاسکیت اور رومانیت کا بھی مطالعہ کیا۔ اس طرح سے ان اصطلاحوں نے یہاں کے پڑھے لکھے طبقے کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اردو ادب میں رومانیت کو سرسید تحریک کے ردِعمل کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ سرسید نے مقصدی ادب کو فروغ دیا جس کی کھلی مخالفت رسالہ 'مخزن' میں ہوئی۔ اردو ادب میں رومانیت 1900 سے 1935 تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اگرچہ اس تحریک کی عمر اردو ادب میں زیادہ نہیں ہے اس کے باوجود اس نے ادب پر دیرپا اثرات مرتب کیے۔ اس نے تخلیقی ادب، اجتماعی شعور، ادراک اور اسالیب شعر پر جو اثرات چھوڑے ہیں وہ اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ اردو افسانے میں رومانیت کے بانی سجاد حیدر یلدرم ہیں بعد میں ان کے اسکول سے وابستہ نیاز فتح پوری، حجاب امتیاز علی، مجنوں گورکھپوری وغیرہ نے اس کی پیروی کی۔

اردو افسانے میں رومانوی اسلوب کا سرخیل سجاد حیدر یلدرم (1880-1943) کو تصور کیا جاتا ہے۔ انھوں نے حقیقت نگاری (Realism) کے مقابلے میں اردو ادب میں رومانوی تحریک (Romanticism) کو متعارف کر کے اردو میں مختصر افسانے کو وسعت عطا کی۔ اس لیے اردو افسانہ میں رومانیت کے رجحان کا اولین پیش رو سجاد حیدر یلدرم کو سمجھا جاتا ہے۔ بقول سید احتشام حسین:

’’جس افسانہ نگار نے باقاعدہ رومانیت کا صور پھونکا وہ سجاد حیدر یلدرم ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو یلدرم کے ذوقِ نظر کا سلسلہ ترکی سے ہوتا ہوا یورپ تک پہنچتا ہے۔ ان کے افسانوں میں رنگینی ہے۔ بحثیں نتیجے نکالنے کے لیے نہیں، دلچسپی کے لیے ہیں۔ واقعات ایک دوسرے سے اس لیے مربوط نہیں ہیں کہ ان سے حقیقت کی کیفیت پیدا ہوگی بلکہ اس لیے کہ ان سے وہ فضا پیدا ہوگی جو جذباتی آسودگی اور سکون کا فریب دے سکے گی۔ یلدرم بظاہر اس فضا کی تخلیق جانے پہچانے واقعی عناصر سے کرتے ہیں۔ لیکن ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو ان عناصر میں حقیقت سے زیادہ تخیل کی رنگ آمیزی ہوتی ہے۔‘‘

(احتشام حسین، اعتبارِ نظر، کتاب پبلشرز چوک لکھنؤ 1965، ص 18-114)

اس رائے سے اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ یلدرم نے ترکی افسانے سے خمیر تیار کر کے ہندستانی رنگ میں اس طرح شامل کیا ہے کہ افسانے کا نیا باب متعارف ہوگیا ہے۔ انھوں نے رومانوی اسلوب کو اپنا مطمحِ نظر بنا کر ایک نئے رجحان کی داغ بیل ڈالی ہے۔ جس میں تخیل کی آمیزش، محبت، تصوریت، ماورائیت، آزاد تلازمۂ خیال کی پیشکش دیکھنے کو ملتی ہے۔ رومانیت کے خمیر کے سلسلے میں یہ بات بھی کافی اہمیت کی حامل ہے کہ علوم وفنون کی حیرت انگیز پیش رفت نے انسانی زندگی کے نظام اور اعتقادات وتصورات پر کاری ضرب لگائی جس کے نتیجے میں انسان کا یقینِ محکم متزلزل ہوگیا۔ اس سمت میں افسانہ نگاروں نے اپنے قارئین کو خیالی دنیا میں نت نئے تجربے دکھائے ہیں اور دیومالائی اور ماورائی کرداروں کے ذریعے ایک عام انسان کو تسکین ومسرت پہچانے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح سے اردو افسانے میں ایک نئے اسکول کا آغاز ہوا جسے اردو ادب میں ’یلدرم اسکول‘ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سجاد حیدر یلدرم اردو افسانے کا ایک اہم باب ہے جس نے باضابطہ طور پر پریم چند کے مقابلے میں رومانوی افسانے کے پیچ وخم سنوارے ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ ’خیالستان‘ 1911 میں شائع ہوا ہے۔ جس میں 10 افسانے اور 3 مضامین شامل ہیں۔ ’حکایات واحتساسات‘ اس میں 13 افسانے اور 12 مضامین ہیں۔

مجموعہ ’خیالستان‘ میں پہلا افسانہ ’خارستان وگلستان‘ ہے۔ جس میں انھوں نے داستانوی عناصر سے کام لیا ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے مافوق الفطرت عناصر، عشق و محبت کی رنگینیاں، طلسماتی فضا، دیومالائی عناصر جو عقل کو حیران کرتے ہیں جیسی چیزیں دکھائی ہیں۔ افسانے کی تکنیک سراسر داستانوی ہے۔ جس کو افسانہ نگار نے رومانوی اسلوب کے رنگ میں پیش کر کے ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ افسانہ زبان وبیان کے حوالے سے سادہ اور آسان ہے۔ افسانے کی پہلی قرأت کے دوران قاری کا ذہن داستان کی طرف چلا جاتا ہے۔ افسانے کا پہلا حصہ ’گلستان‘ کے نام سے موسوم ہے۔ جس میں افسانہ نگار نے ایک مرکزی کردار ’نسرین نوش‘ کی رومانوی زندگی کو رومانوی اسلوب میں برتا ہے۔ اس حصے میں عورت کی جنسی نفسیات کو ابھارنے کی ایک کامیاب کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح سے ایک عورت کے لیے ایک مرد کا ہونا ضروری ہے۔ حالانکہ افسانے کے اس پہلے حصے میں ’نسرین نوش‘ کو اُس کی ماں مردوں کے چنگل سے دور ایک جزیرے میں پرورش کراتی ہے لیکن جب یہ لڑکی سن بلوغت کو پہنچتی ہے تب فطرتاً اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے جسم اور روح کی جو انگڑائیاں ہیں وہ اسے کسی اور شے یعنی مرد کی ضرورت کا احساس دلاتی ہیں اس کیفیت و ہیجان کو سجاد حیدر یلدرم نے اپنے خوبصورت اسلوب میں اس طرح پیش کیا ہے:

’’ایک ذات، ایک وجود آئے، جو اس پر قادر ہو، جو اس پر حاوی ہو... جو اسے دُکھ دے، اس کے دل میں درد پیدا کرے، احساس پیدا کرے، اُسے مسل ڈالے...‘‘

’’چاند کو دیکھ دیکھ کر یہ امنگ پیدا ہوجاتی تھی کہ اس کے عریاں جسم سے جا کر لپٹ جائے۔‘‘

(افسانہ ’خیالستان وگلستان‘ ص 32-31)

مندرجہ بالا سطور سے اس بات کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ موصوف نے کس طرح سے فنی چابکدستی سے اس افسانے کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ اس افسانے میں رومانوی فضا ہر جگہ قائم ہوتی ہے اور ایک عورت کی نفسیات کو جس طرح افسانے میں پیش کیا گیا ہے یہ اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ رومانوی اسلوب (Romantic Style) کی کامیابی کا راز موضوع اور ڈکشن میں پنہاں ہوتا ہے اور جہاں تک موضوع اور لفظیات کا تعلق ہے مذکورہ افسانہ اس کی بہترین مثال ہے۔

اس افسانے کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ ’گلستان‘ دوسرا حصہ ’خارستان‘ اور تیسرا حصہ ’شیرازہ‘ ہے۔ دوسرا حصہ ’خارستان‘ میں خارا یعنی مرد کی ویران زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ خارا نے اپنا بچپن ویران اور سنسان خارستان میں گزارا ہے جس کے نتیجے میں اس کی زندگی غموں اور دکھوں کا مجموعہ بن گئی تھی۔ اس کی جب نادانستہ طور پر حصہ سوم ’شیرازہ‘ میں ’نسرین نوش‘ سے ملاقات ہوجاتی ہے تو انھیں ایک ایسی مسرت اور تسکین حاصل ہوجاتی ہے جس کا متمنی وہ برسوں سے تھا۔ اُسے ایک ایسی عورت کی ضرورت تھی جس کا ذکر وہ اپنے بوڑھے ساتھی سے سنا کرتا تھا:

’’بڈھا مارے خوشی کے متوالا سا ہوگیا تھا، کچھ چپ ہوجاتا لیکن ترنگ میں آ کر پھر کہنا شروع کرتا:

عورت! عورت عورت! ایک بیل ہے جو خشک درخت کے گرد لپٹ کر اسے تازگی، اُسے زینت بخش دیتی ہے۔ وہ ایک دھونی ہے کہ محبت کی لپٹ سے مرد کو گھیر لیتی ہے۔ بغیر عورت کے مرد سخت دل ہوجاتا ہے، اکھل کھرا بن جاتا ہے، یہ عورت کی شفقت ونوازش، یہ اُس کی مسکراہٹ کا ہی اثر ہے کہ مردوں کا سینہ عالی اور رفیق حیات سے منور ہوجاتا ہے۔‘‘ (افسانہ: ’خارستان وگلستان‘ ص 66)

اس افسانے میں سجاد حیدر یلدرم نے زن ومرد کی عظمت کو بیان کیا ہے کہ کس طرح سے مرد وعورت ایک دوسرے کے لیے لباس ہیں۔ اس اقتباس سے صاف جھلکتا ہے کہ موصوف نے ایک عورت کو بطور طوائف کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ ایک عظیم شے تصور کیا ہے۔ جس کے بغیر مرد اور سماج کا تصور ممکن نہیں ہے۔ عورت ایک ایسی زینت ہے جو ایک خارستان کو اپنی محبت سے اس طرح سینچتی ہے کہ اس میں گل وگلزار نکل آتے ہیں۔ یہی وہ حسن ہے جو بنجر زمین میں نمو پیدا کرتا ہے۔

اس طرح سے یلدرم نے اس افسانے میں داستانوی انداز کو افسانے کے رنگ میں ڈھال کر ایک نئے رجحان کا آغاز کیا ہے اور اپنے معاصرین کے سامنے ایک ایسا نمونہ رکھا ہے جسے بعد میں رومانوی اسلوب سے تعبیر کیا گیا۔

سجاد حیدر یلدم نے اپنے معاصرین سے ہٹ کر جدت سے کام لیا ہے۔ انھوں نے رومانیت کو باضابطہ طور اپنایا ہی نہیں بلکہ اس کے لیے ایک ایسا Platform تیار کیا جس کو بعد میں ان کے رفقاءِ کار نے انجام تک پہنچایا ہے۔ ان کے اسلوب کے حوالے سے عبدالودود لکھتے ہیں:

’’سجاد حیدر یلدرم شاعرانہ مزاج رکھتے تھے۔ انھوں نے نثر میں شاعری کی، ان کی طبع زاد اور ترجمہ تخلیقات، افسانے اور ناولٹ اس کے شاہد ہیں، انھوں نے اردو کو ایک نئے اسلوب سے آشنا کیا۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں اس بات کا احساس تھا کہ اُردو کی ترقی وترویج کے لیے ضروری ہے کہ اسے مشرقی دائرے سے نکال کر ایک وسیع فضا میں پہنچا دیا جائے۔ انھیں ترقی زبان کی نفاست اور تخلیقات میں خیالات کی رعنائی عزیز تھی۔ اس لیے انھوں نے اردو میں بھی وہی حسن پیدا کرنے کی کوشش کی تا کہ اردو میں نئے اسلوب کا اضافہ ہو اور اس کا حسن نکھر جائے۔‘‘

(عبدالودود، ڈاکٹر، اردو نثر میں ادب لطیف، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، طبع دوم، 1980)

اس اقتباس سے اس بات کا تعین ہو جاتا ہے کہ انھوں نے دانستہ طور پر اردو ادب میں ایک نئے اسلوب نگارش کی داغ بیل ڈالی ہے۔ حقیقی معنوں میں انھوں نے اردو افسانے کو نئی پہچان دلانے میں مرکزی رول ادا کیا ہے۔

یلدرم کی تحریروں میں رومانوی رنگ غالب ہے۔ ان کے اس اسلوب کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو انھوں نے چار عناصر کو اہمیت دی ہے۔ جن میں حسن، حواس، جذبہ اور تخیل قابل ذکر ہیں اور یہی عناصر ان کے اسلوبِ نگارش کا خاصہ بھی ہیں۔ افسانوں کے عنوانات بھی یلدرم نے رومانوی رنگ کے چنے ہیں جن میں خارستان وگلستان، حکایات لیلیٰ و مجنوں، حضرت دل کی سوانح عمری، اگر میں صحرا نشین ہوتا، فسانہ ہائے عشق، ایک مغنیہ سے التجا، جہاں پھول کھلتے ہیں، ویران صنم خانے وغیرہ شامل ہیں۔

یہ ایک تسلیم شدہ بات ہے کہ شاعری Poetry کسی خاص میڈیم کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ اس کا تعین لکھنے والے کی ذہنی بالیدگی پر منحصر ہوتا ہے۔ یلدرم نے ایسی تراکیب باندھی ہیں جن سے شاعرانہ حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ جب وہ نثر میں سلسبیل قمر، ملکہ ملاحت، آئین آفتاب پرستی، گلبا نگ رقص و آہنگ، شعر وخیال وغیرہ جیسی تراکیبیں استعمال میں لاتے ہیں تو اس وقت اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے اندر ایک شاعر انگڑائیاں لے رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کبھی کبھی قاری آزاد نظم اور نثری نظم پڑھتا ہے جس میں ایک آہنگ اور ترنم پیدا ہوتا ہے جو اپنا گہرا تاثر قاری پر ڈالتا ہے۔

سجاد حیدر یلدرم کا اسلوب ان کے فن کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کا رومانوی اسلوب ان کی اصل پہچان ہے۔ انھوں نے عورت کو حسن کی دیوی سے تعبیر کیا ہے اور حسن ان کے رگ و پے میں سما چکا تھا۔ حسن کی ادا کاری اور رنگا رنگی نے انھیں ایک صاحب اسلوب بنا دیا ہے۔ انھوں نے غیر سنجیدہ ہوتے ہوئے بھی ایسے مقصدی مضامین پر خامہ فرسائی کی ہے جسے بعد میں رومانوی حقیقت نگاری سے تعبیر کیا گیا۔ رومانوی اسلوب کا سہارا لے کر سماج کی ایسی چیزوں پر قلم اُٹھایا ہے جس کو حقیقت پسند افسانہ نگاروں نے نظر انداز کیا تھا۔ البتہ انھوں نے داستانوی رنگ کو اپناتے ہوئے اس میں ایک ایسا تاثر اور ماورائیت ابھاری ہے کہ قاری بھول بھلیوں میں کھو کر ایسے خواب تعمیر کرتا ہے جن کی تعبیر حقیقت میں ممکن نہیں ہوتی۔ انھوں نے اردو افسانے کو مغربی Romanticism کے ہم پلہ لانے کی کوشش کی۔

سجاد حیدر یلدرم کے معتقدین میں سے جس افسانہ نگار نے رومانوی اسلوب کو اوڑھنا بچھونا بنا دیا ہے وہ نیاز فتح پوری ہیں۔ نیاز نے رومانوی افسانے کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا ہے۔ انھوں نے رومانوی موضوعات میں 'عورت' کو ایک خاص وقار اور عظمت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بنیادی طور پر وہ ایک رومان پرست اور جمال پسند انسان تھے۔ انھوں نے مقصدی ادب کے مقابل میں تخیل آفرینی پر زور دیا ہے۔ ان کی اس حسن پرستی اور رنگین مزاجی کے بارے میں مجنوں گورکھپوری یوں رقمطراز ہیں:

''نیاز کے افسانے اسی ٹھوس اور سنگین عالم آب و گل سے وابستہ ہوتے ہیں۔ وہ جب حسن و عشق کے بیان پر آتے ہیں تو ہم کو ہوا اور بادل میں نہیں لے جاتے بلکہ جسم کی تمام چھپی ہوئی رنگینیوں اور کیفیتوں سے لذت آشنا کرتے ہیں۔''

(احمد صدیق مجنوں، پروفیسر، 'نکات مجنوں' کتابستان الہ آباد، 1975، ص 316)

نیاز فتح پوری نے اردو افسانے کو زندگی کے پر پیچ حالات و واقعات سے نجات دلانے کے لیے تخیل کی نئی جوت جلا کر اس میں رنگینی اور نشاط انگیز تصویریں پیش کی ہیں۔ انھوں نے 'عورت' اور 'محبت' کو افسانے کا نبیادی موضوع قرار دیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی افسانوی کائنات میں رومانیت غالب ہے۔ رومان سے انھیں والہانہ عشق تھا جس کا اندازہ ان کے افسانوں میں نمایاں طور پر ملتا ہے۔

افسانہ 'شہاب کی سرگزشت' ان کے رومانوی اسلوب کا شہکار ہے، جس میں انھوں نے داستان عشق بیان کی ہے۔ اس افسانے کے تین مرکزی کردار، شہاب، محمود اور اختر ہیں جن کے گرد کہانی رقص کرتی ہے۔ افسانہ کافی طویل ہے۔ اس طوالت کی وجہ سے کئی ناقدین اسے ناولٹ کے زمرے میں رکھتے ہیں۔

اس میں نیاز کا سحر انگیز اسلوب جلوہ گر نظر آتا ہے اور طلسماتی فضا کی وجہ سے اس میں قاری ڈوب جاتا ہے۔ رنگینی و مرصع سازی، برمحل استعاروں اور نادر ترکیبوں سے اس میں ایک انوکھا پن پیدا ہو جاتا ہے۔

افسانے میں محمود، شہاب کا دوست ہے جو ایک لڑکی سے عشق کر بیٹھتا ہے لیکن جب یہ بات شہاب کو پتہ چل جاتی ہے تو وہ اپنے دوست محمود کو اس عشق و عاشقی کے مرض سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہیں:

''شہاب: میرے نزدیک محبت نام ہے ایک بے غرض انہماک کا ایک خود فراموش کیفیت کا جو پیدا ہو حسن کو دیکھ کر خواہ وہ حسن ظاہری ہو یا باطنی' واضح ہو یا غیر واضح' زمین میں ہو یا آسمان میں، رہا یہ امر کہ محبت کرنے والا محبوب سے مل جانا چاہتا ہے یا نہیں یہ خواہش فطری ہے یا غیر فطری، اس کے متعلق صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ شخص جس کی محبت اس بات پر مجبور کرے حقیقتاً محبت نہیں ہے بلکہ ایک جذبہ شہوانی ہے اور اس لیے غیر فطری نہیں۔''

(افسانہ 'شہاب کی سرگزشت' ص 10)

''دیکھتے ہو محمود! یہ رونق تہذیب، یہ بیگانہ علم اور تمہارے خیال سے یہ طوفان حسن! اگر ایک لمحے کے لیے میں خدا ہو جاتا تو اس منظر کو اسی حال میں ہنگامے کے ساتھ اور انھیں نیرنگیوں کو لیے ہوئے قائم اور منجمد کر دیتا اور صرف تمہارے لیے تاکہ تم ان عورتوں میں ہر ایک کے ساتھ کامیاب محبت کر سکو۔'' (ایضاً، ص 12)

مندرجہ بالا اقتباسات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ رومانوی اسلوب مروجہ کلاسیکی اسلوب سے کس طرح منفرد ہے۔ رومانوی اسلوب میں ایک تخلیقی فضا قائم کی جاتی ہے تاکہ قاری متاثر ہو جائے اور ساتھ ہی ساتھ ایک ایسی کیفیت طاری ہو جائے جو حقیقی دنیا سے کوسوں دور معلوم ہوئے۔

نیاز نے اس افسانے میں داستانوی اسلوب سے براہ راست کام لیا ہے۔ اس میں داستان کی طرح تخیل، طوالت اور سادہ اسلوب سے کام لیا گیا ہے۔ اس افسانے میں تخریب کی جگہ تعمیر کا جذبہ، نفرت کی جگہ محبت کی جیت اور ابدیت دکھائی گئی ہے جو اسے اردو ادب کے بہترین رومانوی افسانوں میں جگہ بنانے کے لیے کافی ہے۔

رومانوی اسلوب کو بعد میں جن افسانہ نگاروں نے تقویت عطا کی۔ ان میں سلطان حیدر جوش، حجاب امتیاز علی، مجنوں گورکھپوری، ل۔احمد (لطیف الدین احمد)، چودھری محمد علی ردولوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ حقیقت پسند افسانہ نگاروں میں کرشن چندر نے رومانوی اسلوب کو اپنایا۔ انھوں نے اسی اسلوب کو لے کے اس میں حقیقت نگاری کا رنگ ڈال کر نت نئے تجربے کیے ہیں۔ کرشن چندر بنیادی طور پر ایک رومانی افسانہ نگار تھے۔ رومانیت سے روشنی لے کر انھوں نے اپنی افسانہ نگاری میں جاذبیت اور دلکشی پیدا کی ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'طلسم خیال' اس بات کی دلیل ہے کہ کرشن چندر کس حد تک رومانیت سے متاثر تھے۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز رومانی کہانی اور رومانی اسلوب سے کیا ہے لیکن بہت جلد خالص رومانوی اسلوب کو حقیقت نگاری کا رنگ چڑھا کر اس میں ایک نئی روح پھونک ڈالی۔ انھوں نے تخیل کی کارفرمائی اور طلسماتی فضا تو قائم کی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ایسے موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے کہ قاری سماجی ناہمواریوں پر سوچنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے 'طلسم خیال' پر رومانیت کا غلبہ نظر آتا ہے۔ اس مجموعے کا پہلا افسانہ 'جہلم میں ناؤ پر' ایک خوبصورت رومانی کہانی ہے جس میں ایک طرف انسان کے جذبات واحساسات کو موضوع بنا کر پیش کیا گیا ہے تو دوسری طرف کرشن چندر

نے خوبصورتی کا تقابل بدصورتی سے کیا ہے۔انھوں نے ایک بدصورت عورت اور ایک خوبصورت لڑکی کا تقابل اس طرح کیا ہے کہ قاری کے سامنے دونوں کا حلیہ آجاتا ہے، جس سے ان کے رومان پسند ہونے کا ثبوت مل جاتا ہے۔اقتباس ملاحظہ کیجیے؟

''میرے سامنے کی نشست پر چار عورتیں بیٹھی تھیں، دو بالکل بوڑھی اور دو ادھیڑ عمر کی تھیں مگر جو عورت میرے بالکل مقابل میں بیٹھی تھی اور جو اپنی گود میں ایک چھوٹے سے بچے کو لیے تھی وہ باقی عورتوں سے کم عمر اور زیادہ بدصورت تھی۔ وہ کبھی کبھی گھونگھٹ کی آڑ سے مجھے دیکھ لیتی تھی۔اس دنیا میں ہر کوئی ایک حسین کی تلاش میں ہے یہ تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کی آنکھوں سے بچ گیا۔بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بھی ایک حسین کی تلاش میں تھا...''

''لڑکی نے میری طرف دیکھا اگر میں یہ کہہ دوں کہ اس جیسا خوبصورت اور بھولا بھالا چہرہ میں نے نہیں دیکھا تو یقیناً ایک جھوٹ ہوگا لیکن یہ کہہ دینے میں مجھے ذرا بھی تامل نہیں کہ اس کے چہرے میں کچھ ایسی عجیب کشش اور موہنی تھی جس نے مجھے ایک دم مسحور کر لیا۔ صرف ایک لمحہ کے لیے اُس نے میری طرف دیکھا۔پھر وہ گھنی گھنی پلکیں اس کے رخساروں پر جھک گئیں۔وہ کشمیر کے حُسن صبیح کا ایک نادر نمونہ تھی۔دلکش خد و خال، سروقد دلآویز رنگت لیکن جس چہرے نے مجھے زیادہ متاثر کیا وہ اس کی ظاہری خوبصورتی سے بھی بڑھ کر اُس کی نگاہوں کا حزن وملال تھا جسے میں ایک جھلک ہی میں پا گیا...''

(افسانہ:'جہلم میں ناؤ پر'ص 12-7)

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کرشن چندر کس قدر حسن کے دلدادہ تھے اور انھوں نے کس انداز سے عشقیہ موضوع کو رومانوی اسلوب میں ڈھال کر ایک حسین اسلوب کا نمونہ پیش کیا ہے۔ ان اقتباسات میں انھوں نے جس زبان و بیان کا استعمال کیا ہے اس میں رومانیت صاف جھلکتی ہے۔اس میں انھوں نے حسن صبح، سروقد جیسی تشبیہات کا خوبصورت استعمال کیا ہے جس سے اس کی چاشنی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

اس افسانے کے بین السطور سے اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ رومانی افسانے کا کس قدر اثر براہ راست قاری پر پڑجاتا ہے۔ قاری اس افسانے کے دوران راوی کے ساتھ ایک حسین سفر پر نکل پڑتا ہے اور ہر موڑ پر مسرت اور انبساط کا مزہ لیتا ہے جو ایک کامیاب رومانی افسانے کی دلیل ہے۔ اس میں کبھی کبھار افسانہ نگار قاری کو ایسے خواب دکھاتا ہے جس میں حقیقت کا عنصر کوسوں دور ہوتا ہے لیکن پھر بھی قاری خیالی دنیا میں رہنا پسند کرتا ہے۔

کرشن چندر کے افسانوں میں جو چیز حسن پیدا کرتی ہے وہ ان کی منظر کشی ہے۔وہ اس طرح سے مناظر فطرت کی منظر کشی کرتے ہیں کہ قاری کی آنکھوں کے سامنے اس چیز اور اس جگہ کی تصویر رقص کرتی ہے۔انھوں نے اپنے تخیل کی وجہ سے کائنات میں بیشتر چیزوں کو فن کے قالب میں ڈھال کر مزین کیا ہے۔منظر کشی میں ان کا رومانوی اسلوب صاف جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔انھوں نے اپنے اسلوب کی بدولت اپنے افسانوں میں دلکشی اور حسن پیدا کیا ہے۔خاص طور سے اپنے رومانی افسانوں میں تخیل کی کارفرمائی کے ساتھ ساتھ ایک شستہ اور موزوں لفظیات کا استعمال کیا ہے۔ان کی بیشتر تحریروں میں شاعرانہ آہنگ جلوہ گر نظر آتا ہے۔ان کا اسلوب ان کے معاصرین سے منفرد اور جامد ہے جس سے ان کی معنویت بڑھ جاتی ہے۔ اپنے ساحرانہ اسلوب سے وہ قاری کو نت نئے تجربوں سے آشکار کراتا ہے۔وہ سماج کی ناہمواریوں کا رونا دھونا ہو، یا عشق ومحبت کی داستان کو بیان کرنا ہو، کرشن چندر اسے تمام تر رنگینیوں سے آراستہ کرتے ہیں۔ان کی منظر کشی کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے:

''آج پورے چاند کی رات ہے۔آؤ! کنارے لگی ہوئی کشتی کھولیں اور جھیل کی سیر کریں''... اس نے میری آنکھوں میں دیکھا اور میں نے اس کی محبت اور حیرت میں گم پتلیوں کو دیکھا جن میں اس وقت چاند چمک رہا تھا، جاؤ کشتی کھول کر پانی پر سیر کرو۔آج بادام کے پہلے شگوفے کا محبت بھرا تیوہار ہے۔آج اس نے تمھارے لیے اپنی سہیلیوں، اپنے ابا، اپنی ننھی بہن، اپنے بڑے بھائی، سب کو فریب میں رکھا ہے۔ کیونکہ آج پورے چاند کی رات ہے اور بادام کے سفید شگوفے برف کے گالوں کی طرح چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور کشمیر کے گیت اس کی چھاتیوں میں بچے کے دودھ کی طرح اُمڈ آئے ہیں... چاند نے یہ سب کچھ اس کی حیران پتلیوں سے جھانک کے دیکھا۔پھر یکایک کسی پیڑ پر ایک بلبل نغمہ سرا ہو اٹھی اور کشتیوں میں چراغ جھلملانے لگے... میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس سے کہا ''آؤ چلیں جھیل پر''

(افسانہ:'پورے چاند کی رات' از مجموعہ: اجنتا سے آگے، ص 7)

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کرشن چندر کو زبان و بیان پر کس قدر گرفت تھی۔وہ لفظوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔ الفاظ ومحاورات کا برمحل استعمال ان کا خاصہ تھا۔انھوں نے اردو افسانے میں رومانی حقیقت نگاری (Romantic Realism) کو باضابطہ طور پر متعارف کیا، یعنی جس میں انھوں نے سماجی حقیقت نگاری کو رومانوی اسلوب میں ڈھال کر ایک نیا تجربہ پیش کیا ہے۔حالانکہ ان سے پہلے سجاد حیدر یلدرم نے اس کا تجربہ کیا تھا لیکن کرشن چندر نے جس فنی چابکدستی سے اس کو افسانے کے قالب میں ڈھالا ہے وہ انہی کی دین ہے۔ان کے اس اسلوب کے حوالے سے محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

''اس سچی رومانیت کے معنی ہیں زندگی اور انسانیت سے گہری محبت، فطرت کا شدید احساس۔ انسان کے مستقبل کو روشن بنانے کی آرزو، دنیا کے ظالموں کے خلاف بغاوت، انسانوں کی روحوں کو سمجھنے کی صلاحیت، ان کے مصائب پر غم کھانا، دنیا کے دکھ درد کو یکسر مٹا دینے کی خواہش، ایک نئی اور بہتر دنیا کی تلاش، حسن اور حقیقت کی جستجو... اگر رومانیت سے یہ مطلب لیا جائے تو میں یہ کہوں گا کہ کرشن چندر کی رگ رگ رومانی ہے اور وہ اس میں رومانیت کی عظیم ترین مثال ہے۔''5

کرشن چندر نے رومانیت سے ہوتے ہوئے اپنا سفر حقیقت نگاری کی طرف منتقل کیا لیکن جو شعریت اور رومانوی رنگ تھا وہ انھیں برقرار رکھنا پڑا۔اسی وجہ سے ان کی افسانہ نگاری رومان اور حقیقت کے بیچ کا سنگم ہے جسے بعد میں رومانوی حقیقت نگاری کا نام دیا گیا۔ یہی اسلوب ان کی انفرادیت کا سبب بنا۔ان کے ابتدائی افسانوں میں تخیل کی آمیزش کا غلبہ زیادہ تھا لیکن بہت جلد انھوں نے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔کرشن چندر نے اسلوب کے حوالے سے جو بنیادی تجربہ کیا ہے وہ ان کا شعری اسلوب ہے۔انھوں نے شاعری کی زبان کو اردو فکشن میں استعمال کر کے یہ تجربہ بھی کیا ہے۔

اس طرح سے رومانی افسانہ یلدرم سے ہوتے ہوئے کرشن چندر تک معنی ومفہوم کی وسعتوں سے ہمکنار ہوا۔اور بعد میں رومانوی حقیقت پسند افسانہ نگاروں نے معاشرتی المناکیوں، بے چینی اور اضطراب وغیرہ کو افسانے کا موضوع بنا دیا۔البتہ کہیں کہیں انھیں بھی جذبات و احساسات، تخیل آفرینی، حسن پرستی اور تلاش حسن کا عمل، روح کی آزادی اور فطرت کی طرف مراجعت کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔انھوں نے انسانی زندگی کے ٹھوس حقائق کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں رومانی رنگ بھی چڑھایا ہے تاکہ قاری اکتا نہ جائے اور اسے مسرت و انبساط حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے سماج میں پنپنے والی برائیوں پر بھی نظر پڑ سکے۔

■

Irfan Rasheed Dar
R/o: Kochak Mohalla Hajin
Bandipora- 193501
Cell: 9622701103

محمد اکبر

آزادی کے بعد

اردو نظموں میں ہندوستانی عناصر

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں بہت سی زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ان زبانوں میں زیادہ تر زبانیں ایسی ہیں جن کی حیثیت علاقائی ہے۔ جن کا دائرۂ کار بہت حد تک سمٹا ہوا ہے۔ مگر اردو ہندوستان کی ان چند زبانوں میں سے ایک ہے، جس کے شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اردو اپنی سحر آفرینی اور کشش کے سبب عوام کی زبان پر چڑھی ہوئی ہے۔ اردو زبان صرف ایک کلچر ہی نہیں بلکہ ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی علامت، گنگا جمنی تہذیب و معاشرت کی علم بردار اور اتحاد و مساوات کی ترجمان ہے۔ اس کا دامن اتنا وسیع و عریض ہے کہ اس میں نہ صرف ہندوستان کی مٹی کی خوشبو ہے بلکہ برصغیر اور وسط ایشیائی تہذیب و ثقافت کی بوقلمونی اور رنگارنگی بھی اس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اردو زبان کا وجود ہی مشترکہ تہذیب و ثقافت کی دین ہے یہ خالص ہند آریائی سلسلے کی ہندوستانی زبان ہے جس میں ہندوستانیت کے عناصر جابجا دیکھے جاسکتے ہیں۔ عام بول چال سے لے کر ادب اور شاعری تک ہر جگہ ہندوستانی عناصر موجود ہیں۔ اس کے خمیر میں یہ بات شامل ہے کہ وہ سب کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندو، سکھ عیسائی اور دوسرے مذاہب کے لوگ بھی بہت سرگرم رہے ہیں مثنوی کدم راؤ پدم راؤ سے لے کر آج تک بہت سی کتابیں غیر مسلموں کے قلم سے لکھی ہوئی ہیں جو شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔

اردو ادب کی جتنی بھی اصناف ہیں ان سب میں ہندوستان کی علمی و ادبی، سیاسی و سماجی تہذیبی و تمدنی، قومی اور وطنی جیسے عناصر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ شاعری انسانی جذبات و احساسات کی آئینہ دار ہے وہ اپنے ماحول سے اثر انداز ہوکر انسانی اقدار کی عکاسی کرتی ہے، جس نے مشترکہ تہذیب کی علامت کو اجاگر کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ شاعری میں نظم نے سب سے زیادہ ہندو مسلم اتحاد، بھائی چارگی، اخوت، ہم دردی، میل جول اور اپنے پن کے احساس کو نمایاں کرنے میں خاص کردار ادا کیا ہے۔ اردو نظم ہمیشہ اپنے عصری ماحول سے متاثر رہی، اس نے ہر عہد کی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ اس نے ہندوستان کے سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی تقاضے کو بھی بحسن خوبی ادا کیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اردو نظموں میں اتحاد و مساوات کا پیغام، وطن پرستی کے جوہر، وطن پرستی کی شان میں ترانے، حب الوطنی کے جذبات سے سرشار نظمیں کثرت سے ملتی ہیں۔ ایسے بہت سے شعرا ہیں جنھوں نے ہندوستان کی عظمت و رفعت میں ایسے دلکش اور جذبات آمیز ترانے اور گیت گائے ہیں جن میں اپنے ملک سے والہانہ محبت و عقیدت اور وطن پرستی کے جذبات ابھرتے ہیں۔

گائتری منتر کو اردو کے بیشتر نظم نگاروں نے اپنی نظموں میں پیش کیا ہے گائتری منتر، ویدوں کا ایک خاص منتر ہے جس کی اہمیت تقریباً 'اوم' کے برابر ہے۔ گائتری ایک چھند بھی ہے جو رگ وید کے سات مشہور چھندوں میں ایک ہے۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ اس منتر کے پڑھنے سے خدا کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ اس کی بہت سی فضیلتیں بیان کی گئیں ہیں۔ گائتری منتر کو نظم کرنے والے عرش ملسیانی اردو کے معروف شاعر ہیں انھوں نے بڑی تعداد میں نظمیں کہیں ہیں جو مختلف موضوعات پر ہیں یہاں ہم گائتری منتر کے حوالے سے کچھ شعر دیکھتے ہیں۔

اے آفتاب! روح و روانِ جہاں ہے تو
شیرازہ بندِ دفترِ کون ومکاں ہے تو
باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمنِ ہست وبود کا
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شے میں زندگی کا تقاضہ تجھی سے ہے
ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے
تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے، خرد ہے، روحِ رواں ہے، شعور ہے
اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلی سے نور دے

ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو
یزدانِ ساکنانِ نشیب وفراز تو
تیرا کمال ہستی ہر جاندار میں
تیری نمود سلسلہ کوہسار میں
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو
زائیدگان نور کا ہے تاجدار تو
نے ابتدا تری نہ کوئی انتہا تری
آزادِ قید اول وآخر ضیا تری

اوم جس کاسب سے پیارا نام ہے
روح عالم قاطع آلام ہے
جو چلاتا ہے نظام کائنات
مایہ رحمت ہے جس کی نیک ذات
بخشتا ہے جو ہمیں مال ومنال
روح کو دیتا ہے جو نورِ جمال
ہے سزاوارِ پرستش جس کی ذات
پاک ہے سب سے جو ہے والا صفات
دل میں ہو اس کا تصور ہر گھڑی
یاد میں اس کی بسر ہو زندگی
تاکہ بخشے عقل کو ایسی جلا
ہر عمل میں ہو صداقت کی ضیا
چھوڑ دیں اعمال بد کو چھوڑ دیں

گائتری منتر میں سورج کومرکزی حیثیت حاصل ہے قدیم گرنتھوں میں سورج برہما کی علامت مانا گیا ہے شعرا کی بڑی تعداد نے اسے اپنی نظموں میں علامت کے طور پر پیش کیا ہے مثلاً شہاب جعفری کی ایک نظم ذرے کی موت کا ایک شعر ہے۔

اپنے سورج سے بچھڑا ہوا تارہ ہوں
اپنی فطرت سے بکھرا ہوا پارہ ہوں

اس شعر میں سورج ایک علامت ہے کیوں کہ اسے نظام شمسی میں مرکزیت حاصل ہے اور باقی تمام ستارے اور سیارے فروع ہیں۔مسلمان اور ہندو کے عقائد، رسوم و رواج اور تہذیب ومعاشرت کے تمام عناصر ایک دوسرے سے مختلف کیوں نہ ہوں لیکن ان کا اثر ایک دوسرے پر گہرا ہے۔

آزادی کے بعد جو فرقہ وارانہ فسادات پورے ملک میں برپا ہوئے وہ ہندوستان کی قدیم روایتوں کے لیے کلنک تھے۔تقسیم کا یہ زخم اردو ادب کے لیے بہت ہی مہلک اور روح فرسا تھا۔ان حالات میں اردو نظم نگاروں نے اپنے فرائض سے کوتاہی نہیں برتی اپنے خون دل سے صدیوں کی آبیاری کے بعد جس پودے کو انھوں نے سرسبز و شاداب بنایا تھا،اسے آگ اور خون سے بھری ہوئی ہواؤں سے مرجھاتا ہوا نہ دیکھ سکے۔چنانچہ اردو شعرا نے پوری قوت کے ساتھ ان فسادات کے خلاف آواز بلند کی۔

تقسیم کے کرب پر کئی نظمیں ہیں۔ وامق جونپوری کی ایک نظم دیکھیے۔

اب یہ پنجاب نہیں ایک حسیں خواب نہیں
اب یہ دوآب ہے سہ آب ہے پنجاب نہیں
اب یہاں وقت الگ شام الگ
ماہ و خورشید الگ نجم فلک گام الگ
اس تقسیم نے پنجاب تجھے لوٹ لیا
مرغزاروں کو تیرے کھا گئی منحوس نظر
سوہنی اب نہ مہیوال کوئی گائے گا
اب یہاں ہیر کو رانجھا نہ کبھی پائے گا
کیوں کہ ان نغموں میں عرفاں کی جھلک آتی ہے
ایسے گیتوں سے اخوت کی مہک آتی ہے

انگریزوں نے آزادی کے ساتھ ہی اپنی شاطرانہ چالوں سے ہندوستانی قوم کی صدیوں کی بنی بنائی قومی یکجہتی کو توڑنے میں کامیابی حاصل کرلی اور دونوں کو آپس میں لڑا کر خوب فائدہ اٹھایا اور ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنادیا ایسے میں اردو شعرا نے اپنے قلم کے جادو سے اس طوفان کو ٹھنڈا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔قومی یکجہتی کا وہ دھارا جو برسوں سے ہندوستانی تہذیب میں رواں دواں تھا ایک بار پھر نمودار ہوا جوش ملیح آبادی اپنی شاعری میں قومی یکجہتی کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

کوثر گنگا کو ایک مرکز پر لانے کے لیے
ایک نیا سنگم بناؤں گا زمانے کے لیے
ایک اپنی نوع کی لکھوں گا کتاب زرفشاں
ثبت ہوگا جس کی زریں جلد پر ہندوستاں

افسر میرٹھی بھی ہندوستانی عناصر کو اپنی نظموں میں اس طرح بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مذہب کچھ ہو ہندی ہیں،ہم سارے بھائی بھائی ہیں
ہندو ہیں مسلم ہیں یا سکھ ہیں یا عیسائی ہیں
پریم نے سب کو ایک کیا ہے پریم کے ہم شیدائی ہیں
بھارت نام کے عاشق ہیں ہم بھارت کے شیدائی ہیں

مخدوم محی الدین کی نظموں میں ہندوستانی عناصر، یہاں کی تہذیبی جھلکیاں جابجا دیکھنے کو ملتی ہیں۔ہندوستان کی دھرتی، مندر، مسجد، کھیت، موسم، دہقان کی تان، کوئل کی کوکو وغیرہ کی منظرکشی بڑے والہانہ طور پر کرتے ہیں۔

چاند تاروں کا بن نامی نظم میں مخدوم نے ہندوستانی عوام کی آزادی سے قبل آزادی کے بعد کی صورت حال کا جائزہ لیا ہے ان کے مطابق دونوں طرح سے ہندوستانی عوام غلام اور مظلوم رہے ہیں پہلے انگریزوں کی غلامی کرتے تھے۔اب جاگیرداروں اور افسر شاہوں کی نوکری کرتے ہیں پہلے انگریز لوٹتے تھے اب مہاجن اور کارپوریٹ سیکٹر انھیں لوٹ رہے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ گوروں کی جگہ دوسری چمڑی بلکہ اپنے ہی ملک کی چمڑی نے لے لی نظم کو دیکھیے اس وقت کے ہندوستان کو مخدوم نے کس طرح پرونے کی کوشش کی ہے۔

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مرد وزن
مستیاں ختم، مدہوشیاں ختم تھیں
ختم تھا بانکپن
رات کے جگمگاتے دہکتے بدن

یہاں سے آزادی کے بعد کا منظر امیدوں کا بھرم ٹوٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

صبح دم ایک دیوارِ غم بن گئے
رات کی شہہ رگوں کا اچھلتا لہو
جوئے خون بن گیا
کچھ امامان صد مکروفن
ان کی سانسوں میں افعی کی پھنکار تھی
ان کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں
اک کمیں گاہ سے
پھینک کر اپنی نوک زباں
خون نور سحر پی گئے

جاں نثار اختر نے خاموش آواز نامی نظم میں صفیہ کے مزار پر لکھی گئی اس نظم میں صفیہ نے اپنے محبوب زائر سے جو باتیں کی ہیں ہندوستانی ماحول کی عکاسی کرتی ہیں۔

کتنے دن میں آئے ہو ساتھی؟
میرے سوتے بھاگ جگانے
مجھ سے الگ اس ایک برس میں
کیا کیا بیتی تم نہ جانے
دیکھا کتنے تھک سے گئے ہو
کتنی تھکن آنکھوں میں گھلی ہے
آؤ تمہارے واسطے ساتھی
اب بھی میری آغوش کھلی ہے

چپ کیوں؟ کیا سوچ رہے ہو؟
آؤ سب کچھ آج بھلا دو

قبر میں مدفون محبوب اپنے زیارت کرنے والے کو ہمت دلاتی ہے اور حوصلہ بلند رکھنے کی تاکید کرتی ہے اس سے انقلابی شان نمایاں ہوتی ہے اور ہندوستانی ماحول کے خدو خال بھی ابھرتے ہیں۔

میں جو تمھارے ساتھ نہیں ہوں
دل کو مت مایوس کرو تم
تم ہو تنہا تم ہو اکیلے
ایسا کیوں محسوس کرو تم
آج ہمارے لاکھوں ساتھی
ساتھی ہمت ہار نہ جاؤ
آج کروڑوں ہاتھ بڑھیں گے
ایک ذرا تم ہاتھ بڑھاؤ
اچھا اب تو ہنس دو ساتھی
ورنہ دیکھو رو ہی پڑوں گی
جھل مل جھل مل کرنیں آئیں
مجھ کو چندن ہار پنھانے
جگمگ جگمگ تارے آئے
پھر سے میری مانگ سجانے
آئیں ہوائیں جھانجھ بجاتی

مخمور سعیدی کے یہاں بھی ایسی بہت سی نظمیں ملتی ہیں جس میں انھوں نے مناظر فطرت، سیاسی و سماجی ہیجان، معاشی زبوں حالی انسانی ناقدری اور تہذیبی روایات کی پاسداری بھی انھوں نے خوب کی ہے۔ ان کی نظم اے ارض وطن اس کی بہترین مثال ہے یہ نظم مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان، وہ شہر بھی اسی جگہ ہے، ترکمان گیٹ دہلی اسلام عقیدت اور موسم بہار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

گیتوں سے مورا انگنا جاگا
جاگ اٹھا ہے سارا عالم
جاگ اٹھی ہے رات ملن کی
آؤ زمیں کے گود میں ساجن
سیج سجی ہے آج دلہن کی

چندن ہار، مانگ سجانے، جھانجھ، جھمر، دمکا اور مورے ہاتھوں کنگنا وغیرہ ایسی ترکیبیں ہیں جن سے ہندوستانی تہذیب و ثقافت جھلکتی ہے۔ اس کے علاوہ جاں نثار اختر کی بہت سی نظمیں ہیں جس میں ہندوستانی عناصر جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔

سردار جعفری کی بہت سی نظمیں ہیں جہاں ہندوستانی عناصر کا عکس پایا جاتا ہے اور ہندوستانیت پوری طرح جلوہ گر دکھائی دیتی ہے، یہاں کے زمینی مسائل اور ماحول و تہذیب کا عکس نظر آتا ہے۔

اختر الایمان بھی آزادی کے بعد ابھرنے والے نظم گو شعرا میں اہم مقام رکھتے ہیں انھوں نے اردو نظم کو نئی بلندیوں اور نئی جہتوں سے آشنا کیا اور صنف نظم کو اعتبار و استحکام بخشا۔ ان کی نظم ڈاسنہ اسٹیشن کا مسافر

کون سا اسٹیشن ہے؟/ ڈاسنہ ہے صاحب جی
آپ کو اترنا ہے/ جی نہیں نہیں لیکن

آگے مزید لکھتے ہیں۔

لیکن اب یہی بستی/ بمبئی ہے دلی ہے
قیمتیں زمینوں کی/ اتنی بڑھ گئیں صاحب

اختر الایمان کی ایک نظم دلی کی گلیاں تین منظر میں ہندوستانی عناصر کو پیش کیا ہے۔

لال قلعے پر آزادی کا
سہ رنگا پرچم لہرایا
دلی کی گلیوں میں سب نے
آزادی کا جشن منایا
ہریجن بستی کی کٹیا
خون سے لت پت لہولہان
کٹیا جیسے ایک شمشان
گاندھی جی کی لاش پڑی ہے
آزادی کچھ دور کھڑی ہے

کشمیر اپنے حسین مناظر کے لیے مشہور و معروف ہے وہاں کی پہاڑیاں، سبزہ زار، پانی کے جھرنے نہایت دل کو لبھانے والے ہیں دور ہوتے ہوئے بھی ہمارے نظم نگاروں نے اپنی نظموں میں وادی کشمیر کا ذکر بہت اچھے انداز میں کیے ہیں نازش پرتاب گڑھی نے وادی کشمیر کو زندگی کا خواب حسین بتایا ہے۔

سلام وادی کشمیر اے عرش زمیں
ترا دیار ہے یا زندگی کا خواب حسین
جہاں حسین ہے لیکن ترا جواب نہیں
بجا کہا تجھے جس نے کہا بہشت بریں
ترے وجود سے قائم ہے ناز مصوری
ترے شہود پہ خود روح ارتقا جھومی

باقر مہدی، مغیب الرحمان، خلیل الرحمان اعظمی، شہریار اور زبیر رضوی کے یہاں بھی نظموں کی ایک کائنات ملتی ہے ان کا لہجہ اور ان کی فکری کائنات مختلف ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی نظموں میں اس معاشرے کے دکھ سکھ اور محرومیوں اور مظلومیوں کی داستان سناتے ہیں۔ زبیر رضوی ماضی کی تہذیبی میراث کے امین ہیں اور وہ گزشتہ عظمتوں کی بازیافت اپنی نظموں میں کرتے ہیں۔ ان کی نظم پرانی بات میں داستانوی فضا ملتی ہے جو قاری کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

مخمور سعیدی کے یہاں بھی ایسی بہت سی نظمیں ملتی ہیں جس میں انھوں نے مناظر فطرت، سیاسی و سماجی ہیجان، معاشی زبوں حالی انسانی ناقدری اور تہذیبی روایات کی پاسداری بھی انھوں نے خوب کی ہے۔ ان کی نظم اے ارض وطن اس کی بہترین مثال ہے یہ نظم مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان، وہ شہر بھی اسی جگہ ہے، ترکمان گیٹ دہلی اسلام عقیدت اور موسم بہار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مظفر حنفی بھی نمائندہ شاعروں میں سرفہرست نظر آتے ہیں ان کا شعری سرمایہ کافی وسیع ہے ہندوستانی تہذیب کی روح ان کی شاعری میں سموئی ہوئی ہے۔

آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو نظموں نے ہیئت کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر موضوعات اور خیالات کی ایک وسیع دنیا آباد کی ہے۔ اپنے قارئین کا ایک حلقہ پیدا کیا آزادی کے بعد جدید نظموں کے بہت سے انتخاب شائع ہوئے جو اس کی اہمیت کی دلیل ہے۔ جدید نظموں نے اردو شاعری کی تنوع اور رنگینی میں اضافہ کیا ہے گزشتہ چند برسوں میں نظم نگاروں کی جو نئی کھیپ سامنے آئی ہے اس میں بھی ہمیں کہیں نہ کہیں ہندوستانی عناصر کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ غرض مشترکہ ہندوستانی تہذیبی عناصر کی روایت کی ابتدا قدیم شعرا نے کی تھی اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے بلکہ یہ کہا جائے کہ اسے مزید آگے بڑھاتے ہوئے نئے شعرا نے اہم اور قابل فخر ثبوت پیش کیا ہے۔

■

Dr Mohd Akbar
Assitant Professor
CPDUMT,MANUU,
Hyderabad-500032
Mob.: 8373984391

سید شکیل دسنوی

سید نفیس دسنوی

بھائی جان مرحوم سے جڑی لگ بھگ نصف صدی کی خوشگوار اور قدرے کھٹی میٹھی یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ امڈا چلا آتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں اور کہاں ختم کروں۔ مرحوم کی ان یادوں کا سلسلہ تقریباً نصف صدی کو محیط ہے جو ان کے لڑکپن اور میرے بچپن سے شروع ہوتا ہے، جب انھوں نے اپنے ادبی سفر کی شروعات کی تھی اور ان شروعاتی دور کی تخلیقات اس دور کے ادب اطفال پر مبنی مقبول اور معروف رسائل مثلاً کھلونا، کلیاں، چندا ماما، پھلواری، چاند وغیرہ میں تسلسل سے شائع ہوتی رہی تھیں۔ ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے ان کی تحریروں میں صلابت فکری اور تخلیقی شعور پیدا ہوتا رہا اور پھر ان کی تخلیقات بڑوں کے رسائل مثلاً آستانہ، دین دنیا، پیامِ مشرق، شمع، روبی، بیسویں صدی، جمالستان، صبح نو وغیرہ کی زینت بننے لگیں۔ رسائل میں اپنی تخلیقات کو شامل دیکھ کر بھائی جان کو جتنی خوشی اور طمانیت ہوتی تھی اس سے کہیں زیادہ ہم چھوٹے بھائی بہنوں کے علاوہ بھیا کے قریبی دوست واحباب اور ہم جماعتوں کو ہوتی تھی۔ اس دور میں کہانیوں اور نظموں کے علاوہ قارئین کے تاثراتی خطوط بھی شائع ہوتے تھے بلکہ آج بھی شائع ہو رہے ہیں۔ ان خطوط میں بھائی جان کی تخلیقات پر مثبت تاثرات پڑھ کر ہمیں بہت خوشی ہوتی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھائی جان نے رفتہ رفتہ کہانی اور افسانہ نگاری کے علاوہ شاعری کی بھی ابتدا کی۔ پہلے ہلکی پھلکی اور بعد میں سنجیدہ غزلیں کہنے لگے، جس کا سلسلہ چار دہائیوں تک جاری رہا۔ اس کے بعد انھوں نے پوری سنجیدگی اور متانت کے ساتھ نثر نگاری کا آغاز کیا۔ ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ نقد و تحقیق کے باب میں بھی انھوں نے جو گرانقدر اضافہ کیا ہے اس کی نظیر بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔

ان کی تحریر نہایت شگفتہ اور بصیرت افروز ہوا کرتی تھی جس کے لیے شکیل نوازوں کی ایک بڑی تعداد ان کی حوصلہ افزائی میں آگے آگے رہی۔ ان کے مداحوں کے تاثراتی خطوط سیکڑوں کی تعداد میں آج بھی راقم الحروف کے پاس محفوظ ہیں۔

ان کی غزلیہ شاعری کا دور کالج کے زمانے سے شروع ہوا تھا جس کا سلسلہ مختلف شعبوں میں ملازمت کے دوران بھی جاری رہا۔ انجینئر نگ کی تعلیم اور حکومت اڈیشا کے محکمۂ انجینئر نگ میں ملازمت کے دوران بھی شاعری کرتے رہے۔ ساتھ ہی مشاعروں میں شرکت اور اخبارات ورسائل میں کلام کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

اب تک ان کے تین شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ سول انجینئر نگ کے بھاری بھرکم خشک نصاب اور شاعری جیسی صنف لطیف کے مابین مرحوم نے نہ صرف زمانۂ طالب علمی بلکہ ملازمت کے دوران بھی ایک قابل تحسین توازن برقرار رکھا، اور شوق کو تعلیم اور نوکری پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ امتیازی درجوں سے سبھی امتحانات میں کامیابی حاصل کی اور دوران ملازمت بھی پورے 33 سال اس اعتدال اور توازن کو برقرار رکھا۔

ملازمت سے سبکدوشی 1999 کے بعد مرحوم شکیل دسنوی کی ادبی زندگی کا ایک نیا باب وا ہوا مگر سبکدوشی کے عین بعد ہی عارضۂ قلب جیسی مہلک پریشانی نے گھیر لیا مگر مرحوم نے بڑی جرأت و پامردی سے اس عارضے کا مقابلہ کیا اور تحریر و تصنیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ادبی سفر کے اس پڑاؤ میں آکر مرحوم نے شاعری کے مقابلے میں نثر نگاری پر زیادہ توجہ کی اور مختلف موضوعات پر ڈھیر سارے مضامین لکھے۔ مضمون نگاری، تبصرہ نگاری، اور تنقید نگاری کے خوب جوہر دکھائے اور ان اصناف سخن میں اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا۔ 2000 سے ان کی نثری تخلیقات کا سفر خاصا کامیاب رہا اور مداحوں نے ان کی شاعری کی طرح ان کی نثری اصناف فن کو بھی خوب سراہا اور حوصلہ افزائی کی۔ اس دورانیے میں انہوں نے اپنے قریبی دوست ہم عصر اور معتبر ادیب وشاعر جناب سعید رحمانی صاحب کے ساتھ مل کر سہ ماہی ادبی 'ادبی محاذ' (پہلے 'سلسلۂ کتک') کی داغ بیل ڈالی اور اس کی اشاعت کے لیے مالی تعاون سے بھی نوازا 'ادبی محاذ' آج بھی الحمدللہ جاری اور ساری ہے۔ ادبی محاذ کے ہر شمارے میں بھائی جان کے معرکتہ الآرا اداریے بعنوان 'محاذِ اول' تواتر سے شائع ہوتے رہے اور قارئین میں مقبول بھی ہوئے۔ وہ گویا اس کے مستقل کالم نگار تھے اور ان اداریوں میں انھوں نے مروجہ موضوعات سے ہمیشہ ہٹ کر مختلف النوع موضوعات پر کچھ نئی بات کہنے کی کوشش کی تھی۔ ان اداریوں کے علاوہ انہوں نے اس دوران ان گنت ہم عصر شعرائے کرام اور ادیبوں کے شعری ونثری مجموعوں پر بڑی ذمے داری اور دیانت داری سے بے لاگ تبصرے اور تنقیدی تحریریں جو پورے ملک کے مقبول اور معتبر رسالوں کی زینت بنے جنھیں بعد میں 'اندازِ بیاں اپنا' کے عنوان سے 2021 میں شائع کروائی۔ شکیل مرحوم نے ہمیشہ قلم کاروں کی تصنیفات کا باریک بینی اور خصوصی توجہ سے مطالعہ کیا اور ان تصنیفات پر بے لاگ تبصرے بھی کیے۔ اس صنفِ سخن میں انھوں نے مروجہ اصولوں اور ضابطوں کی پاسداری کی اور حتیٰ الامکان بے جا تنقیص سے احتراز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تبصروں اور تذکروں کو ہمیشہ اہلِ ادب نے قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا اور سراہا۔ کئی

ایک کتابوں کے مقدمے، پیش لفظ اور تقریظ بھی تحریر کی جنھیں صاحبِ کتاب اور قارئین نے پسند کیا۔

یادوں کا ایک ہجوم ہے جو امڈا چلا آتا ہے۔ بیتے دنوں کی کھٹی میٹھی یادوں کا سیل رواں ہے کہ بہا جاتا ہے، اور یہی یادیں گویا میرا ادبی سرمایہ ہیں۔ بھیا مرحوم اور ہم سبھی بھائی بہنیں اردو ناولوں کے رسیا تھے۔ جاسوسی دنیا (ابنِ صفی) رومانی دنیا (شکیل جمالی) تاریخی دنیا (نسیم حجازی) طلسمی دنیا وغیرہ الغرض ہر طرح کی اردو کتابوں کا ہم بڑے ذوق وشوق سے مطالعہ کیا کرتے تھے۔ چونکہ وہ زمانہ وسائل کی کمی کا تھا، اس لیے بھیا مرحوم اور ان کے ادبی ذوق رکھنے والے احباب 'امداد باہمی' کے اصولوں کے مطابق ناولوں اور افسانوی کتابوں کا آپسی لین دین کیا کرتے تھے اور قسطوں میں گھنٹوں کے اعتبار سے شیئر کر کے پڑھا کرتے تھے۔ ضخیم ناولوں میں اے آر خاتون، فیاض علی، صادق علی سردھنوی، عبدالحلیم شرر، خان محبوب طرزی اور تیرتھ رام فیروز پوری کے ناول اور کتابیں خاصی مقبول تھیں۔ ان کتابوں کے اتنے ذخیرے جمع ہو گئے کہ بھیا مرحوم کی ٹیم نے 'اقبال لائبریری' کی تشکیل کی جس سے شہر کٹک کے محبانِ اردو کو کتابوں اور رسالوں کے مطالعے کا سنہرا موقع ملا تھا۔

شکیل بھیا مرحوم ہم سبھی بھائی بہنوں سب سے بڑے تھے اور راقم الحروف چوتھے نمبر پر ہے۔ ہم دونوں میں شروع ہی سے ذہنی قربت اور مزاج میں ہم آہنگی رہی۔ شعروادب میں مشترکہ شوق وذوق اور والدمحترم پروفیسر سید منظر حسن دسنوی سے شرف تلمذ بھی حاصل رہا۔ بھیا مرحوم نہ صرف مشفق برادر اکبر تھے بلکہ احقر کے اولین استاد محترم بھی تھے، جن کی رہنمائی اور ذہن سازی نے میرے ادبی سفر کو قدرے آسان کر دیا۔ ان کی حوصلہ افزائی اور رہ نمائی میں میرا ادبی سفر طے ہوتا رہا۔ ان کی اصلاح نے میری شعری اور نثری تخلیقات کو جلا بخشی۔ ان کی رہنمائی میں مجھے بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

میرے بھیا اپنی منصبی مصروفیات کے باوجود شعر و ادب میں اپنی تخلیقات سے اضافہ کرتے رہے۔ ان کا واسطہ ہمیشہ قرطاس وقلم سے رہا۔ سرکاری ٹور کے دوران میں نے انھیں کار کے ڈیش بورڈ سے ڈائری نکال کر نووارد اشعار کو نوٹ کرتے بھی دیکھا ہے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی یہی حال رہا تھا۔ اپنے سرہانے قلم اور ڈائری رکھا کرتے تھے۔ وہ دراصل شاعری میں 'آمد' کے قائل تھے اور آورد سے قطعی احتراز کرتے تھے۔ میں نے ایسا بھی دیکھا ہے کہ کبھی کبھی مہینوں میں وہ ایک شعر بھی نہیں لکھ پاتے تھے، اور کبھی ایک ہی دن میں کئی کئی معیاری غزلیں کہہ دیتے تھے۔ اس طرح کی شاعری کو وہ الہامی اور سچی شاعری کہا کرتے تھے۔ ان کی بیشتر غزلیں رات کے پچھلے پہر کہی ہوئی ہیں۔ غالباً اسی لیے انھوں نے کہا تھا۔

آتے ہیں جیسے غیب سے افکار نو بہ نو
مجھ کو تو شعر گوئی بھی پیغمبری لگے

ایسی بہت ساری تخلیقات کا ذکر انھوں نے مجھ سے کیا ہے جو اکثر آخرِ شب مکمل ہوئی ہیں۔ ایسی تخلیقات میں متعدد نعت پاک شامل ہیں جن کو 'آمد' کی ذیل میں رکھا جاسکتا ہے۔

اس کے قبل میں 'کھٹی میٹھی یادوں' کا ذکر کر چکا ہوں، وہ اس لیے کہ کبھی کبھی کسی ادبی نقطے پر ہم دونوں میں اختلاف رائے بھی ہو جاتا تھا مگر دائرۂ تہذیب میں رہ کر۔ میرا ماننا ہے کہ اختلاف رائے سرشتِ انسانی کا خاصہ ہے اور یہ ضروری نہیں کہ دو افراد کی رائے یکساں اور حتمی ہو مگر میں نے اپنے بڑے بھائی جو کہ میرے استاد محترم بھی تھے، ان کا احترام ہمیشہ پیش نظر رکھا اور اپنے اس شعر پر کاربند رہا۔

اختلاف رائے گر حد میں رہے تو ٹھیک ہے
ورنہ اک دن ہاتھ ملتی دوستی رہ جائے گی

ایک استاد کامل کی طرح انہوں نے مجھے شاعری کے اسرار ورموز سے روشناس کرایا۔ رسالوں اور مجلوں میں اشاعت کے طور طریقے بتائے، مشاعروں میں موقع محل اور سامعین کی پسند اور مزاج کے مطابق کلام کے انتخاب اور پیش کش کے گر بتائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کلام پڑھتے وقت اختصار کی روش اور سامعین میں احساس تشنگی چھوڑ آنے کی عادت اور شروعات میں تمہید سے گریز کرنے کی ہدایت کی۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ شاعر کا شعر ہی اس کا اصل تعارف ہے۔

شاعری کے حوالے سے مرحوم کی ہمیشہ یہی رائے رہی کہ یہ اشاروں کنایوں میں کہنے اور سمجھنے کی چیز ہے اور وہ بھی ایسی کہ 'از دل ریزد بر دل خیزد' جیسی کیفیت رکھتی ہو۔ یعنی شعر شاعر کے دل سے نکلے اور سامع کے دل میں اتر جائے۔ اشعار میں گہرائی وگیرائی کا خیال رکھتے اور اکہرے پن سے وہ ہمیشہ احتراز کرتے تھے۔ غزل کہنے کے بعد بار بار اس پر تنقیدی نظر ڈال کر اس کی نوک پلک سنوارا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ غزل کہنے کے بعد بھی اس میں مزید نکھار کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

شکیل دسنوی اپنے عہد کے ایک منفرد شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے جو حیات وکائنات کے روشن اور تاریک پہلوؤں کو بڑی خوش اسلوبی سے اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں سادگی، سلاست اور بے ساختگی ہوتی تھی جس کی بنا پر قاری اور شاعر کے درمیان ترسیل وابلاغ کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا تھا۔ غزلیہ شاعری کے لیے عموماً مترنم بحروں کو ترجیح دیتے اور الفاظ کا انتخاب اس طرح کرتے کہ وہ صوتی اعتبار سے خوش آہنگ ہوں۔ لفظ ومعنی میں گہرا ربط اور ہم آہنگی سے اشعار میں معنویت اور تہہ داری پیدا ہوتی ہے اور مضمون آفرینی اور تفکر کا عمل نمایاں طور پر کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ پیکر تراشی کا عمل ان کے اشعار کی تاثیر میں اضافہ کرتا ہے۔ موصوف کے پاس موضوعات اور تجربات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ وہ شاعری میں کسی ایک رنگ و آہنگ تک محدود ہونا پسند نہیں کرتے۔ خاص طور سے صنفِ غزل کے مختلف شیڈس (Shades) سے ان کی رغبت گہرے شعری اور تخلیقی شعور اور زبان و بیان پر گرفت اور فنی لوازمات پر ان کی گہری دسترس کا پتہ چلتا ہے۔

اپنی شاعری میں انھوں نے اردو اور ہندی الفاظ کی بڑی خوبصورت آمیزش کی ہے۔ اس نوع کے طرز بیان کو مرحوم شاد عظیم آبادی نے قدرے وسیع پیمانے پر استعمال کیا ہے۔ شکیل دسنوی نے بھی اسی فکری رویے کو بڑی کامیابی سے برتا ہے۔ اس طرز کی شاعری میں جہاں تہہ داری، ندرتِ بیان، تازگی نظر آتی ہے وہیں سادگی اور بے ساختگی بھی قاری کو اپنے سحر میں اسیر کر لیتی ہے۔ اہلِ اسلام کے پیغام مساوات اور خودداری کے جذبات میں ہندوؤں کی فراخ دلی، لطافت اور شائستگی کی دل کش آمیزش نے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی خوب آبیاری کی ہے۔

شکیل دسنوی نے اسی روش کو اور آگے بڑھاتے ہوئے اردو شاعری میں ہندی کے کومل شبدوں اور روزمرہ مستعمل ہونے والے ہندی محاورات کا برملا استعمال کر کے 'سبک اردو شاعری' کی اختراع کی ہے۔ اس طرح انھوں نے اس صنفِ غزل کو گنگا جمنی تہذیب کا نمائندہ بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی غزلوں کا یہ مخصوص رنگ و آہنگ ہندوستانی تہذیب کی اکائی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

انھوں نے اردو اور ہندی کی ملی جلی زبان میں بہت ساری غزلیں کہی ہیں جن کو لوگوں نے پسند بھی کیا ہے۔ ایسی غزلوں میں گاؤں کے رومان پرور ماحول کی تصویر کشی، گاؤں کی کنواریوں کے جذبات و احساسات کی عکاسی ان غزلوں میں بڑی خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ پنگھٹ پر گوریوں کا ہجوم، کھیت کھلیان کی منظر کشی، ہجر کی پیڑا، دلہن کی بندیا، جھومر اور چوڑیوں کی کھنکھناہٹ، ہجر و وصال کے قصے، حالاتِ حاضرہ کی عکاسی، حیاتِ انسانی کی فانی اور

ناپائیداری کا ذکر عمدہ لفظوں کا انتخاب اور دروبست‘ محاورات‘ استعارات اور تشبیہات کا برملا استعمال اور زبان میں بے انتہا سلاست وروانی‘ قافیوں اور ردیفوں کا ہنر مندانہ انتخاب اور مصرعوں کی ساخت میں چابکدستی وغیرہ جیسے اوصاف کا ایک زمانہ معترف ہے۔

مرحوم شکیل دسنوی ایک ہمہ جہت شخصیت اور بہت ساری خوبیوں کے مالک تھے۔اسکول اور کالج کی تعلیمی زندگی میں محنتی اور ذہین طالب علم کی حیثیت سے ان کی پہچان تھی۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ انھیں کھیل کود میں بھی دلچسپی تھی۔ ہاکی کے ایک اچھے کھلاڑی تھے۔اتکل یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران وہ ہاکی ٹیم کے کپتان بھی رہے۔ سرکاری منصب پر ایک انجینئر کی حیثیت سے فائز رہتے وقت انھوں نے اڈیشا کے کبھی اہم شہروں اور قصبوں میں بورویل (Borewell) کے ذریعے پینے کے صاف شفاف پانی کا معقول انتظام کیا تھا۔سب سے اہم بات یہ ہے کہ شہر کٹک کے سب سے بڑے ذیلی رہائشی مرکزسی ڈی اے کے مختلف سیکٹروں کی کامیاب پلاننگ (منصوبہ بندی) کی جس کی وجہ سے یہ علاقہ آج ایک کامیاب رہائشی علاقہ میں شمار ہوتا ہے۔

ادبی حیثیت سے بھی انھیں بلند مقام حاصل ہے۔ شعروشاعری اور نقدوتحقیق کے باب میں انھوں نے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ان کی مطبوعہ کتابوں کے نام ہیں ’زندگی اے زندگی‘ (1981)، ’تنہا تنہا‘ (1989)، ’کتنی حقیقت کتنے خواب‘ 2005)، ’دلِ ناآشنا‘ (2006)، ’طفلی ترانے‘ (پہلا ایڈیشن 2010 اور دوسرا ایڈیشن 2011) ’سانجھ بھئی چودیس‘ (خسرو رنگ شاعری 2012)، ’بازدید‘ (تبصروں پر مبنی 2011)، ’اندازِ بیاں اپنا‘ (تنقیدوتجزیہ 2011)۔ان ذاتی تخلیقات کے علاوہ تین شعری مجموعوں کی تالیف کا سہرا بھی ان کے سر جاتا ہے۔یہ مجموعے ہیں ’یادوں کی دہلیز‘ (والدمحترم پروفیسر منظر حسن دسنوی 2005)، ’وجدان‘ (محترم خالوابا مرحوم اور خسرمحترم سید شکیل دسنوی 2012) اور ’کہی ان کہی‘ (سید آصف دسنوی فرزند سید شکیل دسنوی 2012‘، نوٹ: یہ ساری تخلیقات ریختہ ڈاٹ کام پر میسر ہیں)

مرحوم کی ایک اور شاندار پیش کش ہے پیر جمالیات ڈاکٹر شکیل الرحمٰن پر بہت عمدہ اور مبسوط خاص نمبر جو ’ادبی محاذ‘ کٹک میں شائع ہو چکا ہے ڈاکٹر موصوف کی فرمائش پر یہ شمارہ بڑی جانفشانی اور لگن سے ترتیب دیا گیا تھا۔یہ خاص نمبر بہت مقبول ہوا تھا۔ اس کی اشاعت پر ڈاکٹر شکیل الرحمٰن صاحب نے احقر کی موجودگی میں فون پر بھیا مرحوم کی ادبی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کلمات تشکر ادا کیے تھے۔اس خاص نمبر کی دستاویزی حیثیت آج بھی مسلم ہے۔اس شمارے کی مانگ اتنی زیادہ تھی کہ ادارہ ان کی تکمیل سے قاصر رہا۔’ادبی محاذ‘ ملکی سطح پر اس لیے مقبول ہے کہ اس میں شامل مضامین، افسانے اور دیگر مشمولات لائق مطالعہ ہوتے ہیں۔خصوصاً اس کا چشم کشا اداریہ ’محاذ اول‘ فکر انگیز ہوتا ہے۔اس رسالے کی ادارت کے ساتھ ساتھ سعید رحمانی صاحب تذکرہ نگاری کے ذیل میں مزید دو مجلّے ’ایک شاعر اور ایک غزل‘ اور ’ایوانِ نعت‘ کے نام سے کئی برسوں تک شائع کرتے رہے ہیں۔

افتخار امام صدیقی کی ادارت میں ممبئی سے شائع ہونے والے رسالہ ’شاعر‘ کے فروری 2008 کے شمارے میں افتخار امام صدیقی صاحب نے ’فنکار اب بھی مستور ہے‘ کے عنوان کے تحت شکیل دسنوی مرحوم پر ایک سیر حاصل ادبی مکالمہ یا انٹرویو بھی شامل کیا تھا۔(یہ انٹرویو خاصا اہم اور لائق مطالعہ ہے)۔

سید شکیل دسنوی کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں یوپی اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی اور اڈیشا اردو اکادمی کے ذریعے اعزازواکرام سے نوازا جا چکا ہے۔ ان کی ایک غزل کو ان کے مداحوں نے بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے جس کا مطلع ہے۔

اتنی مدت کے بعد ملے ہو
کچھ تو دل کا حال کہو

ادب اطفال پر مبنی ان کا ایک مجموعہ ’طفلی ترانے‘ ہے۔اس میں شامل کچھ نظموں کو محکمۂ سیاحت نے چند ہل اسٹیشنوں کے بورڈ پر چسپاں کر دیا ہے۔ دھوترے (Dhotrey) نامی ہل اسٹیشن جو جلپائی گوڑی سے دس کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔وہاں کے سیاحتی مرکز میں شکیل دسنوی مرحوم کے نام کے ساتھ انگریزی زبان میں ان کی ایک نظم بھی تحریر کی ہے جو اس طرح ہے۔

بنجر ہیں، پتھریلے ہیں
اور کہیں برفیلے ہیں
دلکش ہیں شاداب بھی ہیں
خود میں سمیٹے خواب بھی ہیں

اسی طرح ایک ماہر ماحولیات شری پارس ناتھ بوس نے عالمی ماحولیات کے حوالے سے 5 جون 2021 کو ماحولیاتی آگہی کے لیے منعقدہ پروگرام میں شکیل دسنوی کے حوالے سے یہ نظم پیش کی ہے۔

دھوپ میں سایہ دار درخت
لدے پھندے پھل دار درخت
تازہ ان سے ہوا ملے
جینے کا تب مزہ ملے

(اطلاعات بشکریہ سید آصف دسنوی)

اب سب سے اہم اور آخری بات یہ ہے کہ اپنے موبائل فون سے بھائی جان مرحوم کا نام حذف کرتے وقت کس کرب ناک اذیت کا احساس ہوا اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا، انگلیاں کانپ جاتی ہیں۔اس دکھ اور رنج کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس مرحلے سے گزر چکے ہیں۔اس تکلیف دہ موضوع پر مجھے پروفیسر کرامت علی کرامت مرحوم کی نظم بعنوان ’موبائل‘ یاد آگئی جو انھوں نے اپنی حیات میں سنائی تھی، وہ نظم حسب ذیل ہے۔

موبائل میں تمھارا نام اور نمبر ہے محفوظ
مگر تم اس جگہ جا کر بسے ہو
جہاں سے لوٹ کر آتا نہیں کوئی
موبائل میں یہ نمبر رہ کے آخر فائدہ کیا ہے
یہ سوچا بارہا میں نے
یہ کیسے مان لوں میں
کہ تم میرا موبائل کال پا کر چپ رہو گے

انھیں خوش گوار اور سوگوار یادوں کے ساتھ بھائی جان مرحوم کے ان کی اپنی پسند کے چند لازوال اشعار کو پیش کر کے اجازت چاہوں گا

چھلک اٹھیں گی آنکھیں ناگہاں، جب ہم نہیں ہوں گے
بہت ڈھونڈو گے ہم کو مہرباں، جب ہم نہیں ہوں گے

عمر بھر مہمان بن کر میں یہاں ٹھہرا رہا
نام کی تختی مری تھی، یہ مکاں میرا نہ تھا
کہتے کہتے ہم فسانہ زیست کا چپ ہو گئے
بزم ہستی کی حقیقت وہ نظر آئی کہ بس
لاکھ ڈھونڈو گے مگر، مجھ کو کہاں پاؤ گے
یاد بن کر کہیں ماضی میں بکھر جاؤں گا
عمر دنیا میں کچھ اس طرح گزاری ہے شکیل
اجنبی کوئی سرِ راہ رکا ہو جیسے
کتنے ٹکڑے خوابوں کے آس پاس بکھرے ہیں
دیکھتے ہیں اک اک کو ہم بہ چشم نم تنہا
زلفِ عروسِ فن کی ملی چھاؤں میں پناہ
جب بھی غموں کی دھوپ کی حدت بڑھی شکیل

■

Syed Nafees Dasnvi
Plot No: 1481/B,
Sector-6 CDA, Bidanasi
Cuttack-753014 (Odisha)
Mob.:9437067585
Email.: nafis.desnavi@gmail.com

پروفیسر محمد اسلم خان

دہلی کی ایک نامور علمی شخصیت

مہتاب جہاں

شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کا وہ قدیم شعبہ ہے جس کا قیام یونیورسٹی کے ساتھ ہی عمل میں آیا۔ اس شعبے میں فارسی کے بہترین اساتذۂ کرام کا تقرر ہوا۔ متقدمین اساتذہ نے شعبۂ فارسی کی ترقی و بہبودی کے لیے نمایاں کارنامے انجام دیے اور شعبے کو ایک جدا شناخت دے کر ہندوستان کے دیگر فارسی کے مراکز میں مشہور و معروف کیا۔ ان قابل اساتذہ کی فہرست کافی طویل ہے، اس میں سرفہرست نام ہے پروفیسر امیر حسن عابدی کا جو شعبۂ فارسی کے پہلے صدر تھے اور بابائے فارسی کے لقب سے جانے جاتے تھے۔ ان کی شہرت آج بھی ہندوستان ہی نہیں بیرونی ممالک میں بھی فارسی زبان و ادب اور قلمی نسخوں کی بازیافت کے حوالے سے بہت زیادہ ہے۔ شعبے کے دیگر اساتذہ میں پروفیسر منظور حسن موسوی، پروفیسر بھگوت سروپ، پروفیسر مقبول احمد بیگ، پروفیسر نورالحسن انصاری، پروفیسر اظہر ودود دہلوی، پروفیسر شریف حسین قاسمی، ڈاکٹر ادریس احمد، پروفیسر نرگس جہاں، پروفیسر بلقیس فاطمہ حسینی، پروفیسر ریحانہ خاتون (پدم شری) قابلِ ذکر ہیں۔ ایک اہم نام اور ہے جو ان اسمائے گرامی میں اگر شامل نہ کیا جائے تو نامناسب ہوگا۔ وہ نام ہے پروفیسر محمد اسلم خان۔

پروفیسر محمد اسلم خان نے یکم جنوری 1939 میں کٹرہ شیخ چاند بلی ماران دہلی میں ایک علمی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ آپ کے والد پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف کے محکمے میں ملازم تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم اینگلو عربک اسکول سے ہوئی۔ بی اے، ایم اے فارسی زبان و ادب میں دہلی کالج، دہلی یونیورسٹی سے کیا۔ آپ اینگلو عربک اسکول میں بھی معلم اور اس کے بعد 1960 میں پی ایچ ڈی (ڈی لٹ) کے لیے ایران تشریف لے گئے۔ آپ کے تھیسس کا عنوان تھا 'نقش ظفرخاں احسن در عہد شاہجہاں (ظفرخاں احسن عہد شاہجہاں کے گورنر، منتظم اور نامور دانشور تھے)' استاد حسین خطیبی کی رہنمائی میں آپ نے پی ایچ ڈی مکمل کی۔

جیسے کہ اوپر بیان ہوا آپ ایران جانے سے قبل ہی اینگلو عربک اسکول میں استاد کی حیثیت سے برسرکار تھے۔ ایران سے واپسی پر دوبارہ اسی اسکول میں درس و تدریس میں مشغول ہوگئے اور 1966 تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسلم سر نے مختصر وقفے کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی میں بھی پڑھایا۔ 1970 میں پروفیسر اسلم خان کی بحالی شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی میں ہوئی جو تاحیات برقرار رہی۔ آپ نے استاد اور صدر شعبہ ان دونوں فریضوں کو بخوبی انجام دیا۔ شعبے کے استاد کے طور پر آپ ایک بہترین اور قابل استاد اور ایک محقق کے طور پر جانے جاتے تھے اور جب شعبے کے صدر بنے تو ایک فعال اور منظم صدر ثابت ہوئے اور شعبے کی ترقی میں بے حد اہم رول ادا کیا۔ آپ اعلیٰ درجے کے منتظمین میں شمار کیے جاتے آپ نے بڑے اہم موضوعات پر قومی و بین الاقوامی سمینار اور کانفرنسیں منعقد کرائیں۔ ان میں بیرونی ممالک جیسے ایران، افغانستان، تاجکستان سے اسکالرز شریک ہوا کرتے تھے۔ بے حد کامیاب سمینار اسلم خان صاحب کی قیادت میں منعقد ہوئے۔ آپ نے چونکہ ایران سے ڈی لٹ کیا تھا، اس لیے ایرانی علما سے بھی آپ کی شناسائی بہت تھی۔ آپ کا شمار ہند ایران کے نامور اساتذہ میں ہوتا ہے۔

اسی ضمن میں خود آپ کی تصانیف و تالیف کا ذکر یہاں لازم معلوم ہوتا ہے، جو درج ذیل ہیں:

(1) احوال و آثار و اشعار ظفرخاں احسن، 1976، (2) ترتیب و تصحیح تذکرہ منتخب الاشعار از مردان علی خاں مبتلا 1975، (3) مثنویات ظفرخاں احسن، 1985، (4) ترتیب و تصحیح طبقاتِ شاہ جہانی طبقہ دہم از محمد صادق خان ہمدانی، 1990، (5) انتخاب نثر معاصر فارسی، بخش فارسی دانشگاہِ دہلی، 1991، (6) ادبیات فارسی درمیان ہندوان (ترجمہ از اردو بہ فارسی)، 1992، (7) ترتیب و تصحیح طبقاتِ شاہجہانی طبقہ نہم، 1993، (8) دانشگاہِ دہلی و سہم آن در گسترش زبان و ادبیات فارسی، 1997، (9) تذکرۃ الشعراء تالیف محمد عبدالغنی، تصحیح و حواشی با اضافات لازم، 1999، (10) مدارس دین ہند (ترجمہ از اردو بہ فارسی) از دکتر قمرالدین، 1999

'انتخاب نثر معاصر فارسی' بہت عمدہ ہے، تمام جدید و معاصر فارسی ادب کے شہ پاروں کو اس کتاب میں یکجا کردیا گیا ہے۔ جدید فارسی کی داستانِ کوتاہ کے جو نمونے اس میں شامل کیے گئے ہیں وہ آپ کی اس فیلڈ میں دقیق النظری کو واضح کرتے ہیں۔

ظفرخاں احسن پر جو آپ کا پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی تھا آپ نے اس پر جس قدر کام کیا وہ لائقِ تحسین ہے۔ یہ ایک دقیق تحقیقی کام ہے، جو اس عہد کی مکمل اور عمدہ عکاسی کرتا ہے۔

شاہجہاں نامہ پر تحقیق کرکے آپ نے اس کی تصحیح کی اور آپ کے انتقال کے بعد پروفیسر جمیل الرحمٰن نے (ذاکر حسین دہلی کالج مورننگ) جو ان کے شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں 'ملخص شاہ جہان نامہ' کے عنوان سے 2009 میں یہ کتاب مرکز تحقیقات نئی دہلی نے شائع کی۔

کتابوں کے علاوہ اسلم خان کے مضامین اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں میں ہندوستان کے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ شعبۂ فارسی سے شائع ہونے والے 'مجلّہ تحقیقات فارسی' میں تقریباً پندرہ مقالے شائع ہوئے۔ جو بے حد اہم موضوعات پر تھے۔ ایران کلچر ہاؤس سے شائع ہونے والے 'قندِ پارسی' مجلّہ میں بھی آپ کے گراں قدر اور وقیع مضامین شائع ہوئے، جن کی تعداد تقریباً پندرہ سے زائد ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان سے شائع ہونے والے میگزینوں میں بھی آپ کے مضامین لگاتار شائع ہوتے رہے، جیسے حیدرآباد، کشمیر، کلکتہ، بہار، راجستھان، اعظم گڑھ، علی گڑھ وغیرہ۔ بیرونی ممالک ایران، افغانستان، پاکستان وغیرہ کے اہم اور معروف رسالوں میں محمد اسلم خاں کے مضامین شائع ہوئے۔

ایک استاد، ایک محقق ایک جگہ بیٹھ کر یا رہ کر نہ پڑھا سکتا ہے اور نہ تحقیق کرسکتا ہے، اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہی پڑتا ہے۔ اسلم صاحب نے بھی کئی علمی سفر کیے مثلاً ایران، افغانستان، بنگلہ دیش، پاکستان اور ہندوستان کے متعدد شہروں کے علمی سفر آپ نے کیے۔ دوسرے شعبوں میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں اور سمیناروں کے بھی آپ سرگرم رکن رہے۔

پروفیسر محمد اسلم خاں بآسانی انگریزی سے فارسی، فارسی سے انگریزی، اردو سے فارسی اور فارسی سے اردو زبان میں ترجمے کرسکتے تھے۔ ان کی کئی ترجمہ شدہ کتابیں

اس کی شاہد ہیں۔ اس کے علاوہ اسلم خاں صاحب کو جدید فارسی زبان وادب پر مکمل عبور حاصل تھا۔ کلاسیکل فارسی پر تو آپ کی نظر گہری تھی ہی۔ فارسی باستان (old persian) اور خطِ میخی (Cuneiform) کے بھی آپ ماہر تھے۔ فارسی بہت روانی سے بولتے تھے، خاص پرانی دہلی کے رہنے والے تھے۔ اس لیے دہلی میں ایک خاص لہجے میں بولی جانے والی اردو زبان پر بھی آپ کو مہارت حاصل تھی۔ آپ کا محبوب مشغلہ تھا اپنے طالب علموں کو فارسی میں ترجمہ سکھانا۔ یہ آپ کی تربیت کا ہی نتیجہ تھا کہ آپ کے بیشتر شاگرد آل انڈیا ریڈیو، ایران کلچر ہاؤس اور ایران ایمبیسی میں ملازم ہوئے اور کئی تو آج بھی مختلف عہدوں پر فائز ہیں۔

پروفیسر اسلم خان نے اردو کے مشہور محقق محمود شیرانی کے فردوسی پر چار مضامین کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا۔

پروفیسر محمد اسلم خاں کے خاندانی حالات پر نظر ڈالیں تو آپ کے والد داؤد خاں خاص دہلی کے رہنے والے تھے۔ یوسف زئی قبیلے سے آپ کا تعلق تھا اسی نسبت سے آپ کے نام کے ساتھ 'خان' لگتا ہے۔ ان کے والد داؤد خان وہ خوش نصیب شخص تھے جن کو خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار کے قریب دفن کے لیے جگہ ملی۔ پس ماندگان میں پہلے اہلیہ اور دو بیٹے سعود خاں اور ودود خاں حیات تھے۔ اب تینوں کا انتقال ہوگیا ہے۔ دونوں بیٹے جواں سالی میں ہی گزر گئے۔ اب صرف دو بہوئیں اور دو پوتیاں اور ایک پوتا باقی ہیں جو پرانی دہلی میں ہی مقیم ہیں۔

پروفیسر اسلم خاں کے معاصرین اور ہمکاروں کی فہرست بہت طویل ہے، سرِ فہرست جو نام آتا ہے وہ بابائے فارسی پروفیسر امیر حسن عابدی، ڈاکٹر بھگوت سروپ، ڈاکٹر منظور حسن موسوی، پروفیسر مقبول احمد، پروفیسر نورالحسن انصاری، ڈاکٹر اظہر ودود دہلوی، اور پروفیسر شریف حسین قاسمی، ان کے علاوہ ذاکر حسین دہلی کالج کے قدیم استادوں میں ڈاکٹر مرسلین، ڈاکٹر یونس جعفری اور ڈاکٹر محمد یوسف خاں بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔

پروفیسر محمد اسلم خاں ایک شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ عادات واطوار کا اگر ذکر کیا جائے تو آپ ایک محنتی، مشفق اور مہربان انسان تھے۔ خوش اخلاقی اور خوش مزاجی آپ کی طبیعت کا خاصہ تھی۔

خاکسار نے پہلی بار اسلم صاحب کو ذاکر حسین دہلی کالج کے اسٹاف روم میں ڈاکٹر مرسلین کے ساتھ محوِ گفتگو دیکھا۔ بے حد اسمارٹ کوٹ پینٹ میں ملبوس ہاتھ میں سگریٹ، بڑے شاندار لگتے تھے۔ خاکسار بی اے کے سکنڈ ایئر میں تھی۔ اسلم سر ہمیں شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی سے گرامر اور ٹرانسلیشن کی کلاسیں پڑھانے آتے تھے۔ ہم طالب علموں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا کہ ایک پروفیسر ہمیں دہلی یونیورسٹی سے پڑھانے آتے ہیں۔ کئی مہینے وہ ہمیں پڑھانے آتے رہے، پھر یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ پھر جب خاکسار نے بی اے مکمل کیا تو ایم اے کے طالب علم کے طور پر شعبہ میں داخل ہوئی۔ تب آپ شعبے کے صدر تھے۔ پہلی بار شعبے میں اور میری دوست ان کی خدمت میں پہنچیں۔ آپ بڑی شفقت سے ملے۔ کلاس میں صدر شعبہ ہونے اور بے انتہا مصروف ہونے کے باوجود ہمیشہ وقت پر پہنچتے تھے۔ خواہ صرف ایک ہی طالب علم ہو، آپ اسی کو پڑھانے میں مشغول ہو جاتے۔

فارسی شعبے میں سالہا سال سے بدھ کے دن آج تک سمینار ہوتا ہے۔ اس میں چائے سموسے سے ضیافت ہوا کرتی تھی، مگر میں نے سر کو کبھی بہت زیادہ کھاتے یا پیتے نہیں دیکھا، ہمیشہ کاموں میں مصروف رہتے، چائے یا کافی تو پیتے مگر کھانا گھر جا کر کھاتے۔ اس معاملے میں بھی وقت کے بہت پابند تھے۔ سگریٹ نوشی کے عادی تھے۔ زیادہ تر سفاری سوٹ پہنا کرتے تھے یا سفید شرٹ اور پتلون زیب تن کیا کرتے تھے۔ شاگردوں کے ساتھ آپ کا رویہ بالکل دوستوں جیسا ہوتا تھا، اکثر آپ جب کسی کو پکارتے تو برادر کہہ کر مخاطب کرتے۔ اکثر طالب علم اور اساتذہ ان کے گھر جایا کرتے تھے کیونکہ ان کا گھر شعبے سے نزدیک تھا۔ ان کی اہلیہ سب کی خاطر مدارات کرتی تھیں۔ اسلم سر خود اٹھ کر سب کی خاطر کیا کرتے تھے اور بہت محبت اور دوستانہ ماحول میں باتیں کیا کرتے۔

آپ ہمیشہ اپنے شاگردوں کو مفید مشورے دیا کرتے، ایم اے میں شعبے میں کئی طرح کے گروپ نصاب میں شامل تھے، کس کو کون سا گروپ لینا چاہیے، اس میں بھی بہت مدد کیا کرتے تھے۔ شاگرد کی لیاقت واہلیت کو مدنظر رکھ کر گروپ کو منتخب کرنے کی صلاح دیتے تھے۔ پروفیسر اسلم خاں خوش اخلاق ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بے انتہا مہذب انسان تھے، خواہ آپ کے ہمکار ہوں، شاگرد ہوں، آفس کا عملہ ہو سب کے ساتھ اخلاق وتہذیب سے پیش آتے۔ مالی امداد بھی اپنے ضرورت مند طلباء کی کیا کرتے تھے۔ آج بھی ان کے پرانے شاگرد، اسکالرز جو اب مختلف اہم عہدوں پر فائز ہو چکے ہیں، بیشتر تو سبکدوش بھی ہو چکے ہیں، مگر آپ کی اس نوعیت کی مدد کا جب ذکر کرتے ہیں تو رو بھی پڑتے ہیں۔ شعبہ کے تمام اساتذہ اور شاگردوں کو چائے ضرور پلاتے تھے، اس زمانے میں جگہ جگہ کیمپس کے اندر ہی چائے والے موجود ہوتے، پروفیسرز گھر سے آتے، اکثر کلاس میں جانے سے پہلے چائے کی دکان پر پہنچتے، سب کو چائے پلاتے تھے، جو کلاس کے لیے آتا تھا وہ استادوں کی چائے سے محروم نہیں ہوتا تھا۔ آپ اکثر اپنے کمرے میں ہی چائے منگوایا کرتے تھے، تو اکثر دو تین کپ زیادہ منگواتے تھے۔ پوچھنے پر کہتے تھے بھائی لے آؤ زیادہ چائے کیونکہ لوبان جلے گی تو مُردے تو آئیں گے ہی، یہ جملہ وہ ہنس کر بولتے تھے۔ اور ہم دیکھتے کہ واقعی چائے جیسے ہی آتی لوگ آنے لگتے، تو آپ کہتے تھے دیکھا میں ناں کہتا تھا۔

خاکسار کو اسلم سر سے بے حد عقیدت تھی، خراجِ عقیدت کے طور پر اپنی ایک اسکالر کو آپ کی حیات وخدمات پر ایم فل کا اور تحقیقی مقالہ تحریر کیا ہے۔ جس کا عنوان تھا 'احوال وآثار پروفیسر محمد اسلم خان' اس تحقیقی مقالے میں اسلم سر سے متعلق ہر چھوٹی سے چھوٹی بات بیان کردی گئی ہے تاکہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے اسلم سر پر خاطر خواہ اطلاعات ایک جگہ سے حاصل ہو جائیں۔

اس کے علاوہ شعبۂ فارسی سے شائع ہونے والے مجلّے 'تحقیقات فارسی' کی ادارت میرے حصے میں آئی تو 2021 کا شمارہ اس عظیم استاد کو معنون کیا۔ ان کی ایک خوبصورت تصویر بھی اس کے فرنٹ پیج پر شائع کی۔ اس خاکسار نے اس طرح ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

اسلم سر نے ایک کارنامہ اپنی وفات سے ایک سال پہلے یہ انجام دیا کہ شعبۂ فارسی کی تاریخ پر ایک کتاب مرتب کی جس کا عنوان ہے 'بخش فارسی دانشگاہ دہلی وہم آن دراد بیات فارسی' اس میں آپ نے 1922 سے لے کر 1999 تک کی تاریخ مفصلاً تحریر کی ہے۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ کون کون اساتذہ رہے ہیں، ان کی تالیفات، ان کا تقرر، شعبۂ فارسی کی بنیاد کب پڑی، ریسرچ اسکالرز کی مکمل اطلاعات، کون کون صدرِ شعبہ رہے، ساری تفصیلات ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کی اہم کتاب ہے، آج بھی شعبہ اس کتاب سے استفادہ کرتا ہے۔ خاکسار نے بھی اس کام کو شروع کردیا ہے اور جہاں تک اسلم سر نے اس کام کو کیا تھا، اس کے آگے سے تا بحال خاکسار نے اس کام کو مکمل کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ امید ہے جلد ہی یہ کام منظرِ عام پر آئے گا۔

اسلم صاحب اپنی صحت کا خاص خیال رکھتے تھے، وقت پر کھانا کھاتے اور ایک خاص گرو کی نگرانی میں یوگا کیا کرتے تھے، مگر سگریٹ نوشی کے عادی تھے۔ اچانک کینسر کی بیماری لاحق ہوئی اور اپنی ملازمت کی سبکدوشی سے چھ ماہ پہلے ہی 16 اگست 2000 کو داغِ مفارقت دے گئے اور علم وادب کا یہ روشن چراغ ہمیشہ کے لیے بے نور ہوگیا۔

■

Dr. Mehtab Jahan
Associate Prof. Dept of Persian
Delhi University
Delhi- 110007
Mob.:9717412946

فاروق نازکی
کی غزلیہ کائنات

مشتاق احمد گنائی

وادیِ کشمیر میں غزل کی آبیاری کرنے والے افراد کی خاصی تعداد ہے۔ یہاں ہر دور میں اردو شاعری کے حوالے سے بالعموم اور اردو غزل کے لحاظ سے بالخصوص بعض اہم شعرا نے اپنی فکری بیداری اور فنی خصوصیات کی بنا پر اپنا نام نہ صرف کشمیر بلکہ پورے اردو ادب کی دنیا میں روشن کیا ہے۔ ایسے معروف شعرا میں ایک اہم نام فاروق نازکی کا بھی ہے۔

فاروق نازکی وادیِ کشمیر کے سرحدی ضلع بانڈی پور کے دور افتادہ گاؤں مانڈر میں 1940 کو پیدا ہوئے۔ آپ ایک علم دوست اور پڑھے لکھے خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ فاروق کے والد میر غلام رسول نازکی ریاست جموں وکشمیر کے قد آور اردو اور کشمیری شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ریاست میں اُردو شاعری کی جملہ اصناف میں طبع آزمائی کرنے والے شعرا میں میر غلام رسول نازکی ایک تناور درخت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ نے وادی کے کئی نومشق شعرا کی شاعری کی اصلاح کرکے ان کے مذاق کو سنوارا ہے۔ فاروق نازکی کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی عائشہ بیگم تھا۔ موصوفہ نہایت ہی مخلص، ملنسار، ہمدرد اور جہاں دیدہ خاتون تھیں۔ فاروق نازکی نے اپنی زندگی کے ابتدائی ماہ و سال ایشیا کی سب سے بڑی جھیل ''ولر،، کے کنارے قدرت کی حسین اور خوبصورت آغوش میں اپنے گاؤں مانڈر کی کھلی فضا میں گزارے ہیں۔ اسی گاؤں کی مشک بار فضا میں فاروق نے ابتدائی تعلیم کی شروعات اپنے والدین کی نگرانی میں کی۔ فاروق کی عمر دس سال کی تھی جب وہ اپنے والدین کے ہمراہ بانڈی پورہ سے ہجرت کر کے سرینگر کے ریناواری علاقے میں رہنے کے لیے مستقل طور پر آ گئے۔ موصوف نے باقاعدہ تعلیم کا آغاز سرینگر میں ہی کیا۔ ایس۔ پی کالج سے بی۔ اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ ایم۔ اے اُردو کشمیر یونیورسٹی سے کیا۔ اس کے علاوہ فاروق نے یونیورسٹی آف برلن سے ڈپلوما ان جرنلزم (Diploma in Journalism) بھی کیا ہے۔ ایم۔ اے کے فوراً بعد فاروق نازکی ریڈیو کشمیر میں پہلے عارضی اور بعد ازاں مستقل طور پر ملازم ہو گئے۔ ریڈیو کشمیر میں مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے اسی دوران کشمیر میں دوردرشن کی سنگ بنیاد ڈالی گئی، اور فاروق نازکی ریڈیو سے دوردرشن منتقل ہو گئے۔ دوردرشن سرینگر میں نازکی نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے اس شعبے کو ترقی دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ فاروق نے دوردرشن کیندر سرینگر میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر فرائض انجام دینے کے بعد آخر میں ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

فاروق نازکی کا ابتدائی کلام وادی کے نامور رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتا رہا ہے جن میں، شیرازہ، تعمیر، پرتاب، الصفا، سرینگر ٹائمز کے علاوہ ملک کے معروف جرائد جیسے شاعر، شب خون، انتساب، آجکل، سب رس، سرسبز وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موصوف نے اُردو دنیا کو اپنا پہلا شعری گلدستہ 1989 میں 'آخری خواب سے پہلے' کی شکل میں دے دیا۔ یہ شعری مجموعہ فاروق کے فکر و فن اور انداز بیان کا بہترین آئینہ دار ثابت ہوا۔ اس مجموعے میں شامل غزلوں اور منظومات کو قارئین کے ایک وسیع حلقے نے پسند کیا اور خوب داد دی۔ 'آخری خواب سے پہلے' کے بعد فاروق نازکی کا دوسرا مجموعہ 'لفظ لفظ نوحہ' 1990 میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں حمد و نعت کے بعد غزلیات اور منظومات شامل ہیں۔ اس مجموعے کے مشمولات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاروق نازکی فن شاعری کو برتنے میں کمال رکھتے ہیں۔ وہ کسی بھی موضوع یا مضمون کو شعری سانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔ شعر و ادب کی بے لوث خدمات کے عوض فاروق کو بعض اہم اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔

جہاں تک فاروق نازکی کی غزل گوئی کا تعلق ہے۔ فاروق کی غزلوں میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ فاروق کی غزلوں میں حسن و عشق کے رنگارنگ موضوعات ان کے ابتدائی دور کے کلام میں زیادہ نظر آتے ہیں، جس کی خاص وجہ ان کا عالم شباب ہو سکتا ہے۔ وہ رومان اور حسن پرور شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں حسن و عشق کی متنوع کیفیات کا بے ساختہ اور خوبصورت اظہار ملتا ہے۔ عشق اور معاملات عشق کے اتار چڑھاؤ کی باریکیوں کا مظاہرہ فاروق نازکی جس انداز سے کرتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی عشق کی گلیوں کے راہی رہے ہیں۔ فاروق نازکی کے دل میں جب عشق کے جذبات موجزن ہوتے ہیں تو وہ ان کو شعری سانچوں میں کچھ اس طرح ڈھالتے ہیں۔

بوئے گل بن کے جب تو آ جائے
دشت میں بھی بہار اُترے گی
سر بہ سر عشق ہوں عنوان وفا دے
لوگ کہتے رہیں صدیوں وہ کہانی دے مجھکو
پردۂ ذہن پہ اُبھرے ہیں ہزاروں سورج
رات دیکھا تھا کسی پردہ نشیں کا چہرہ
جانب شہر غزالاں پھر چلی شام فراق
دشت کی بے خوبیوں کا راز داں آئے گا کیا
ملن کی رُت ہے ہتھیلی پہ چاند ٹھہرا ہے
گذر رہے شام سے پہلے ہی گاؤں آ پہنچے
آیا میرے قریب گل سیم تن کی طرح
سارا سکون صورت سیماب لے گیا
نہ پوچھ کیا تھا منظر تیری جدائی کا
فرشتہ ہوتا تو وہ بھی دہل گیا ہوتا
بُھلا دی آپ نے بھی وہ کہانی
محبت جس کے دم سے جاوداں ہے

اسی طرح محبوب کی جدائی اور ایک ساتھ گزارے حسین لمحوں کی یاد کس طرح فاروق نازکی کو ستاتی ہے اس کا اظہار بھی اپنے دلکش انداز میں یوں کرتے ہیں۔

میں سرِ دار بھی کچھ دیر ٹھہر جاؤں گا
تو نہیں آیا تو میں جاں سے گزر جاؤں گا
اب تو بس ایک ہی اُلجھن میں گرفتار ہوں میں
جو تیرے شہر سے نکلوں تو کدھر جاؤں میں
میں جس کے واسطے دنیا سے لاتعلق ہوں
وہ میری یاد میں خود بھی سُلگ رہا ہو گا

میں اُس کو بھول جاؤں
نہیں میرے بس کی بات

فاروق نازکی پیدائشی شاعر ہیں۔ وہ شاعری کو اپنے جذبات کا بہترین مظہر سمجھتے ہیں۔ روایتی اور مروجہ عشقیہ موضوعات کو اپنے مخصوص رنگ اور لفظیات میں برتنے کے علاوہ جدید عصری حسیت اور سماجی وتہذیبی زندگی کو بھی اپنی شاعری میں متشکل کرتے ہیں۔ وہ اپنے تجربات اور مشاہدات کو عصری تقاضوں کے مطابق شعری لباس پہنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔فاروق نازکی اپنے محسوسات اور واردات کو جدید غزل کے فنی لوازمات اور مخصوص لفظیات کے ساتھ کچھ اس انداز سے ترجمانی کرتے ہیں۔

میں ہوں مضطر بدن کی نگری میں
میرے حصّے میں لا مکاں لکھنا
روشنی آئے بھی کیسے مرے ماتم خانے میں
جن کے بوسیدہ دریچوں میں لگا ہے درنیا
دھوپ حالات کی سینک لی تو ہوا
میری آنکھوں سے خوابوں کا منظر الگ
چمن افسردہ گل مرجھا گئے ہیں
خزاں کی زد پہ سارا گلستان ہے
اسی بستی میں اندھے بس گئے ہیں
اسی بستی میں وافر آئینے ہیں
کانچ کے الفاظ کاغذ پر نہ رکھ
سنگ معنی کے ٹکراؤں گا میں
میں اپنی نیند کسی گھر میں کیسے بھول آتا
وہ میرے خواب کے سانچے میں ڈھل گیا ہوتا
میری بستی میں آکر
پاگل دریا ٹھہرا ہے

مذکورہ اشعار فاروق نازکی کی نئی تخلیقی اور ذہنی بالیدگی کا بہترین مظاہرہ کرتے ہیں۔ انھیں ہر طرح کا موضوع غزل کی صورت میں پیش کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔ جاوید انور فاروق نازکی کی غزل گوئی کے بارے میں اپنے تاثرات کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''فاروق نازکی کے غزلیہ اشعار کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری نہ تو کسی طے شدہ راستے پر سفر کرتی ہے اور نہ ہی کوئی شعری عقیدہ یا نظریہ ہے، جس کی فہرست کو سامنے رکھ کر شعر کہنے کے عادی ہیں۔ حالانکہ مجموعی طور پر انھوں نے اپنی شاعری کا نصب العین بھی کہیں واضح اور کہیں اشارتی طور پر بیان کر دیا ہے۔لیکن اس کی نوعیت محض شاعرانہ ہے۔ نہ کہ رجحاناتی یا تجارتی انھوں نے اپنی شاعری کے منظر نامے میں متضاد عقائد اور افکار کو اپنے ذہن اور جذباتی رویوں کے ساتھ یکساں گنجائش کے ساتھ برتا ہے۔فنی سطحوں پر نئی شعری جمالیات کے آئینے میں بھی دیکھا جائے تو ان کا اظہار بیان مختلف النوع سمتوں کا حامل ہے۔''[1]

جاوید انور کی بات سے میں پوری طرح اتفاق رکھتا ہوں کہ فاروق نازکی کے کلام کے مطالعے سے جو شعری رویہ اُبھرتا ہے۔وہ کسی رجحان یا تحریک کا ترجمان نہیں بلکہ خالص شاعرانہ اظہار ہے۔ موصوف نے اپنے ذہنی رویوں اور بلند افکار سے ایک مخصوص اور منفرد شعری کائنات تخلیق کی ہے۔ان کے انداز بیان میں تازگی اور برجستگی بدرجہ اتم موجود ہے۔ فاروق احساس کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں احساسات کا ایک لامتنہا سلسلہ دامن دل کو کھینچ لیتا ہے۔موصوف اپنے احساسات کو شعری قالب میں سمونے کے لیے کبھی کبھی موضوع اور ہیئت کے لوازمات کی پرواہ بھی نہیں کرتے ہیں۔ بقول علیم اللہ حالی:

''فاروق نازکی کی شاعری وسیع تر انسانی نفسیات کی ترجمان ہے۔ ان کے کلام میں یہ ترجمانی ایک لطیف مابعد الطبعیاتی تصور اور احساس کے وسیلے سے ہوتی ہے۔ داخلی محسوسات بسا اوقات موضوعاتی اور ہیئتی حدود اور قیود سے آزاد ہونے لگتے ہیں۔ پتھروں کے دل چیر کر احساسات کا ابلتا ہوا ایک چشمہ فاروق نازکی کے یہاں خاص طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔''[2]

فاروق نازکی کی غزل کا لہجہ نیا اور تازہ ہے۔ نازکی روایتی غزل اور کلاسیکی شاعری کا گہرا ادراک رکھنے کے ساتھ ساتھ جدید شعرا کے کلام سے بھی گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ فاروق نازکی نے صنف غزل کے ہر شعر کو نیا اور انوکھا رنگ بخشا ہے۔ معنی و مفاہیم کے لحاظ سے بھی موصوف کی غزل اُردو شاعری میں اپنی انفرادیت رکھتی ہے۔ فاروق نازکی نے اپنے مخصوص انداز بیان اور طرز ادا سے اردو غزل کو ایک نئی زندگی عطا کی ہے۔ وہ سہل اور سادہ اسلوب میں بڑی اور پیچیدہ بات کہنے پر قادر ہیں۔ سادگی سلاست اور روانی فاروق نازکی کی غزل کی منفرد خصوصیت ہیں۔ چند اشعار دیکھیے۔

موسم گل سے برف زاروں تک
سینکڑوں رنگ میں بدلتا ہوں
طوفانوں کی آمد ہے
پنچھی لوٹ رہے ہیں گھر
اک اپنی ذات تھی جو فراموش ہو گئی
باقی جو زندگی نے دیا سب یاد رہا
قسمیں، رسمیں، پاس لحاظ
ان حربوں سے کام نہ لے
زمیں تنگ ہوئی ہے جنوں کے ماروں پر
میں جانتا ہوں نوازش ہے نازنینوں کی
چاندنی آسماں سے اُترے گی
میرے آنگن سے ہو کے گزرے گی

فاروق نازکی کی غزل میں نیا لہجہ اور تازہ اسلوب ایسی خوبیاں ہیں جو انھیں اپنے معاصرین میں ممتاز مقام عطا کرنے میں معاون ہیں۔ فاروق کی غزل کا تجزیہ کرتے ہوئے محمود ہاشمی لکھتے ہیں:

''فاروق نازکی کی غزل میں بے شمار اشعار ایسے ہیں، جن کو پڑھنے کے بعد پہلا احساس تو یہ ہوتا ہے کہ نازکی نے جدید غزل کو اس منزل سے اپنا ہمنوا بنایا ہے جہاں ناصر کاظمی نے اسے چھوڑا تھا۔ دوسری بات جو نازکی کی غزل میں نمایاں ہے وہ ہے ہیئت کی نئی ساخت۔ دو متضاد اور ناگفتہ مناظر، عوامل اور مفاہیم کے درمیان ایک نئے معنوی رشتے کی تشکیل، اس مقصد کے لیے فاروق نے کلاسیکی غزل یا جدید غزل کی رسمیات کا سہارا نہیں لیا۔ بلکہ ہر شعر کو مختلف رنگوں کی تیزی سے رقص کرتی ہوئی مشعل بنایا ہے۔ جس میں ابتدائی سطح پر رنگ الگ الگ نظر آتے ہیں۔ ہر ایک لفظ اپنے منفرد رنگ کے ساتھ نمایاں ہے۔ تب اس چکر ویو سے مفاہیم کا سرچشمہ طلوع ہوتا ہے اور فاروق نازکی انتہائی انوکھے، منفرد اور ہمہ جہت شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔''[3]

فاروق نازکی اپنے تجربات اور محسوسات کو عام فہم زبان میں پیش کرنے کے روادار ہیں۔ البتہ بعض اوقات علامتی پیرائے سے بھی اپنی غزل کی تجسیم کاری کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں متعدد الفاظ علامتوں کی صورت میں بھی استعمال ہوتے ہیں شہر، دھوپ، آسماں، گھر، برف، سمندر، شجر وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن کو علامت کے طور پر استعمال کر کے فاروق نازکی نے معنی و مفاہیم کے بے شمار دفتر کھولے ہیں۔ لفظ 'گھر' فاروق کی غزلوں میں ایک کلیدی استعارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا استعمال انھوں نے اپنی متعدد غزلوں میں مختلف جگہوں پر الگ الگ معنوں میں کیا ہے۔ جس سے اس لفظ کی معنوی تہہ داری کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ جو فاروق نازکی کی فکر و احساس کے لامحدود کینوس کو آئینہ کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جو نہی بام و در جاگے
بستیوں میں گھر جاگے
دیکھتے ہی دیکھتے بستی میں لگ جاتی ہے آگ
روز لٹ جاتا ہے کوئی مسکراتا گھر یہاں
ساری بستی جلا کے رکھ دوں گا
اپنے گھر کو تو میں جلا ڈالوں

راستے کے واسطے اک جام دو
نیم شب ہے اب تو گھر جاؤں گا میں
کئی دنوں سے بات نہیں کی اپنوں سے
آج ضروری خط اپنے گھر لکھنا ہے
آپ کی تصویر تھی اخبار میں
کیا سبب ہے آپ گھر جاتے نہیں

فاروق نازکی کی مختلف غزلوں سے لیے گئے مذکورہ بالا اشعار اس امر کی طرف ہماری توجہ مرکوز کراتے ہیں، کہ فاروق نازکی کے یہاں بھی ایک عام انسان کی طرح گھر کا ایک زمینی تصور ہے جو نہ صرف سکون اور تحفظ کی علامت ہے بلکہ اس کی نیند، اس کے خواب، اس کی یادیں، اس کی تنہائی کے لطیف ترین اور کرب انگیز لمحوں کا گواہ بھی ہے۔ ان کے کلام میں گھر ایک زندہ علامت ہے۔ وہ مختلف منظروں اور بدلتے کرداروں کے ساتھ جہاں ایک طرف گھر کی محبت میں بستی جلانے سے مانع رہتے ہیں، وہیں دوسری جانب گھر کے لٹنے کا گواہ بھی بن جاتے ہیں۔ خوف اور عدم تحفظ کا ایک کربناک احساس پھیلتا ہے۔ وہ بھاگتا ہے لیکن چھوڑے ہوئے گھر کا خیال اسے دورانِ سفر بار بار آتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ خط بھی لکھنا چاہتا ہے اور اپنے اقربا سے بات بھی کرنا چاہتا ہے۔ نیم شبی اسے گھر کی طرف لے جاتی ہے لیکن گھر اور راستے کے درمیان کا منظر متقاضی ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ بھول جائے اور مدہوش رہے۔ گھر لوٹنے کی تڑپ اخبار میں تصویر کا چھپنا اور اس پر استفسار، ''کیا سبب ہے آپ گھر جاتے نہیں'' سے مختلف النوع سوالات وخدشات سر ابھارنے لگتے ہیں۔

اپنے مخصوص موضوعات کو برتنے کے لیے نازکی الفاظ کے انتخاب میں بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ فاروق کی غزلوں کی اہم اور منفرد خصوصیت ان کی دلکش ترکیب سازی ہے۔ ان کے کلام میں متعدد تراکیب ایسی ہیں جو ان کی تخلیق کردہ ہیں اور جو اُردو غزل میں ایک خوبصورت اضافہ کی اہمیت رکھتی ہیں۔ فاروق کی غزلوں میں ذو حرفی تراکیب کے علاوہ سہ حرفی ترکیبوں کا بھی بھرپور استعمال ملتا ہے۔ جو ان کے ماہر زبان ہونے پر دال ہیں۔ کلام فاروق کی چند اہم تراکیب میں غیبت یاراں، شرط سفر، اذان تکلم، خون سمندر، پاگل دریا، جنوں آثار، بدن نگری، کاسۂ چشم، دریائے خون، رخ جمیل، گرد ملال، جانبِ شہر غزالاں، شام فراق، بے صدا ساز، بوئے گل بدن، شیریں مقال، شہر نامراد، پردۂ ذہن، برگ چنار، دریائے خون خلق، سمن پاشیاں، پس دیوار شب، سینۂ برگ گل تر، گرد بیداری شب، دیوارِ بدن، گہنگارِ وفا، احمریں ہونٹ، جبین سادہ، زلف پُرشکن، پیکر وقت، منت سنگِ ملامت، سرِ دار، آبگینۂ دل، وادی گل وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔ نازکی اپنے تجربات اور محسوسات کو انہی تراکیب سے مزیّن کرتے ہیں۔ جن کی بدولت ان کی غزلوں میں معنوی تہہ داری اور غنائیت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ مذکورہ تراکیب کو فاروق کچھ اس طرح اپنے شعری تجربات میں اہم آلہ کار کے بطور بروئے کار لاتے ہیں۔

منت ِسنگ ملامت نہ اُٹھاؤں گا کبھی
کسی دیوار سے سر پھوڑ کے مر جاؤں گا
دامنِ شب پہ لرزتے ہوئے جگنو کی طرح
احمریں ہونٹ پہ ٹھہرا ہوا شعلہ رکھ
سینۂ برگ گل تر پہ نظر تھی اپنی
زندگی آگ کے سانچے میں ڈھلی کیا نہ ہوا
برگ چنار اب کے حِنا سے تہی رہے
رنگ خزاں بھی اب کے برس کچھ عجب رہا
اسی نے سب کے رگ وپے میں زہر گھول دیا
وہ ایک شخص جو شیریں مقال ٹھہرا ہے
رات لمبی ہے چلو غیبت یاراں کرلیں
شب کسی طور تو ہو جائے بسر اپنا کیا
رُخ جمیل پہ گرد ملال رہنے دو!
کسے پڑی ہے خوشامد کرے حسینوں کی

فاروق نازکی کی غزل روایت کی امانت دار اور جدید فکر کی پاسدار ہے۔ ان کے یہاں قدیم وجدید رنگ سے متشکل خوبصورت شاعری ہمارا من موہ لیتی ہے۔ انھوں نے اُردو کے کلاسیکی شعرا میر، غالب، داغ کے کلام کے مطالعے کے ساتھ ساتھ فیض، میرا جی، اختر الایمان، ناصر کاظمی، اختر شیرانی کی شاعری سے بھی اثرات قبول کیے ہیں۔ اسی جدت اور ندرت نے فاروق نازکی کی غزل کو ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا ہے جو اُن کو اردو غزل میں ایک نام ومقام سے سرفراز کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

تری مرضی نہ دے ثبات مجھے
بے یقینی سے دے نجات مجھے
عقیدت کی دیوار کچی نہیں
یہ وہ ریت ہے جو بکھرتی نہیں
پھر پہاڑوں سے اتر کر آئیں گے
راہ بھٹکے نوجوان گھر آئیں گے
دیار خواب و چشم دل فگاراں
جزیرہ نیند کا کیوں درمیاں ہے
جب تلک دم میں دم تھا میرے ساتھ تھے
اب میرے دوست رہتے ہیں اکثر الگ

فاروق صنف غزل میں اپنے تخیلات کو متصور کرنے کے لیے عموماً چھوٹی بحروں کو استعمال میں لائے ہیں۔ انھیں چھوٹی بحروں کو برتنے میں بڑا ملکہ حاصل ہے۔ مختصر اور معنی خیز الفاظ اور بحور کے علاوہ نئی زمینوں میں غزل کہنا فاروق کا خاص مشغلہ رہا ہے۔ تخلص کا استعمال بہت کم کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ دیگر شعری وسائل کا استعمال بھی موقع ومحل کی مناسبت سے بخوبی کرتے ہیں۔ نئے موضوعات کی دلکش ادائیگی، نئے الفاظ اور تراکیب کی حسین تجسیم کاری، لہجے اور اسلوب کی تازہ کاری، زبان وبیان کی شیرینی اور روانی فاروق کی غزلوں کے امتیازات ہیں۔ فاروق کی غزل گوئی پر مظفر حنفی کے تاثرات پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

''وادی کشمیر سے پہنچنے والی ایک دل دوز آواز نے مجھے نہ صرف چونکا دیا بلکہ گھنٹوں اپنی گرفت میں رکھا، یہ آواز فاروق نازکی کے مجموعۂ غزلیات نے مجھ تک پہنچائی تھی۔ تلخ ترش، شیریں، لگا جیسے کوئی سوختہ گرد وپیش کے درمیاں نوحہ کناں ہو۔ محسوس ہوا جیسے کوئی اپنی فردوس گمشدہ کی تلاش میں ہر آنے جانے والے سے استفسار کرتا ہو۔ عام طور پر چھوٹی چھوٹی بحروں لیکن نئی نئی زمینوں میں کہی گئی مختصر ان غزلوں میں، میں نے ایک ایسے جہان معنی کی سیر کی جس پر کسی دوسرے غزل گو کے قدم نہیں پڑے۔ ان کے شعروں کے مطالعے سے تخلیق کار کے روحانی کرب، نفسیاتی پیچ وتاب، علوئے فکر، ترچھی اُڑان اور شورش قلب کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اپنے اندر کے طوفان کو جس سہار اور سبھاؤ، جس ندرت اور جدت، جس مٹھاس اور رچاؤ کے ساتھ نازکی نے غزل کے پیرائے میں ڈھالا ہے اس کے نتیجے میں انتشار وشوریدگی کے پہلو ان کے کلام میں غنائیت اور تغزل بھی کم نہیں، اور یہی ان کے انفرادیت ہے۔''[4]

حواشی

1 جاوید انور، 'وادی کشمیر کے چند اہم شعرا'، ص 61
2 علیم اللہ حالی، مشمولہ، 'وادی کشمیر کے چند اہم شعرا'، ص 60
3 محمود ہاشمی، مشمولہ تحریک ادب' (وارانسی، شمارہ 14، 2012) ص 91
4 مظفر حنفی، مشمولہ 'سہ ماہی تحریک ادب' (وارانسی، شمارہ 14، 2012) ص 82

■

Dr. Mushtaq Ahmad Ganai
71,Ganaie Mohallah Samboora,Pampore
Pin:192304 Kakapora,Pulwama,Kashmir.
Mob:7006402409
Email:mushtaqalamphd87@gmail.com

محمد اسلام خاں

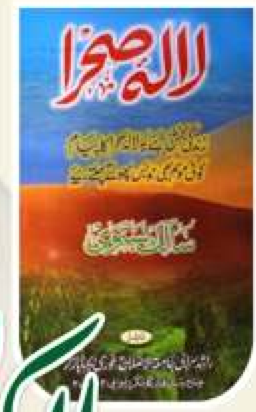

سالک بستوی کا تخلیقی سفر

بستی ریاست اترپردیش کا علمی وتہذیبی خطہ ہے۔ شعروادب کے میدان میں بھی اس ضلعے نے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ یہاں کے اہل علم نے شاعری اور نثر نگاری دونوں شعبوں میں اپنی نمایاں خدمات کے ذریعے اس علاقے کا نام روشن کیا ہے۔ ان ہی میں سے ایک معروف نام ممتاز احمد کا ہے، جنھیں ادبی حلقے میں 'سالک بستوی' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

سالک بستوی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انھیں ایک کہنہ مشق شاعر، مشہور ادیب اور عالم دین کے طور پر شناخت ملی۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، ان کا کلام پاکیزگی فکر اور مثبت سوچ سے عبارت ہے۔ ان کی شاعری تفریح طبع کی بجائے اصلاح معاشرہ اور اخلاقیات کی ترویج واشاعت کا بہترین وسیلہ بھی ہے۔

سالک بستوی متحدہ ضلع بستی اب سدھارتھ نگر گاؤں غوری میں 12اپریل 1960 کو پیدا ہوئے، جو نیپال کی سرحد سے متصل ہے۔ ان کے والد کا نام محمد علی تھا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھیں جامعہ دارالہدیٰ یوسف پور میں داخل کیا گیا، جہاں انھوں نے عربی کی پہلی جماعت تک تعلیم حاصل کی، پھر جامعہ سراج العلوم بونڈیہار چلے گئے۔ یہاں انھوں نے دوسری جماعت میں داخلہ لیا اور تعلیم کے ساتھ ساتھ شعروشاعری کا شغل بھی جاری رکھا۔ اس دوران انھیں یہاں منعقد ہونے والے مختلف پروگراموں اور شعری محفلوں میں شرکت کا موقع ملا، جس سے ان کے فکر وفن کو جلا ملی۔ سراج العلوم بونڈیہار میں انھوں نے عربی کی پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد 1980 کے آس پاس مئو (اعظم گڑھ) کے معروف تعلیمی ادارہ جامعہ عالیہ عربیہ میں انھوں نے داخلہ لیا، جو ڈومن پورہ علاقہ میں واقع ہے۔ انھیں یہاں کی علمی فضا سے مستفید ہونے کا بھرپور موقع ملا۔ مئو کا یہ محلّہ ہمیشہ سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ 'سرشاخ طوبیٰ' کے مصنف اور اردو کے مستند شاعر فضا ابن فیضی اور مجاز اعظمی یہیں کی خاک سے پروان چڑھے تھے۔ سالک بستوی کے لیے درسیات کے ساتھ ساتھ شعروشاعری کی راہیں بھی یہیں سے ہموار ہوئیں اور اخبارات ورسائل میں ان کا کلام شائع ہونے لگا اور ان کی پذیرائی ہونے لگی۔

سالک بستوی نے 1971 میں دارالہدیٰ یوسف پور (سدھارتھ نگر) میں طالب علمی کے دوران ہی شعرگوئی شروع کردی تھی اور سب سے پہلے حمد کہی۔ اس وقت ان کی عمر محض 13 سال کی تھی، جس کی اصلاح انھوں نے مشہور شاعر حیرت بستوی سے لی تھی۔ اس وقت کہے گئے ان کے حمدیہ اشعار نہ صرف شاعری کے جملہ اصول پر کھرے اترتے ہیں بلکہ معانی وتراکیب کے لحاظ سے بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ اشعار اس طرح تھے

رب عالم تو سب کا نگہبان ہے
نام تیرا رحیم اور رحمان ہے
تو نے مٹی کو بخشیں حسین صورتیں
تیری کاری گری کی عجب شان ہے

غزلیہ شاعری موصوف کو ہمیشہ عزیز رہی۔ ان کی غزلوں میں بھی حسن وعشق اور محبوب کے تذکرے کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے مسائل پوری شدت کے ساتھ بیان ہوئے۔ ذیل کے اشعار دیکھیے

موسم ہے خوشگوار فضا جلوہ بار ہے
جلوہ فگن چمن میں وہ جان بہار ہے
روتے ہیں پھوٹ پھوٹ کے تلووں کے آبلے
منزل ہے دور اور گھنا خارزار ہے
دل جلوہ زار حسن بنا بھی تو کیا ہوا
یہ تیری بے رخی ہے نظر سوگوار ہے
ہونٹوں پہ ہر کلی کے تبسم کا جشن ہے
گلشن میں جلوہ بار عروس بہار ہے
زخموں کو مل گئی ہے تری یاد کی مہک
سینہ ہے اپنا یا یہ کوئی لالہ زار ہے
سالک بچھڑ کے جب سے وہ جان چمن گئی
ہر آنکھ اشکبار ہے دل بے قرار ہے

(لالہ صحرا: سالک بستوی، ص:51)

سالک بستوی نے تقریباً سبھی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ حمد ونعت، نظم، قصیدہ، رباعی، ترانے اور مرثیہ کے علاوہ غزل کی تخلیق پر بھی انھیں پوری قدرت حاصل ہے۔ 2007 میں ان کا مجموعہ کلام 'لالہ صحرا' منظر عام پر آیا، جس میں خالص غزلیہ اشعار شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا ایک اور شعری مجموعہ 'کائنات دل' بھی شائع ہوکر عوام میں اپنی مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ ان کی زبان میں سلاست وروانی وشیفتگی پائی جاتی ہے۔ بطور نمونہ ایک غزل کے اشعار ملاحظہ کیجیے

غم یہ نہیں کہ میل کا پتھر نہیں ملا
کوئی ہماری راہ میں رہبر نہیں ملا
نکلا جوان کی بزم سے میں جھومتے ہوئے
اپنی گلی میں اپنا مجھے گھر نہیں ملا
بہتا رہا میں موج میں اپنی ہی چار سو
دریا ہوں ایسا جس کو سمندر نہیں ملا

جنت کے سبز باغ نہ واعظ دکھا ہمیں
گھر کوئی میکدے کے برابر نہیں ملا
گو میرے قتل میں مرے بھائی کا ہاتھ تھا
پر اس کی آستین میں خنجر نہیں ملا
کمزوریاں خود اپنے ہی اندر ملیں مجھے
سالک جہاں میں کوئی بھی کمتر نہیں ملا

(لالہ صحرا، سالک بستوی، ص:25، ایڈیشن:2007)

ایک اور غزل کے اشعار دیکھیں:

ہوا مغرب سے کچھ ایسی چلی آہستہ آہستہ
متاعِ دین ودانش لٹ گئی آہستہ آہستہ
تمنا یہ ہے صبحِ زندگی سے پیار اب کرلوں
یہ شمعِ زندگی بجھنے لگی آہستہ آہستہ
اندھیرے دھیرے دھیرے جہل کے روپوش ہوتے ہیں
بڑھاتی ہے قدم جب آگہی آہستہ آہستہ
تجلی جب ضعیفی کی اداکاری کی ہنستی ہے
مٹاتی ہے سیاہی زلف کی آہستہ آہستہ
گناہوں کے اندھیرے آنسوؤں میں خون کے ڈوبے
جگر میں شمعِ توبہ جب جلی آہستہ آہستہ
کوئی جب چپکے چپکے جام مے کو منہ لگاتا ہے
لٹا دیتا ہے عزت آدمی آہستہ آہستہ
ہوا عزمِ سفر آراستہ جب قلبِ سالک میں
مرے نزدیک منزل آگئی آہستہ آہستہ

سالک بستوی کی شاعری میں اسلامی موضوعات کے ساتھ ساتھ جدید دور کے بیشتر مضامین نظم ہوئے ہیں، خاص طور پر محبت، بھائی چارہ، ہم آہنگی وحب الوطنی ان کی شاعری میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ملک ودنیا میں پیش آنے والے واقعات وحالات پر بھی ان کی گہری نظر تھی، وہ اپنی شاعری میں حالاتِ حاضرہ پر نہ صرف تبصرہ کرتے ہیں بلکہ سیاسی، سماجی برائیوں اور خرابیوں پر جم کر چوٹ کرتے ہیں۔

کاش اربابِ وطن تم نے وطن کی خاطر
مہر واخلاص کا ماحول بنایا ہوتا
خار حصہ مرا تو خار سہی
فکر یہ ہے کہ گلستاں نہ جلے
آشیاں مرکزِ شرار سہی
دل تو سوزِ الم سے روشن ہے

(لالہ صحرا، سالک بستوی، ص:60)

سالک بستوی کا تعلق ترقی پسندی سے کبھی نہیں رہا، مگر ان کی شاعری میں ترقی پسند رجحانات کے عناصر ہمیں کثرت سے ملتے ہیں۔ وہ روایتوں کے امین تو ہیں مگر عصری تقاضوں سے چشم پوشی نہیں کرتے۔ شعر دیکھیے۔

میں چل پڑا تو چلنے لگی نبضِ کائنات
میں رک گیا تو جیسے سمندر ٹھہر گیا
جو شورشِ غم انساں سمجھ نہیں پاتے
مزاجِ گردشِ دوراں سمجھ نہیں پاتے

سالک بستوی برجستہ شعر گوئی میں بھی کمال رکھتے ہیں، کسی کی وفات پر فوری تعزیتی کلام کہہ دینا اور طلبائے فارغین کے لیے الوداعی پیغام لکھنا ان کا معمول تھا۔ اس کے علاوہ نہ جانے کتنے مدارس کے ترانے بھی ان ہی کے قلم کے مرہونِ منت ہیں۔ غرض کہ مشرقی اتر پردیش کے عصر حاضر کے شعرا میں سالک بستوی کی اہمیت مسلم ہے۔

سالک بستوی نے نظم ونثر دونوں میں اپنے تخلیقی جوہر دکھائے ہیں۔ نثری ادب میں بھی ان کی تخلیقات کم قابلِ رشک نہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور متانت کے علاوہ زبان وبیان کی صفائی اور روزمرہ کا استعمال بھی کافی عمدگی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ غزل کی تعریف میں ان کی ایک تحریر کا ایک اقتباس دیکھیے:

''اصناف اردو شعریات میں جو مقام ومرتبہ اور قدر ومنزلت غزل کو حاصل ہے، وہ کسی دوسری صنف کو نہیں ملی ہے۔ دورانِ سفر غزل نے برے دن بھی دیکھے ہیں اسے نیم وحشی صنف بھی کہا گیا ہے اور جوشِ غضب میں اسے قابلِ گردن زدنی بھی قرار دیا گیا مگر کوئی اس کا بال بھی بیکا نہ کرسکا۔ اردو شاعری کی آبرو غزل آج بھی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نہ صرف زندہ وسلامت ہے بلکہ اس کا حسن وجمال پہلے سے زیادہ دوبالا اور دوآتشہ ہو گیا ہے۔ عصرِ حاضر کی غزل کے دامن میں آج جتنی وسعت پیدا ہوچکی ہے اتنی کبھی نہ تھی، آج ہر طرح کے خیالات و افکار اور مضامین وموضوعات کو بڑی خوش اسلوبی اور کامیابی کے ساتھ برتا جارہا ہے۔ غزل اردو ادب کے ارتقائی سفر کے ہر موڑ پر ایک خاص منظر بن کر ابھری ہے۔ آج نئی غزل بھی اپنے تازہ آب ورنگ اور توانا فکر واحساس کے نو وارد اور آنے والے موسموں کی آہٹوں کا پتہ دیتی ہے۔''

(کلیات سراجی، پیش گفتار: سالک بستوی، ص:12)

غزل یقیناً مشکل فن بھی ہے اور آسان بھی۔ آسان اتنا کہ نوآموز شاعر پہلے اسی کے ذریعے شعر گوئی کا آغاز کرتا ہے اور مشکل بھی اتنا کہ غزل ہی کسی شاعر کے تخلیقی فن کو جانچنے کا پیمانہ ٹھہرتی ہے۔ اسی بات کو انھوں نے کیا اچھے انداز میں کہنے کی کوشش کی ہے:

''غزل ویسے تو آسان صنف نظر آتی ہے مبتدی بھی جب اپنی شاعری کا آغاز کرتا ہے تو غزل ہی سے کرتا ہے جبکہ اچھی اور بہتر شاعری کے لیے غزل ایک مشکل ترین صنف ہے جو عرق ریزی، دماغ سوزی اور مسلسل غور وفکر کی متقاضی ہے مطالعے، مشاہدے، جذبے اور فکر وشعور کے بغیر کوئی اچھا شعر تخلیق کرنا دیوانے کے خواب جیسا ہے۔''

(کلیات سراجی، پیش گفتار: سالک بستوی، ص:13-12)

سالک بستوی کا شعری سفر تقریباً چار دہائیوں سے بھی زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ اس دوران وہ اپنے تصنیفی وتالیفی کاموں میں مصروف رہے اور ان کی 30 سے زائد شعری ونثری تصانیف منظر عام پر آئیں۔ ان کے شعری مجموعے میں نکہت اسلام، نغمہ دلنواز، جرمِ تبسم (غزلوں کا مجموعہ)، سوز دروں، کائنات دل، قوس قزح، متاع ہنر، سخن معتبر، بساط فکر، فردوس نظر، ارمغان اسلام، صہبائے اسلام، تنویر حرم اور لالہ صحرا قابل ذکر ہیں۔

سالک بستوی کی شاعری صوبہ اتر پردیش تک محدود نہیں رہی، بلکہ پورے ملک میں پڑھی اور پسند کی گئی۔ شاعری کے باب میں تو ان کی شہرت عام ہے ہی لیکن وہ مشاعروں کی روایت کے امین بھی تصور کیے جاتے ہیں۔ مشاعرے کی تاریخ ان کے تذکرہ کے بغیر نامکمل سمجھی جائے گی۔

ادبی سرگرمیوں کے علاوہ رفاہی کاموں سے بھی موصوف کو دلچسپی رہی۔ سالک بستوی نے زندگی کے بیشتر ایام دہلی، ممبئی، گجرات، ناگپور، سورت وغیرہ میں درس وتدریس میں گزارے، مگر پھر وہ اپنے وطن غوری (سدھارتھ نگر) میں واپس آگئے اور اپنے بھائی راشد احمد سراجی کے ساتھ مل کر 'جامعۃ الاصلاح' کی ترقی میں مصروف ہوگئے، جس کی بنیاد انھوں نے 2 اپریل 1993 میں رکھی تھی۔ ان کا تدریسی سفر کم وبیش 50 برسوں پر محیط رہا جہاں انھوں نے اپنے فرائض بحسن وخوبی انجام دیے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں عوام میں بڑی مقبولیت حاصل رہی اور ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ سالک بستوی اسی مدرسے کے کسی کام سے 3 فروری 2024 کو کہیں جارہے تھے کہ نیپال میں ایک سڑک حادثے کا شکار ہوگئے اور اسی میں ان کی موت ہوگئی۔ اس طرح شعروادب کا درخشندہ ستارہ غروب ہوگیا۔ سالک بستوی کی شاعری کو ادبی دنیا کبھی فراموش نہیں کرسکے گی۔ جب بھی مشرقی اتر پردیش کی ادبی تاریخ مرتب کی جائے گی یا ضلع بستی کے شعری منظر نامے کا ذکر ہوگا، سالک بستوی کا ذکر ضرور آئے گا۔

■

Mohd Islam Khan
D-64, 3rd Floor, Thokar No.8
Behind Taj Apartment, Shaheen Bagh
Jamia Nagar, New Delhi-110025
Mob.:9311440552
mislamkhan.du@gmail.com

عزادار ساجد

ماہر عروض ولغت

ڈاکٹر شعور اعظمی سے گفتگو

”
ممبئی میں مقیم شاعر وادیب، ماہر عروض ڈاکٹر سید قاسم مہدی شعور اعظمی صاحب اردو زبان وادب کے حوالے سے ایک مستند ومعتبر شخصیت ہیں۔ ان کا آبائی وطن موضع چھانواں ضلع اعظم گڑھ ہے، جو کیفی اعظمی کے وطن موضع مجواں کے قریب ہے۔ لیکن وہ مستقل 65 برسوں سے عروس البلاد ممبئی میں رہ کر علم وادب کے ساتھ طبابت سے بھی وابستہ رہ کر خدمت کر رہے ہیں۔ شہرِ ممبئی کے بیشتر نوجوان اور نئی نسل کے شعرا عروض، اصلاح زبان اور دیگر ادبی حوالے سے ان کی طرف رجوع کرتے ہیں اور آپ انھیں مطمئن کر دیتے ہیں۔ علم عروض پر آپ کی دسترس کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہیں کہ آپ کی تصنیف 'شعور عروض' و'فرہنگ شعور' ممبئی یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔ گزشتہ مہینے وہ اپنے وطن چھانواں اعظم گڑھ تشریف لائے اور حقیر نے ان کی خدمت میں حاضری دی۔ پیشِ خدمت ہے اس خوبصورت موقع پر خاکسار عزادار حسین ساجد جلال پوری کی ان سے خاص گفتگو۔
“

عزادار ساجد: آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

شعور اعظمی: میرا تاریخی نام 'سید کلیم اختر' ہے۔ اس طرح 1374ھ سنہ پیدائش ہے۔ میں اپنے ننھیال موضع احد پور ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوا۔

ع س: آپ کا خاندانی پس منظر کیا ہے، اس پر روشنی ڈالیے۔

ش ا: میرا تعلق اثنا عشری سادات رضویہ کے ایک زمیندار گھرانے سے ہے۔ جدِّ اعلیٰ سید سلیمان نیشاپوری (جن کی قبر موضع 'اترورا' میں ہے۔

سیّد سلیمان سے میرے ابا مرحوم کے پردادا میر مدد علی تک کا شجرہ نسب اکبر پور کی تحصیل کا تصدیق کردہ ہے۔ پدرم سلطان بود کیا کہوں، عہدِ حاضر میں پروفیسر مجاور حسین رضوی، ڈاکٹر پیام اعظمی، سفیر اعظمی، منہال سلمہ، قیصر سلمہ ایسی نامور ہستیاں ہیں۔ ماضی قریب میں مرحوم سجاد باقر لاہوری، فہیم اعظمی، زوّار حسین ندیم سبطِ حسن ایسی مشہور ہستیاں گزری ہیں۔ والد مرحوم مہدی اعظمی کے شعری مجموعے سرمایۂ عقبیٰ (قصائد)، سرمایۂ بکا (نوحے اور سلام)، سرمایۂ تغزل (غزلیات)، سرمایۂ تخیل (قطعات تاریخ و رباعیات)، شائع ہو چکے ہیں۔ 2005 کے بعد کے قصائد اور 2013 کے بعد کے سلام اور قطعات تاریخ 'سرمایۂ نجات' کے نام سے آمادۂ اشاعت میں اس کے دیباچے میں خاندانی پسِ منظر تفصیل سے لکھا ہے۔

ع س: آپ کی تعلیم وتربیت کہاں ہوئی

ش ا: خاندانی مولوی مرزا اکبر مرحوم نے قاعدہ بغدادی پڑھایا۔ 7 سال کی عمر میں ممبئی آ گیا۔ یعقوب اسٹریٹ میونسپل اسکول میں 1957 یکم ستمبر تاریخ ولادت درج کروائی گئی۔ چونکہ ابا مرحوم مدنپورہ میونسپل اسکول میں ٹیچر تھے اس لیے تیسرے درجے میں مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ ساتویں درجے میں ناگپاڑہ میونسپل اسکول میں داخلہ ہوا کیونکہ جے جے ہاسپٹل کے چوراہے سے مدنپورہ کافی دور تھا۔ آٹھویں درجے میں احمد سیلر ہائی اسکول میں داخلہ ہوا۔ وہاں سے 1972 میں گیارہویں جماعت (S.S.C) کرنے کے بعد K.C. کالج بمبئی میں F.Y.SC. میں داخلہ لیا۔ Maths کا پرچہ اتنا سخت تھا کہ اس کی گونج اسمبلی میں بھی سنائی دی تقریباً 800 فیل ہونے والے پاس کیے گئے مگر میرا نمبر نہیں لگا۔

اسی دوران طبیہ کالج بمبئی میں .D.U.MS میں داخلہ ہو گیا اور 1978 میں سند بھی مل گئی۔ والد مرحوم مجلسوں اور محفلوں میں لازماً اور غزلیہ نشستوں میں کبھی کبھار اپنے ساتھ لے جاتے تھے یہی میری تربیت گاہیں تھیں۔ ایک خاص بات اور ہے کہ گرمیوں کی چھٹی یا

دیوالی کی چھٹیوں میں دادی دادا سے ملنے چماواں (آبائی گاؤں) جاتا تھا۔ وہاں سید ناظر حسین عرف نجو (عمر میں ابا کے آس پاس لیکن رشتے میں بھائی) مجھ سے بیت بازی کیا کرتے تھے۔ اکثر میرا دل بڑھانے کے لیے ہار جاتے تھے۔ یہ بھی ایک اندازِ تربیت تھا۔

ع س: -آپ کے ادبی سفر کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی؟

ش ا: موزونیٔ طبع تو فطری ہوتی ہے مختلف عوامل سے اس پر نکھار آتا ہے۔ طبیہ کالج بمبئی میں علی گڑھ کے اساتذہ تھے اس لیے ادبی ماحول بھی تھا۔ غالباً 1975 کا واقعہ ہے کہ مشہور شاعر مرحوم مظفر شاہجہاں پوری علاج کے لیے اسپتال میں داخل ہوئے۔ مجھ ایسے کچھ شعر پسند طلبہ نے خاص طور سے عیادت و خدمت کی۔ انھوں نے اس وقت کے پرنسپل ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا مرحوم سے ہم لوگوں کی تعریف کی ماہر امراض اطفال ڈاکٹر ملک مرحوم نے ایک مشاعرے کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔ ڈاکٹر مرزا انور بیگ (خدا انھیں عمرِ خضر عطا فرمائے) نے فراق گورکھپوری کا مصرع 'تجھے قریب سے دیکھا تو آنکھ بھر آئی' طرح کے لیے دے دیا۔ جتنے طلبہ شعر کہہ لیتے تھے سب بے سرے تھے اس لیے کچھ خوش گلو طلبہ کو اشعار کہہ کے دیے گئے اور ایک اچھا مشاعرہ ہوا۔ سند یافتہ طبیب ہونے تک شعر گوئی پر پابندی تھی اس لیے باقاعدہ ادبی سفر کی ابتدا 1979 کہی جا سکتی ہے۔ اسی وقت میں نے تخلص بھی رکھا۔

ع س: آپ کی پہلی تخلیق کسی رسالے میں شائع ہوئی؟

ش ا: تخلیق تو کیا کسی اخبار میں کوئی مراسلہ بھی میں نے نہیں بھیجا۔ 'شعور عروض' لکھی جو آج ممبئی یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کے بعد 'اردو چینل' (مدیر قمر صدیقی) میں کئی مضامین شائع ہوئے۔ کراچی کے رسالے نگار اور ماہنامہ شاعر ممبئی یونیورسٹی کے جریدے میں بھی کئی مضامین شائع ہوئے۔ جب تک کسی نے مجھے مضمون لکھنے کی فرمائش نہیں کی میں نے کسی رسالے کو غزل یا مضمون خود نہیں بھیجا۔ ممبئی سے ظہیر انصاری کی ادارت میں شائع ہونے والے 'تحریرِ نو' میں اردو لسانی تاریخ کے تعلق سے کئی قسطیں شائع ہوئیں لیکن ذہنی مفاہمت نہ ہونے کی وجہ سے 12-10 قسطوں کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ مرحوم ضمیر کاظمی نے 'وقت مشن' نامی اخبار میں مجھ پر ایک مضمون شائع کیا۔ معاصرِ محترم الیاس شوقی نے میری کچھ غزلیں شائع کیں۔

ع س: اب تک آپ نے کتنی کتابیں لکھی ہیں یا ترتیب دی ہیں۔

ش ا: میں طبیہ کالج میگزین کا مدیر تھا۔ اسے آپ نقشِ اوّل کہہ سکتے ہیں، سرمایۂ عقبیٰ (قصائد مہدی اعظمی)، سرمایۂ تغزل، سرمایۂ تخیل، سرمایۂ بکا، سرمایۂ نجات (2005 کے بعد کا کلام)

تصنیفات: شعور عروض، فرہنگ شعور، ترکی بہ ترکی، شعور مدحت (ہر بحر میں کم از کم ایک نعت)، شعور مودّت (قصائدِ فاطمہ)

عنقریب شائع ہونے والی: شعور حجت، شعور ولایت، شعور تنقید، شعور اللغات (وہ الفاظ جن کی سند صرف مرثیوں سے ملتی ہے)

ع س: جہاں تک ہم نے محسوس کیا۔ آپ نے ہمیشہ عام راستوں سے ہٹ کر دشوار گزار راہوں کا سفر اختیار کیا اور علمِ عروض ایسی خشک اور سنگلاخ وادی کے مسافر بنے تو یہ دلچسپی آپ کو کب اور کیسے ہوئی؟

ش ا: میرے روایتی طالب علمی کے زمانے میں 10 ویں جماعت ہی سے مفعولن، فاعلن، مفاعیلن وغیرہ پڑھائے جاتے تھے۔ والد مرحوم نے نظامِ حرکات وسکونات اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ سونے پر سہاگا بنی پرتو صاحب کی خدمت میں حاضری۔

1982 میں پرتو صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد لوگوں نے مجھ سے استفسار شروع کیا۔ میں نے اپنی جہالت کم کرنے کی کوشش شد و مد سے شروع کی۔ معیار الاشعار، حدائق البلاغہ، عروض سیفی، شجرۃ العروض، محیط الدائرہ، امین الکافی وغیرہ کتابیں بہت غور سے پڑھیں۔ اردو کتابوں میں بحر الفصاحت، چراغ سخن، قواعد العروض، مقیاس الاشعار وغیرہ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، مطالعے کے دوران اہم نکات لکھتا جاتا تھا نتیجتاً 'شعور عروض' وجود میں آئی مولانا ندیم اصغر سلمہ نے 'فرہنگ عروض فارسی' نامی کتاب بھیجی جسے دیکھ کر 'فرہنگ شعور' مرتب کرنے کا خیال آیا۔

ع س: آپ کی کتاب 'شعور عروض' کی اہل ادب کے درمیان کافی پذیرائی ہوئی، اس پر کیا ارشاد فرمائیں گے۔

ش ا: میں نے جس طرح عروض کو سمجھا اسی طرح سمجھانے کی کوشش کی کہیں کہیں مزاحیہ انداز بھی اختیار کیا تا کہ قارئین اکتاہٹ کا شکار نہ ہوں۔

اختلافی مسائل میں، میں نے فتویٰ نہیں دیا بلکہ سارے اختلافات ایک جگہ لکھ کے ان کا تجزیہ کیا اور یہ لکھا کہ میں نے کسی نظریے کو کیوں قبول کیا۔

ع س: کیا آپ کی کوئی کتاب نصاب میں شامل ہے۔

ش ا: جی ہاں 'شعور عروض' بمبئی یونیورسٹی کے B.A میں شامل ہے۔ 'فرہنگ شعور' M.A میں ہے۔

ع س: شہر ممبئی اردو ادب کا اہم مرکز رہا ہے۔ ترقی پسندوں سے فلمی شاعروں تک اس میں سرفہرست رہے ہیں کیا آج بھی وہ سرگرمیاں نظر آتی ہیں۔

ش ا: فی زمانہ بمبئی کے شعرا اور ادبا کسی مخصوص ادبی روش سے وابستہ نہیں ہیں۔ انھوں نے ہر تحریک کی خوبیاں اپنائی ہیں، اچھی شاعری کر رہے ہیں۔

ع س: کیا آپ کو سرکاری اور غیر سرکاری اداروں سے انعام واکرام ملے ہیں؟

ش ا: جی ہاں۔ سرکاری اداروں میں مہاراشٹر اردو اکیڈمی نے 2 بار، یوپی اردو اکیڈمی نے 2 بار اور فخر الدین علی احمد کمیٹی نے ایک بار مختلف کتابوں پر اعزاز وانعام دیے ہیں۔

ع س: طبّی خدمات کی مصروف زندگی میں آپ ادب کے لیے کیسے وقت نکال لیتے ہیں۔

ش ا: بہتا ہوا پانی چٹانوں میں بھی راہ بنا لیتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان اپنے شوق پورے کر ہی لیتا ہے۔

ع س: اپنی زندگی کا کوئی دلچسپ واقعہ سنائیں۔

ش ا: سب ہے کہنے کا کہوں کم کر کے افسانے سے کیا۔

ع س: کلیم الدین احمد کے جواب میں 'ترکی بہ ترکی' لکھنے کا خیال کیوں آیا۔

ش ا: آپ کلیم الدین احمد کی 'میر انیس' پڑھیے تو معلوم ہو جائے گا، کہ یہ تنقید نہیں تنقیص ہے۔ تنقیص بھی انتہائی گھٹیا درجے کی۔ میں نے اپنی کتاب کے سرورق پر لکھا ہے 'میر انیس' کو جنسی جنونی کہنے والے کلیم الدین احمد۔ بات

کلیم الدین احمد کو ان کے ابا عظیم الدین احمد کے علاوہ کوئی شاعر نظر نہیں آتا تھا۔ (ملاحظہ فرمائیں دیباچہ ُگل نغمہ) اس لیے میر، غالب، اقبال کی طرح میر انیس بھی شاعر نہ تھے۔ ان کے نظریات 1942 سے 1984 تک کئی بار بدلے۔

یہیں ختم نہیں ہوتی وہ لکھتے ہیں کہ یہ شعوری گتھیاں انھیں اپنے پردادا سے ملی تھیں یعنی کہ ُمیر ضاحک‘ (معاصرِ سودا) سے۔ کتاب کی ابتدا ہی اس طرح ہوتی ہے کہ میر انیس شاعر نہیں خطیب تھے۔ میر انیس مصائب کے تذکرے سے جنسی لذت حاصل کرتے تھے۔ ان کے اشعار میں کچلی ہوئی جنسیت کی غمازی ہے۔ وہ زخموں اور خون کے تذکرے سے جنسی لذت حاصل کرتے ہیں (یہ اعتراض تو ہر مرثیہ گو پر ہے)۔ وہ Sadist تھے۔ چونکہ کلیم الدین احمد کو ان کے ابا عظیم الدین احمد کے علاوہ کوئی شاعر نظر نہیں آتا تھا۔ (ملاحظہ فرمائیں دیباچہ ُگل نغمہ) اس لیے میر، غالب، اقبال کی طرح میر انیس بھی شاعر نہ تھے۔ ان کے نظریات 1942 سے 1984 تک کئی بار بدلے۔

1984 میں کلیم الدین احمد کے انتقال کے ساتھ کتاب کا قصہ بھی ختم ہو جاتا لیکن ریختہ والوں نے اسے پھر اپ لوڈ کر دیا۔ نئی نسلیں تو کلیم الدین احمد کے نام سے مرعوب ہو کر ان کے مزخرفات کو مستند مان لیں گی اس لیے اس کا جواب دینا میں نے واجب سمجھا۔ کسی بھی نقاد کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ مجھ سے پہلے سید محمد عقیل اور فضلِ امام مرحومین نے چند اعتراضات کے جواب دیے کوئی تفصیلی جواب نظر نہیں آیا۔ ُترکی بہ ترکی‘ کی خصوصیت یہ ہے کہ زیادہ تر جوابات خود کلیم الدین احمد کی کتابوں سے دیے گئے ہیں ان کی تحلیل نفسی (Psyco Analysis) اِن کی تقریباً 1500 صفحات پر پھیلی سوانح عمری کی روشنی میں کی ہے۔

ع س: آپ کی ادبی خدمات مشاہیر ادب تسلیم کرتے ہیں کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

ش ا: مشاہیرِ ادب کو پڑھنے کا وقت کہاں ملتا ہے وہ تو اخلاقاً ہوں ہاں کرتے رہتے ہیں۔ یہی صورتِ حال میرے ساتھ بھی ہے ہاں طلبہ کے استفساری ٹیلیفون سے پتا چلتا ہے کہ وہ میری قدر کرتے ہیں۔ یوں بھی بقول غالب ُایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے‘

ع س: آپ کا تعلق اعظم گڑھ اور ممبئی دونوں سے ہے ان کی ادبی سرگرمیوں کے متعلق کچھ فرمائیں۔

ش ا: میں بچپن ہی میں بمبئی آ گیا تھا صرف اسکول کی چھٹیوں میں وطن جانا ہوتا ہے، اس لیے وہاں کے بارے میں کوئی چشم دید سرگرمی بیان نہیں کر سکتا۔ بمبئی میں مختلف اداروں کی ماہانہ شعری نشستیں ہوتی تھیں جن کی روداد اخباروں میں چھپا کرتی تھی۔ اخباروں میں دقیق ورقیق ہر طرح کی ادبی بحثیں بھی ہوتی تھیں۔ صابو صدیق گراؤنڈ میں انجمن اسلام، انجمن خیر الاسلام، مفید الیتمیٰ اور دوسرے اداروں کے 5،6 سالانہ مشاعرے ہوتے تھے۔ مختلف خانقاہوں اور مزاروں کے عرس کے موقع پر بھی مشاعرے ہوتے تھے۔ منقبتی نشستیں اور بڑے پیمانے کی محفلیں بھی ہوتی تھی صوفیانہ قوالیاں دلچسپی کا باعث تھیں۔ آج کچھ لوگوں کو تعجب ہوگا کہ اس زمانے کے کشکول بردار فقیر مرادآبادی پیالوں میں سکے گھما کر موسیقی پیدا کرتے تھے اور طویل رزمیے اور مثنویاں سناتے تھے، کچھ فقرا کلائی سے کہنی تک بتدریج بڑی ہوتی ہوئی چوڑیاں پہنتے ان پر ایک آبنوسی لکڑی کی ضرب لگا کر جھنکار پیدا کرتے تھے اور مسلسل اشعار سناتے تھے۔ بڑا پر کیف ماحول تھا۔

ع س: ماشاء اللہ عروض پر آپ کا مطالعہ نہایت وسیع ہے ُشعور عروض‘ میں ایک مقام پر آپ نے لکھا ہے کہ میں نے کتنی کتابیں پڑھی ہیں یہ نہیں بتا سکتا لیکن عروض پر پچاس کتابوں کے نام بلا توقف بہ یک وقت گنا سکتا ہوں اس پر آپ کی کیا رائے ہے؟

ش ا: اس پر میں کیا کہوں مختصر یہ کہ نہ گھوڑا دور نہ میدان کسی دن آزما کر دیکھ لیں۔

ع س: آپ کی فارسی زبان پر معلومات بہت گہری ہے، سنا ہے کہ ایران میں آپ کی بہت عزت افزائی ہوئی؟

ش ا: میں تین بار حکومت ایران کا مہمان رہا ہوں، وہاں ُبزرگ شاعر اہلبیت‘ کے اعزاز سے نوازا گیا، ایک بار تو ان ایرانی شعرا کے ساتھ جو صرف فارسی میں شعر کہتے ہیں۔

ع س: آج کل مصروفیات کیا ہیں؟

ش ا: فی الحال تو میں اپنا منقبتی کلام جمع کر رہا ہوں۔ اس کے بعد ُشعور اللغات‘ مرتب کرنے کا ارادہ ہے جس میں وہ الفاظ ہیں جن کی سند میں صرف مرثیوں کے اشعار فرہنگ آصفیہ، نور اللغات وغیرہ میں ملتے ہیں۔ ُشعور تاریخ گوئی‘ اور ُشعور تنقید‘ (مختلف شعرا پر لکھے ہوئے مضامین) ان تمام پر کچھ نہ کچھ کام ہو چکا ہے۔

ع س: اپنے قارئین کو آپ کیا پیغام دینا چاہتے ہیں۔

ش ا: اپنی زبان، اپنی تہذیب کی حفاظت کے لیے اردو کے رسائل اور اخبارات کے خریدار بنیں۔

ع س: اردو دنیا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ش ا: یہ ایک ایسا رسالہ ہے کہ سرورق دیکھ کر اس کو خریدنے کا خیال آتا ہے۔ مندرجات دیکھ کر انھیں پڑھنے کا جی چاہتا ہے۔ اناپ شناپ، الول جلول چیزوں سے پاک اعلیٰ معیاری رسالہ ہے۔

ع س: اپنی پسند کے کچھ اشعار سنا دیجیے۔

ش ا:

بچپن جن سے وابستہ تھا اب وہ کھلونے بیچ رہا ہوں
جان سے پیاری چیزوں کو میں اونے پونے بیچ رہا ہوں

آج کے دن سے امیدیں تھیں بہت وابستہ
آج کا دن بھی مگر بیت گیا کل کی طرح

عشق میں یارو کیسے کیسے عالم سے دوچار ہوئے
اس نے پلٹ کر حال نہ پوچھا جس کے لیے بیمار ہوئے

آئینے میں ان کا عکس حسیں خود ان کے مقابل آ جائے
کیا جانیے کیا ہو قاتل کے جب سامنے قاتل آ جائے

دل تو رونے پہ بھی نہ تھا مائل
مسکرانے کی بات کیا کرے

بگویمش حال قلب سوزاں کہ آگ جی ماں لگائے راکھوں
بترسم اومی شود پریشاں کہوں سکھی یا چھپائے راکھوں

پیامِ شامِ وصال آید، شنیدہ ام خوش جمال آید
نہ جانے کب آئے والا، میں دیپ دوارے جرائے راکھوں

بطرز خسرو غزل سدایم، شعور فکرو ہنر تمایم
ہر ایک مصرع پہ سوچتا ہوں، کہ ساکھ کیونکر بچائے راکھوں

غریب شہر تمنا سہی، مگر کچھ ہوں
گداگروں میں بھی رسوا سہی مگر کچھ ہوں

نہ جانے کب یہ خیال آئے گا بزرگوں کو
میں ان کے نام پہ دھبہ سہی مگر کچھ ہوں

■

Azadar Husain Sajid Jalal Puri
Mohalla : Jafrabad, Post: Jalalpur
Distt.: Ambedkar Nagar- 224149
Mob.:7571867185
Email.: azadarhusainsajid@gmail.com

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کر کے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

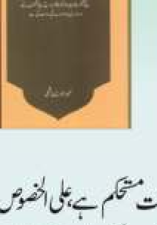

دکنی ہندو اور اردو

مصنف: نصیرالدین ہاشمی
صفحات: 266، قیمت: 170 روپے، سنہ اشاعت: 2023
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: محمد فرقان عالم
A-46، تھرڈ فلور، گلی نالے والی، اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

دکنیات کے باب میں نصیرالدین ہاشمی کی تحقیقی وتنقیدی شناخت مستحکم ہے، علی الخصوص ان کی کتاب 'دکن میں اردو' نے ہاشمی کی شخصیت کو ادبی دنیا میں ایک الگ طرح کا اعتبار بخشا۔ پیش نظر کتاب 'دکنی ہندو اور اردو' اسی کتاب کی توسیع ہے، جس میں 1724 تا 1955 کے دورانیے یعنی تقریباً دو صدی سے زائد عرصے پر محیط ہندو شاعروں، نثر نگاروں، مدیروں اور وکلا کی خدمات کو احاطۂ تحریر میں لینے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

'دکنی ہندو اور اردو' کے مواد کی ترتیب وتزئین میں ہاشمی نے اپنی سابقہ کتابوں 'دکن میں اردو'، 'مدراس میں اردو' اور 'خواتین دکن کی ادبی خدمات' کی ترتیب وتزئین کو ہی ملحوظ رکھا نتیجتاً ہندو شعرا کی تاریخ کو سنہ کے اعتبار سے سات ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے، چونکہ ابتدائی دو ادوار 1347 تا 1595 اور 1595 تا 1688 میں مصنف کو کسی شاعر کا سراغ نہیں مل سکا، اس لیے یہ دونوں ادوار زیر بحث نہیں آسکے۔ البتہ تیسرے دور میں لالہ جسونت رائے منشی کی شکل میں ایک شاعر کا تذکرہ نمونۂ کلام کے ساتھ زیر بحث آیا ہے۔ اس طرح مذکورہ تینوں ادوار کو کتاب کے ایک ہی حصہ میں سمیٹا گیا ہے، اور شعرا کا باقاعدہ سلسلہ چوتھے دور 1724 تا 1805 سے شروع ہوتا ہے جو ساتویں دور 1918 تا 1955 تک جاری رہتا ہے۔ اخیر میں علاحدہ عنوان کے تحت خواتین شعرا پر بھی مختصراً اظہار خیال کیا گیا ہے، اس کے بعد نثر نگاروں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جس کا سلسلہ پانچویں دور 1805 تا 1883 سے شروع ہو کر ساتویں دور 1918 تا 1955 تک کتاب میں جاری رہتا ہے، گزشتہ چار ادوار میں نثر نگاروں کا سراغ نہ ملنے کے اسباب کو لے کر بھی باب کی ابتدا میں مختصراً گفتگو کی گئی ہے، اور پھر اخیر میں خواتین کی نثری خدمات کو سرمایۂ تحریر بنایا گیا ہے، ان سب کے ساتھ اخبارات ورسائل کے مدیران، وکلا اور اردو میں مقالات تحریر کر کے ایم اے، بی ایڈ اور ایل ایل ایم کی ڈگریاں حاصل کرنے والے ماہرین کو بھی علاحدہ علاحدہ عناوین کے تحت صفحۂ قرطاس پر جگہ دی گئی ہے، کتاب کے اخیر کے صفحات دو ضمیموں (شاعری، نثر) اور تقریباً 17 صفحات پر مشتمل اشاریہ کا احاطہ کرتے ہیں جن سے 'دکنی ہندو اور اردو' کی تحقیقی نوعیت مزید منکشف ہوتی نظر آتی ہے۔

چونکہ کتاب میں شعرا کے تذکرے کا باقاعدہ سلسلہ چوتھے دور سے شروع ہوتا ہے جس کا دورانیہ 1724 تا 1805 ہے، اس لیے اس دور میں سیاسی پس منظر پر مختصر جملے صرف کرنے کے بعد مصنف نے انیس ہندو شاعروں کا تذکرہ کیا ہے تاہم نمونہ ہائے کلام پندرہ کے ہی پیش کیے ہیں جس کی وجہ باوجود کوشش تمام کے کلام کی عدم دستیابی بتائی گئی ہے، شاعروں کے نام تخلص کی شکل میں کچھ اس طرح ہیں، حقیر، رنگین، لالہ، داغ، مہتاب، بے جان، شفیق، ذہین، رائے، ذرہ، ہمدم، ثابت، مخلص، بہادر، تولا، چرن داس، پیم چند، خرد، رام۔ ان میں حقیر، بہادر، تولا اور چرن داس کے نمونہ ہائے کلام نہیں پیش کیے گئے ہیں، اس دور کے کلام میں کلاسیکی اصناف غزل، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی کے نمونے بآسانی مل جاتے ہیں تاہم کثرت غزلیہ اشعار کی ہی نظر آتی ہے جن میں تصوف کے موضوعات عشق حقیقی ومجازی کو برتنے کی کوشش زیادہ نظر آتی ہے۔

پانچواں دور 1805 تا 1883 کو محیط ہے، اس دور میں، شاداں، اصغر، عاجز، مست، زیب، رسا، ربط، مکھن، ہوش، نانک، منشی، کیول کشن، مکند، رائے، جگناتھ اور عاشق جیسے سترہ شعرا کا ذکر ملتا ہے، یہاں بھی کیول کشن، مکند، روشن، رائے، جگناتھ اور

عاشق کی شکل میں چھ شاعروں کے نمون ہائے کلام نہیں پیش کیے گئے ہیں بلکہ صرف مختصر تعارف پر اکتفا کیا گیا ہے، مصنف نے اس دور کو غدر کے پس منظر میں سیاسی اعتبار سے تو نازک بتایا ہے تاہم ادبی اعتبار سے اس دور کو بہت اہم قرار دیا ہے اور بنیادی وجہ میں لکھنؤ اور دہلی کے شعرا کی آمد کے نتیجہ میں دونوں اسکولوں (دہلی، لکھنو) کے اثرات سے پیدا ہونے والے ماحول کو شامل مانا ہے۔ ''دہلی اور لکھنؤ اسکول کے شعرا کے جمع ہونے سے ایک جدید اسکول کا آغاز ہوا۔''

'دکنی ہندو اور اردو' کا چھٹا دور 1883 تا 1918 تک کے دورانیے کا احاطہ کرتا ہے، اس دور کو مصنف نے دو حیثیتوں سے بہت اہم قرار دیا ہے۔ (1) حکومت (حکومت آصفیہ) کی سرکاری زبان اردو قرار پائی۔ (2) دہلی اور لکھنؤ کے بڑے شعرا نے کثیر تعداد میں دکن کی طرف ہجرت کی، جن میں داغ، امیر، ظہیر، سرشار اور نظم طباطبائی جیسے نام نمایاں ہیں، مذکورہ دونوں وجہوں سے مصنف کے مطابق دکن کا شعری منظر نامہ کافی تبدیل ہوا نتیجتاً اس دور میں اکتالیس شعرا کے نام افسر، باقی، خرم، تمکین، خلق، احسان، فرحت، اشعر، بالکشن، حکیم، دبیر، دلیر، سامی، شہرت، صدق، فہیم، فاضل، مسرور، کرم، بہجت، نیک، افضل، شاد، خیر، سخن، صبر، نظر، ہنر، میطر، نفیس، جوہر، خاطر، خوشتر، نظم، رفعت، اکرم حشم، اوج، انور اور شاد کی شکل میں سامنے آتے ہیں، ان شعرا کے نمونہ ہائے کلام سے اس بات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس دور کی شاعری بمقابل پچھلے ادوار کے زیادہ متنوع ہے، یہاں انجمن پنجاب کا اثر بھی نظموں کی شکلوں میں دکھائی دینے لگتا ہے۔ ''غزل گوئی کے ساتھ نظم نگاری کی بنیاد قائم ہوئی 'دکن اسکول' کی شاعری جو دہلی اور لکھنؤ کی خوبیوں سے مرکب تھی، وجود میں آئی۔''

ساتواں دور 1918 تا 1955 کے دورانیے پر مشتمل ہے، اس دور کی خاص بات جامعہ عثمانیہ کے 'رائل چارٹر' کا منظر پر آنا ہے نتیجتاً جامعہ عثمانیہ کے تناظر میں اس دور کے دو حصے اور آزادی کے بعد کے دورانیے کی وجہ سے ایک مزید حصے کا اضافہ ہو جاتا ہے، اس طرح یہ دور شعرا کے اعتبار سے تین حصوں میں منقسم نظر آتا ہے پہلے حصہ میں وہ شعرا ہیں جو جامعہ عثمانیہ سے متعلق نہیں رہے ان میں آزاد، جذب، عالی، محبوب، اصغر، ناظر، رہبر، پنڈت ونشی دھر، کرن، وہمی، خوشتر، عاجز، فدوی، شارب، بہار، امین، فقیر، ساقی، رمیش، بھارت اور داس جیسے چوبیس نام شامل ہیں اور جامعہ عثمانیہ سے متعلق شعرا میں الہام، روشن، ارماں، مہندراج سکسینہ اور کنول کی شکل میں پانچ نام سامنے آتے ہیں جب کہ آزادی کے بعد فہیم، ستم، شوق، سرکش، پریمی، رامیش چندر اور فخر جیسے آٹھ ناموں کی فہرست کتاب میں درج ہے۔ مذکورہ تینوں حصوں کے شعرا کے شعری سرمایوں کی روشنی میں یہاں غزلوں کے ساتھ نظموں کی عمارت کافی مضبوط ہوتی نظر آتی ہے، اسی دور کے اخیر میں علاحدہ عنوان کے تحت خواتین ہندو شعرا کو بھی موضوع تحریر بنایا گیا ہے، جس میں نمونۂ کلام کے ساتھ مسز برکت رائے، شیل بالا، رتن، تلسی مانک لال اور مسز گیان استھانہ جیسی پانچ شاعرات سامنے آتی ہیں، شاعرات کے ذکر پر ہی کتاب 'دکنی ہندو اور اردو' کا شعری حصہ تکمیل کو پہنچتا ہے جہاں مصنف نے مختصراً تبصراتی انداز میں اس رائے کا بھی اظہار کیا ہے کہ بلاشبہ اس کتاب میں سو سے زائد شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے تاہم یہ امکان اب بھی ہے کہ ان کے علاوہ بھی شعرا پردۂ خفا میں ہوں گے اس کے بعد کتاب کے نثری حصے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کی ابتدا پانچویں دور 1805 تا 1883 سے کی گئی ہے، نثری حصے میں تین طرح کے نثر نگاروں کا تذکرہ ملتا ہے 1۔ وہ نثر نگار جنھوں نے باقاعدہ کتابیں تصنیف کیں خواہ ان کی حیثیت تراجم کی ہو یا مختلف موضوعات پر اصل کتاب کی 2۔ وہ نثر نگار جنھوں نے اخبارات و رسائل کی ادارت کی یا پھر اردو میں خطبے دیے 3۔ وہ نثر نگار جنھوں نے ایم اے، بی ایڈ اور ایل ایل ایم کے کورس میں اردو زبان میں مقالات لکھ کر ڈگریاں حاصل کیں۔

اول الذکر میں تینوں ادوار، پانچویں، چھٹے اور ساتویں کے دونوں حصوں کے نثر نگاروں کو شمار کیا جا سکتا ہے جن کی تعداد تقریباً اسی تک پہنچتی ہے ان میں کچھ نام اس طرح ہیں، رتن لال، منولال، مہاراجہ کشن پرشاد، مانک راؤ، راجہ تیج رائے، نارائن جی ولنکر، رائے بالمکند صاحب، سیتو مادھو راؤ، جی شنکر راؤ، گروداس، برج لال، دھرتی دھر سنگھی وغیرہ۔

ثانی الذکر کے ضمن میں مصنف 'دکنی ہندو اور اردو' نے تئیس مدیروں کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے ماہنامہ، پندرہ روزہ، ہفتہ وار جیسے اخبارات و رسائل کی کامیابی کے ساتھ ادارت کی اور ادب و سماج کے الگ الگ گوشوں کا حتی المقدور احاطہ کیا جن میں کچھ نام اس طرح ہیں، نارائن راؤ، کشن راؤ، پیارے لال، بھوانی پرشاد، جگناتھ پرشاد، ایم نرسنگ راؤ وغیرہ۔ اس باب میں اردو نثر کے حوالے سے وکلا کا تذکرہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ثالث الذکر میں مصنف نے تینوں کورس کے سیاق میں تقریباً اڑتیس مقالہ نگاروں کی فہرست نقل کی ہے، جس میں ایم اے کے تئیس، بی ایڈ کے پانچ اور ایل ایل ایم کے دس مقالات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ کچھ نام اس طرح ہیں، بی کملا منوہر صاحب، رائے نارائن پرشاد صاب، ڈی اننت راؤ صاحب، کرشنا بائی صاحبہ، بی سی مندرم صاحب، دی لکشمن ریڈی صاحب، بھورلال جین صاحب وغیرہ۔ ساتویں دور کے اخیر میں نثر نگار خواتین کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن کی تعداد کتاب میں نو شمار کروائی گئی ہے۔ یہاں پر قابل حیرت پہلو یہ ہے کہ شاعری کے بالمقابل نثر میں خواتین کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے جبکہ مرد حضرات کی تعداد شاعری کے مقابلہ نثر میں کم ہے، اس طرح پیش نظر کتاب 'دکنی ہندو اور اردو' ہندو شاعروں/شاعرات اور نثر نگار خواتین/حضرات کے مبسوط تذکرے کے ساتھ دو ضمیموں (شاعری، نثر) اور سترہ صفحات پر مشتمل اشاریے کے ساتھ تکمیل کا مرحلہ طے کرتی ہے۔

یہ کتاب ہندو شعرا و نثر نگاروں کے حوالے سے جامعیت کی حامل ہے گو کہ اس میں شعرا و نثر نگاروں پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی نہیں ڈالی گئی ہے تاہم ہندو شاعروں اور نثر نگاروں سے متعلق اتنی معلومات ضرور فراہم کر دی گئی ہیں، جن سے اس کام کو توسیع بخشنے کے ضمن میں کافی استفادہ کیا جا سکتا ہے اور اس کتاب کی حیثیت بنیادی ماخذ کی ہو سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ذریعے اس کتاب کی تیسری اشاعت عمل میں آئی ہے جو کہ ایک خوش آئند عمل ہے۔

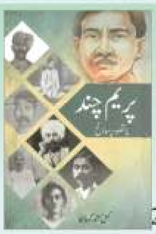

پریم چند : باتصویر سوانح

مصنف: کمل کشور گوئینکا، مترجم: ڈاکٹر اجے مالوی

صفحات: 92، قیمت: 80 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد اکرام، 89/6A، اسٹریٹ نمبر 1، غفار منزل، نئی دہلی۔ 25

دنیائے ادب میں پریم چند (پ: 31 جولائی 1880، و: 8 اکتوبر 1936) کی شہرت ایک فکشن نگار اور ناول نگار کے طور پر ہوتی ہے۔ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں انھیں یکساں مقبولیت حاصل ہے۔ انھیں اپنے میدان کا 'ماسٹر' سمجھا جاتا ہے۔

'پریم چند: باتصویر سوانح' پریم چند کی شخصیت اور ادبی خدمات کے حوالے سے ایک مکمل اور جامع کتاب ہے۔ اس کتاب کے مصنف کمل کشور گوئینکا ہیں۔ پریم چند شناسی کے حوالے سے ان کا نام بہت عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ کمل کشور گوئینکا کو ان کی مشہور کتاب 'پریم چند کی کہانیوں کا کال کرمانوسار ادھیین' کے لیے 2014 میں ویاس

سمان جیسے ایوارڈ سے نوازا جاچکا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو ہندی زبان میں تحریر کیا تھا، جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر اجے مالوی نے کیا ہے۔ پہلی بار یہ کتاب قومی اردو کونسل سے 2002 میں شائع ہوئی تھی۔ 2023 میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ کمل کشور گوئینکا 'پریم چند: باتصویر سوانح' کی اہمیت اور افادیت کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''پریم چند بیسویں صدی کے اہم ہندوستانی مصنفوں میں تھے۔ انھوں نے غلام بھارت کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے مگر معاشرے میں آج بھی وہی مسائل دکھائی دیتے ہیں۔'' (پریم چند باتصویر سوانح، ص vii)

'پریم چند: باتصویر سوانح' میں پریم چند کی پیدائش، تعلیم، ملازمت، تصانیف، شادی، آل اولاد وغیرہ کا مفصل ذکر ہے۔ یہاں تک کہ ان کے والد اور دادا کا ذکر بھی اس کتاب میں موجود ہے۔ پریم چند کی اصلی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دھنپت رائے کو پریم چند بننے میں کتنی اذیتوں اور پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ ان کا لاچار اور مجبور بچپن، وسائل کی کمی کے سبب تعلیم میں بار بار رکاوٹ، باپ کی دوسری شادی کا نفسیاتی دباؤ، کم عمری میں شادی اور میاں بیوی میں تال میل کی کمی، دوبارہ ایک بیوہ سے شادی اور بچوں کی تعلیم و پرورش، اوسط زندگی گزارنے کے لیے مختلف طرح کی ملازمتیں وغیرہ۔ اس طرح کی نہ جانے کتنی مشکلات کا مفصل بیانیہ ہے 'پریم چند: باتصویر سوانح'۔

اس کتاب میں پریم چند کی تعلیم اور ادبی خدمات کے حوالے سے مکمل جانکاری فراہم کرائی گئی ہے۔ تعلیم کے ضمن میں یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ پریم چند جب آٹھ برس کے ہوئے تو انھوں نے ہندی کے ساتھ اردو اور فارسی کی تعلیم بھی شروع کردی۔ 13 برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے پریم چند پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا محمد ہادی رسوا، مولوی محمد علی وغیرہ کے ناولوں کو پڑھ چکے تھے۔ 'طلسم ہوش ربا' جیسی کتاب کو بھی اسی عمر میں انھوں نے اپنے مطالعے کا حصہ بنالیا تھا۔ پریم چند کو مطالعے کا اس قدر شوق تھا کہ وہ بدھی لال نام کے کتاب فروش کی دکان پر موجود ناولوں کو پڑھنے کے لیے اپنے نوٹس وغیرہ بھی بیچ دیتے تھے۔ اردو میں ان کی پہلی تخلیق 'اولیور کرام ویل' بنارس کے ہفت روزہ اخبار 'آوازِ خلق' میں قسط وار شائع ہوئی تھی۔ انھی دنوں ان کے کچھ مضامین بھی ماہنامہ 'زمانہ' میں شائع ہوئے تھے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'سوزِ وطن' جولائی 1908 میں زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ مکمل طور پر حب الوطنی پر مرکوز تھا۔ اس افسانوی مجموعے پر انگریز حکومت کی جانب سے انھیں سرزنش بھی کی گئی۔ یہاں تک کہ اس کتاب کی ساری کاپیاں جلادی گئی تھیں۔ ایک قانون بھی پاس ہوا کہ اب پریم چند کی کوئی بھی تخلیق بغیر سنسر سے گزرے شائع نہیں ہوگی۔ مجبور اور پریشان پریم چند نے اب 'چھدم' نام سے لکھنا شروع کردیا۔ کچھ دنوں بعد ایک کہانی 'پاپ کی اگنی کنڈ' افسانہ گو کے نام سے شائع ہوئی۔ ان کا مشہور افسانہ 'رانی سارندھا' تو بغیر کسی نام کے چھپا۔ پریم چند کا پہلا ناول 'اسرارِ معابد' ہے۔ پریم چند اردو کے ساتھ ہندی کے قارئین تک رسائی کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ اپنی اس خواہش کا اظہار انھوں نے یکم ستمبر 1915 کو منشی دیانرائن نگم کو لکھے خط میں کیا:

''اب ہندی میں لکھنے کی مشق بھی کررہا ہوں، اردو میں اب گزر نہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بال مکند گپت مرحوم کی طرح میں بھی ہندی لکھنے میں زندگی صرف کردوں گا...'' (ایضاً، ص 15)

پریم چند زمین سے جڑے ہوئے سچے اور حقیقی تخلیق کار تھے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں گاؤں دیہات میں رہنے والے دبے کچلے کسان مزدور اور استحصال زدہ طبقے کی زندگی کو پیش کیا۔ زمینداروں اور سرمایہ داروں پر کھل کر تنقید کی، سماج میں رائج غلط رسم و رواج کو بھی موضوع بنایا۔ گویا پریم چند ایک قومی پہرے دار، دیہاتی زندگی اور ثقافت کے رپورٹر، تباہ حالوں اور مصیبت زدوں کے مسیحا، قومی یکجہتی، حب الوطنی اور بھائی چارے کے حمایتی سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے ادب کے ذریعے سماج میں رائج غلط رسوم اور ہر طرح کے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی۔ ڈاکٹر محمد حسن کے بقول ''انھوں نے ایسے کردار بھی ڈھالے ہیں جو فوق البشر طاقت کے ساتھ زندگی کی ساری راحتوں پر لات مار کر کسانوں اور مظلوموں کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ طعن و تشنیع سے بے پروا ہو کر سماجی خرابیوں سے لڑتے ہیں اور کسی قسم کی ذہنی اور جسمانی ضرب ان کے ماتھے پر شکن نہیں لاسکتی۔''

پریم چند نے اپنی شخصیت کو سنوارنے میں کچھ عظیم شخصیات کے اثرات بھی قبول کیے ہیں۔ ان میں سوامی دیانند، وویکانند، مہاتما گاندھی، ٹالسٹائے، میکسم گورکی وغیرہ کے نام بہت اہم ہیں۔ مہاتما گاندھی جیسی پر اثر اور باوقار شخصیت کے اثرات ان کی شخصیت پر کچھ زیادہ ہی پڑے۔ پریم چند انھیں نیک دل، عظیم مجاہد، اور بہادر انسان سمجھتے تھے۔ پریم چند کی بیوی شیورانی دیوی نے اپنی کتاب 'پریم چند اپنے گھر میں' میں لکھا ہے کہ:

''خود کو مہاتما گاندھی کا شاگرد بتلاتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ میں مہاتما گاندھی کو سب سے عظیم مانتا ہوں۔ ان کا بھی مقصد یہی ہے کہ مزدور اور کاشتکار کو راحت نصیب ہو اور میں بھی اپنی تحریروں سے ان کی حوصلہ افزائی کررہا ہوں۔ وہ ہندو مسلم یکجہتی چاہتے ہیں تو میں بھی ہندی اردو کو ملا کر ہندوستانی بنانا چاہتا ہوں۔'' (پریم چند باتصویر سوانح، ص 25)

پریم چند گنگا جمنی تہذیب کے پروردہ تھے۔ اس زمین پر رہنے والے سبھی انسانوں کو وہ اس ملک کا حقیقی باشندہ سمجھتے تھے۔ شاید اسی لیے پریم چند ملک کی ترقی اور خوش حالی کے لیے ہندو اور مسلمان کے اتحاد کو ضروری سمجھتے تھے۔ کمل کشور گوئینکا لکھتے ہیں:

''انھوں نے ایک ادیب، صحافی اور مدیر کی حیثیت سے ہندو مسلم یکجہتی کو سوراج کے ساتھ ملا کر دیکھا۔ گاندھی جی نے بھی اس یکجہتی کو سوراج کی پہلی سیڑھی کہا تھا۔ پریم چند کا قول تھا کہ دونوں مذاہب اور ان کے ماننے والوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے لیکن مٹھی بھر تعلیم یافتہ لوگوں نے اپنے عہدوں اور ممبروں کے لیے ساری لڑائی کھڑی کی ہوئی ہے۔ انھوں نے لکھا کہ غریبی، بیماری، ناخواندگی اور بیکاری ہندو مسلمان کا فرق نہیں کرتی۔'' (ایضاً، ص 33)

پریم چند کے ناولوں اور افسانے کے موضوعات کو فلمی دنیا نے بھی سراہا۔ ان کے مشہور ناول 'سیوا سدن' پر مہالکشمی سنےٹون اور ممبئی کے کرتا دھرتا نانو بھائی وکیل نے اسی نام سے فلم بھی بنائی۔ بعد میں پریم چند نے کئی فلموں کے لیے مکالمے بھی تحریر کیے۔ 'مل کا مزدور' میں تو انھوں نے کچھ وقفہ کے لیے اداکاری کی بھی کی۔ مگر یہ مصنوعی دنیا پریم چند کو بہت دنوں تک راس نہیں آئی، اس لیے انھوں نے یہاں سے راہ فرار اختیار کرنے میں ہی بھلائی سمجھی۔

'پریم چند: باتصویر سوانح' کی اہمیت اور افادیت کو دوبالا کرنے میں کتاب میں شامل تصاویر کا بھی بہت اہم کردار ہے۔ پریم چند کی پیدائش سے لے کر وفات تک کی کئی تصاویر اس کتاب میں شامل ہیں۔ پریم چند کے گاؤں لمہی کا نقشہ، ان کے گھر کی کوٹھری، راوت پاٹھ شالہ گورکھپور جہاں سے انھوں نے مڈل امتحان پاس کیا، اس کی بلڈنگ، ان کی کچھ اسناد (میٹرک، انٹرمیڈیٹ، گریجویشن وغیرہ) کے عکس کو بھی کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ پریم چند کی بیوی اور بچوں کو بھی تصاویر کے ذریعہ قارئین سے روشناس کرایا گیا ہے۔ کچھ ایسی شخصیات کی تصاویر بھی اس کتاب میں شامل ہیں جنھوں نے پریم چند کی شخصیت سازی میں اہم کردار نبھایا۔ بعض ایسے رسالوں کے سرورق بھی شامل ہیں جن میں ان کی پہلی تخلیق شائع ہوئی ہے۔ کچھ کتابوں کے سرورق اور کچھ کے دیباچے تصویروں کے ذریعے نمایاں

کیے گئے ہیں۔ پریم چند کے دستخط اور ان کی تحریر کے عکس (جب انھوں نے فلم 'سیوا سدن' بنانے کے لیے منظوری دی تھی) سے بھی قارئین کو روشناس کرایا گیا ہے، ساتھ ہی اس فلم کی ہیروئن کی تصویر بھی کتاب میں شامل ہے۔ بعض ایسے خطوط کے عکس بھی ہیں جو انھوں نے عظیم شخصیات کو لکھے تھے اور بعض وہ خطوط جو دوسرے ممالک میں مقیم ہندوستانیوں نے پریم چند کو لکھے تھے۔ سب سے آخر میں کچھ مخدوش عکسی تحریریں ہیں جو پڑھنے میں بمشکل آ رہی تھیں، انھیں بھی اس کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ ان مخدوش تحریروں کو کمپوز کر کے دوبارہ شامل کیا گیا تا کہ قارئین ان تحریروں سے بخوبی استفادہ کر سکیں۔

گئودان، بازار حسن (سیوا سدن)، گوشۂ عافیت (پریما شرم)، چوگان ہستی (رنگ بھومی)، اسرار معابد (دیوستھان رہسیہ)، ہم خرما و ہم ثواب (پریما)، پردہ مجاز (کایا کلپ)، میدان عمل (کرما بھومی)، بیوہ (پرتگیہ)، سوز وطن، پریم پچیسی، پریم بتیسی، خواب و خیال، فردوس خیال وغیرہ کتابوں کے خالق پریم چند کا تخلیقی کینوس بہت وسیع ہے۔ انھوں نے تقریباً 300 کہانیاں، 15 ناول اور 3 ناٹک لکھے ہیں۔ دوسری زبانوں کی ادبیات پر بھی پریم چند کی گہری نظر تھی۔ اس تعلق سے 10 کتابوں کو پریم چند نے ہندی زبان میں بھی منتقل کیا ہے۔ خود پریم چند کی بہت سی تخلیقات کے تراجم دنیا کی کئی زبانوں ہو چکے ہیں۔ ان کی زندگی میں ہی ان کی کہانیوں کے انگریزی، جاپانی، جرمن وغیرہ زبانوں میں ترجمے ہو چکے تھے۔

کتاب کے مترجم ڈاکٹر اجے مالوی قابل مبارکباد ہیں جنھوں نے اس کتاب کی افادیت کے پیش نظر اس کا ترجمہ کیا۔ وہ خود بھی اردو کے مشہور ادیب ہیں۔ اجے مالوی کی اردو زبان میں سناتن دھرم پر لکھی گئی ایک درجن سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ بھگوت گیتا کا ترجمہ اور اس کی تشریح ان میں سرفہرست ہے۔ قومی اردو کونسل کا شکریہ بھی ضروری ہے کہ اس نے اس اہم کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ کونسل منشی پریم چند کی تقریباً تمام نگارشات کو بھی 20 جلدوں میں شائع کر چکی ہے۔ مجھے امید ہے کہ پریم چند کی بقیہ کتابوں کی طرح 'پریم چند: باتصویر سوانح' کو بھی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوگی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر .... بتاریخ.. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

تحقیق و تنقید

مغربی بنگال میں اردو صحافت

مصنف: ڈاکٹر محمد شکیل اختر

صفحات: 560، قیمت: 400 روپے

ناشر: مغربی بنگال اردو اکادمی، مغربی بنگال

مبصر: ایم نصر اللہ نصر، A 3، سٹائن بوس روڈ، دانش ایس کے لین بکل ٹالہ، ہاوڑہ، مغربی بنگال

ڈاکٹر شکیل اختر (پروڈیوسر، ریڈیو جامعہ اور پروفیسر ماس کمیونیکیشن ریسرچ سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) تحقیق نگاروں میں ممتاز و منفرد مقام رکھتے ہیں۔اس کتاب سے پہلے ان کی جتنی بھی کتابیں منظر عام پر آئی ہیں، سبھوں کا تعلق تحقیق سے ہے۔ان کے نام کچھ یوں ہیں: اردو میں نشریاتی ادب (2007)، یہ خلد بریں ارمانوں کی 2009، روبہ رو، ریڈیو انٹرویوز کا مجموعہ (2012)، بھلائے نہ بنے، عالمی ادب کے اہم کرداروں پر ٹاکس سیریز (2013)، ریڈیو ڈراما: تاریخ و تکنیک (2015)، ریڈیائی تحریروں میں فکر اقبال کی عکاسی (2016)، غالب بصد انداز، غالب پر ریڈیائی تحریریں (2018)، اردو نشریات: مسائل و امکانات (2019)، بنگال میں اردو صحافت 1947 تا 2020، (2022)۔ان کی تحقیق عام محققوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔وہ کچھ بھی لکھتے ہیں تو شواہد و حقائق کی بنیاد پر ہی لکھتے ہیں۔وہ ہر موضوع کی پہلے کئی طرح سے تحقیق و تصدیق کر لیتے ہیں پھر اسے زیر بحث لاتے ہیں، وہ بھی حوالے اور ثبوت کے ساتھ تاکہ قاری کے دل میں پھر کوئی سوال نہ رہ جائے۔ جب تک وہ آل انڈیا ریڈیو میں رہے مخصوص موضوعات کے تحت مباحث، مکالمے اور دیگر براڈ کاسٹنگ کی ادبی گفتگو پر مشتمل کئی کتابیں تالیف کیں جو قارئین کے علم و معلومات میں اضافے کا سبب بنیں۔ان کی تصنیف و تحریر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سلیس زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ان کی تحریر میں سلیقہ مندی اور شائستگی کی کرنیں بھی جگہ جگہ منعکس ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔محاوراتی اور استعاراتی زبان سے بچنے میں عافیت سمجھتے ہیں۔ دوران مطالعہ قاری ان کی فکر اور انداز تحریر سے بیشک لطف اندوز ہوسکتا ہے۔

زیر مطالعہ کتاب 'مغربی بنگال میں اردو صحافت' مغربی بنگال اردو اکادمی، کولکاتا کی فرمائش پر لکھی ہوئی ایک ایسی کتاب ہے اس کی جس قدر پذیرائی کی جائے کم ہے۔اس کی خوبی یہ ہے کہ آغاز صحافت سے لے کر اب تک بنگال کی سرزمین سے جتنے بھی اردو اخبارات (روزانہ، ہفتہ وار اور پندرہ روزہ)، رسائل اور جرنلس شائع ہوئے اور اب تک ہو رہے ہیں ان کی پوری تفصیل اس کتاب میں درج ہے۔ ہر ایک کی پہلی اشاعت، تعطل، رخنہ اندازیاں، دوسری بار اشاعت اور بند ہونے کی تفصیل نیز محفوظ شمارے اور ان کی دستیابی کی صورت، مدیر کا نام، آخری اشاعت کی تاریخ، نوعیت اور دیگر تفصیلات سب درج ہیں۔اتنا بڑا کام اب تک نہ ہوا ہے اور نہ ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

باب اول سیاسی اخبارات: اس باب میں کم و بیش ایک سو اخبارات کی تفصیل درج ہے۔ باب دوم ادبی رسائل: اس باب میں اسی سے زاید ادبی و نیم ادبی رسائل کی تاریخ درج ہے جو بیشک کافی اہمیت کی حامل ہے۔ باب سوم مذہبی رسائل و اخبارات: اس باب میں 26 اخبارات و رسائل کے تعلق سے گفتگو موجود ہے۔ باب چہارم بچوں کے رسائل: اس میں 14 رسائل کا ذکر ہے جو خالص بچوں کی ذہنی نشو و نما کے لیے نکلتے رہے اور ابھی بھی نکل رہے ہیں۔ باب پنجم طبی رسائل: اس باب میں پانچ رسائل کی تفصیل درج ہے جن میں صحت، بیماریوں اور دواؤں کے تذکرے ہوتے تھے۔ باب ششم سماجی، اصلاحی و ترقیاتی رسائل۔اس باب میں سات رسائل کا نام لیا گیا ہے اور ان کی تفصیل بھی موجود ہے۔ایسے رسائل میں اصلاح معاشرہ کی باتیں ہوا کرتی ہیں۔ باب ہفتم صنعتی و کاروباری رسائل: اس میں تین اردو رسائل کا ذکر ہے جن کا موضوع تجارت اور کاروبار ہے۔ باب ہشتم اسپورٹس اور فلمی رسائل: اس باب میں دس اردو رسائل کا ذکر ہے جن میں صرف کھیل کود اور فلم کے تعلق سے مضامین شائع ہوتے تھے یا ہوتے ہیں۔ متفرقات میں سات رسائل کا ذکر ہے جو اپنے دامن میں ایک سے زائد موضوعات کو سمیٹے رہتے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے یہ کتاب اہل علم و دانش کے لیے اہم اور معلوماتی ہے۔موصوف نے اس کتاب کو تصنیف کر کے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔دلیل ملاحظہ فرمائیں:

اخبار کا نام: آبشار: مدیر، ابراہیم ہوش، سالک لکھنوی' پرنٹر و پبلیشر: معین الدین احمد، مقام اشاعت: 75 فیرس لین، کولکاتا (کلکتہ) 73، مغربی بنگال، آغاز اشاعت: 1954۔تعطل و تجدید: 22 مئی 2016

مطبع: قومی پریس، یگ ایمپلائز کوآپریٹیو انڈسٹریل سو سائٹی لیمیٹیڈ، 13 پرفل سرکار اسٹریٹ، کولکاتا 72 مغربی بنگال

سائز: 18 بائی 2/11 انچ، ضخامت 4 صفحات (بعد میں اضافہ) نوعیت سیاسی، قیمت 2 روپے، رجسٹریشن نمبر: 2527/57

مذکورہ اخبار کے پرنٹر اور پبلشر معین الدین احمد تھے۔یہ اخبار (آبشار) پبلی کیشن پرائیوٹ لمیٹڈ کی ملکیت تھی۔اس کا اجرا 1954 میں عمل میں آیا لیکن رجسٹر آف نیوز پیپرس میں مذکورہ اخبار کا اندراج 1957 میں ہوا۔اس کے پہلے مدیر ابراہیم ہوش مقرر کیے گئے۔یہ روزانہ شام کو شائع ہوتا تھا مگر اس پر مارکسی اثرات نمایاں تھے جس کی وجہ سے یہ اخبار کانگریس مخالف یا حکومت مخالف اخبار میں شمار کیا جانے لگا۔ ابتدا میں ابراہیم ہوش اور سالک لکھنوی کی ترقی پسندی اس اخبار پر حاوی رہی لیکن 29 برس بعد 22 مئی 1983 کو یہ اخبار بند ہو گیا۔''

چار صفحات پر مبنی مزید تفصیلات اس اخبار سے متعلق اس کتاب میں درج ہیں جو بہت معلوماتی ہیں اور قاری کے لیے نئی اور چونکا دینے والی ہیں۔ایسی ہی تفصیلات کم و بیش ہر اخبار اور رسالے کے تعلق سے زینت قرطاس ہیں۔اس کتاب کی تصنیف و تکمیل کے لیے مصنف نے جو جدوجہد، کاوش کی ہے، جس طرح لائبریریوں کی خاک چھانی ہے اور لوگوں کی دہلیز پر جبیں سائی کی ہے نیز خط و کتابت اور فون سے رابطے کیے ہیں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

امیر خسرو: تنقیدی و تحقیقی مطالعہ

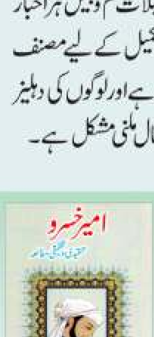

مصنف: ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان

صفحات: 284، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2023

مبصر: ڈاکٹر محمد یٰسین قدوسی

نیا بازار کامٹی، ناگپور (مہاراشٹر)

'امیر خسرو: تنقیدی و تحقیقی مطالعہ' کے مصنف الحاج ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان ہیں۔ یہ نہایت ہی اہم اور معلوماتی کتاب ہے۔ باب اول 'عرض مصنف' کے تحت ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان نے حضرت امیر خسرو کے متعلق جو تحریر لکھی ہے، واقعی ان کی شخصیت اور ادبی مقام کے اعتبار سے بڑی ہی معنی خیز ہے۔

باب دوم کا عنوان اردو ادب میں تاریخ کا حصہ ہے، جو بڑا ہی معلوماتی ہے۔اس میں ہندوستان کی مختلف اقوام اور زبانوں کا ذکر کیا ہے۔اس باب میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ

اردو زبان عہد مغلیہ کی بہت بڑی دین ہے۔ اس دور میں مختلف اقوام اور زبان کے لوگوں کے میل جول سے جو زبان وجود میں آئی اس کا نام اردو ہے، چنانچہ یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ ہندوستان میں بسنے والوں کی زبان ہے، چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم اور اس کے فروغ میں تمام ہندوستان کے لوگوں نے حصہ لیا ہے۔

کتاب کا باب سوم 'امیر خسرو اور تاریخ' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں امیر خسرو کی شاہانِ وقت سے وابستگی کا احوال درج ہے اور اس دور کی جو بھی تاریخی تصانیف ہیں ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ امیر خسرو کی سب سے پہلی وابستگی علاء الدین کشلو خان یعنی ملک چھجو حاکم کڑہ کے دربار سے ہوئی۔ ملک چھجو سلطان بلبن کا بھتیجا تھا، چنانچہ امیر خسرو کا پہلا سرپرست حاکم کڑہ تھا، جس کے دربار سے امیر خسرو دو سال تک منسلک رہے۔ امیر خسرو لکھنوتی یعنی بنگال کے سفر میں شامل قافلہ رہے۔ اس کے بعد بلبن کے ہی بیٹے محمد شہید کے دربار میں شامل ہوگئے۔ بعد کے دور میں امیر خسرو کی وابستگی کی فہرست پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سلطان جلال الدین خلجی، سلطان علاء الدین خلجی، سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی، سلطان غیاث الدین تغلق اور سلطان محمد بن تغلق کے دربار میں ان کی موجودگی پائی جاتی ہے۔ ان کے دور میں جو بھی اہم واقعات رونما ہوئے، ان کو دیکھا اور سپرد قلم کردیا، چنانچہ امیر خسرو کی پانچ مثنویاں اور نثری کارنامے اس دور کی اہم باتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ خزائن الفتوح، اعجاز خسرو، مفتاح الفتوح، دول رانی خضر خان، نہہ سپہر اور تغلق نامہ وغیرہ امیر خسرو کے حالات اور تاریخ نگاری سے متعلق بڑی اہم تصانیف ہیں۔

باب چہارم خسرو اور سلاطین دہلی سے متعلق ہے۔ اسی باب میں 'خسرو بحیثیت امیر و ندیم خاص' (درعہد سلاطین و امرا) اور بحیثیت امیر و ندیم خاص درعہد امرا کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اسی باب میں امیر خسرو کی وفات کا ذکر ہے۔ خسرو کی وفات 725ھ میں ہوئی۔ دلی میں اپنے پیر اور مشہور زمانہ بزرگ حضرت نظام الدین اولیا کے قرب میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ باب پنجم 'بحیثیت ایک بلند پایہ مؤرخ' کے عنوان سے بڑا ہی معلوماتی ہے۔ عرفان صاحب نے خسرو کے متعلق بالکل صحیح تصویر پیش کی ہے۔ امیر خسرو مجسم تاریخ تھے۔ ماضی، حال اور مستقبل پر ان کی نظر تھی۔ ان کی ہر چیز سے وابستگی دکھائی دیتی ہے۔ باب ششم 'خسرو کے متعلق چند معروف تاریخی غلط فہمیاں' میں کل 27 باتوں کا ذکر ہے اور ہر ایک عنوان کے تحت مصنف نے حقائق کو پیش کیا ہے۔ اس باب میں جن باتوں اور تاریخی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی مصنف نے کوشش کی ہے وہ اس طرح عنوانات کے تحت ہیں:

بغرا خان اور کیقباد کے متعلق، سلطان ناصر الدین اور امیر خسرو، سلاطین دہلی کے نام، غلط الفاظ کا استعمال، مصنفین کا اپنی تصنیف میں تضاد پیدا کرنا، غلط واقعہ کا بیان، امیر خسرو کی پیدائش کے متعلق چند دلائل، سلطان بلبن کی تخت نشینی کے بعد مسائل، غلط تاریخی مقامات کا تحریر کرنا، مصنفین کا غیر یقینی اور غیر مستحکم رائے پیش کرنا، فارسی اشعار اور موزوں الفاظ کا استعمال، ناموں اور رشتوں میں غلطیاں، امیر سیف الدین کی آمد اور کچھ امیر کے تعلق، امیر خسرو کی دکن آمد کے چند دلائل، امیر خسرو کی اول شاہی ملازمت، امیر خسرو کا شاہی وظیفہ، کچھ ابن بطوطہ کے بارے میں، تلمیح تراشی اور روایات کا بیان، امیر کے متعلق ناروا باتیں، ڈاکٹر اسمتھ کا بیان، امیر خسرو کی ملتان گرفتاری، امیر حسن سنجری کا دوستی سے متعلق، امیر خسرو اور مولانا شہاب الدین مہرہ، پٹیالی کی جاگیر کے متعلق، امیر خسرو کی شعر گوئی کا آغاز، خسرو کے جد مادری عماد الملک کے متعلق، خسرو کا ایک دوہا۔

باب ہفتم 'خلاصہ کلام' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں مصنف نے واضح کیا ہے کہ امیر خسرو ہر اعتبار سے امیر تھے اور آج بھی ادبی اعتبار سے امیر ہیں۔

باب ہشتم 'حیات امیر خسرو، ماہ و سال کے آئینہ میں' اس باب میں بہت ہی اہم باتیں اور واقعات و حالات اور تاریخ کا ذکر ہے کہ ان کا دور کس طرح گذرا اور امیر خسرو کی کیا کیا خدمات رہی ہیں۔ 3 مارچ 1253 امیر خسرو کی تاریخ پیدائش بتائی گئی ہے، جب کہ 1260 میں انھیں مکتب میں داخل کیا گیا۔ ان کی تصانیف، مثنویات وغیرہ کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے۔ باب نہم کتابیات سے متعلق ہے کہ اس کتاب کی تحریر کے دوران کن کتابوں سے استفادہ کیا گیا، اس باب میں کل 54 کتابوں کا ذکر ہے۔

الغرض زیر نظر کتاب ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان کا بڑا تحقیقی کارنامہ ہے جس سے اہل علم بخوبی استفادہ کرسکتے ہیں۔

مضامین

ادب دریچہ (مضامین)

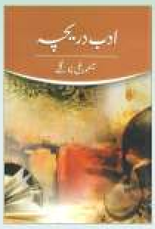

مصنف: میمونہ علی چوگلے

صفحات: 135، قیمت: 180 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: محمد شاہنواز خان

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

میمونہ علی چوگلے ہمہ گیر شخصیت کی مالک ہیں۔ وہ ایک شاعرہ، افسانہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے عصرِ حاضر میں اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں، جنھیں ادبی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

زیر نظر کتاب 'ادب دریچہ' مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں انھوں نے ملک و بیرون ملک کے فن کاروں خاص کر طنز و مزاح کے تخلیق کاروں پر اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں کل 18 مضامین شامل ہیں۔ جو الگ الگ موضوع پر ہیں، جن سے میمونہ علی چوگلے کی مطالعے کی وسعت اور وسیع علمی کینوس کا اندازہ ہوتا ہے۔ پہلا مضمون 'نابغہ روزگار شخصیت' رابندر ناتھ ٹیگور ہے۔ یہ مضمون ٹیگور کے علمی و ادبی کارناموں کی اہمیت و افادیت پر مشتمل ہے۔ ان کی شاعری کی عالمگیر مقبولیت، ان کے ڈرامے کے رموز و اثرات، ناول و افسانہ کی فکری و فنی خوبیوں، نیز کہانیوں کے نفسیاتی پہلوؤں کو آشکار کیا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی ہمہ گیر اور متنوع شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں کارفرما عوامل کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے خاندان اور ماحول کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ دوسرا مضمون 'بابائے ظرافت مشتاق احمد یوسفی' ہے۔ اس مضمون میں مشتاق احمد یوسفی کی ظرافت اور حسِ مزاح کے قبول عام و خاص ہونے کے اسباب و عوامل کی نشاندہی کی ہے۔ ان کی ذہنی بالیدگی، طرز تحریر اور نظریات و خیالات کی بلند پروازی نے ان کے فن میں جان پیدا کی ہے۔ ان کے فن سے لطف اندوز ہونے کے لیے بھی بلند ذہنی سطح کی ضرورت ہے۔ اردو ادب میں طنز و مزاح کے آغاز و ارتقا پر بھی سرسری طور پر روشنی ڈالتے ہوئے، یوسفی کے خاندانی حالات کا ذکر ہے۔ تیسرا مضمون 'بے باک طنز نگار فکر تونسوی' ہے۔ اس مضمون میں فکر تونسوی کے طنز پر ان کی تحریروں کے آئینے میں گفتگو کی ہے۔ فکر تونسوی نے معاشرے میں بکھری ہوئی برائیوں کو اپنے طنز کا موضوع بنایا، جو نہ صرف ہنساتی ہیں، بلکہ فکر و فن اور نظر کو بھی بیدار کرتی ہیں۔ چوتھا مضمون 'آزادی سے قبل اردو ڈراما' ہے۔ اس میں ڈراما کے لغوی و اصطلاحی معنی کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی عالمی روایت پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر ہندوستان میں اس کی سنسکرت روایت کو بھی واضح کیا ہے۔ اردو ادب میں ڈراما پر لکھی گئی اہم کتابوں کو درج کیا ہے۔ اردو ادب میں اس کی عدم مقبولیت پر خامہ فرسائی

کی ہے۔ پانچواں مضمون 'کویت میں اردو' ہے، اس مضمون میں کویت میں بسلسلۂ روزگار بسنے والے ادبا و شعرا کا تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ مضمون نہایت ہی اہم اور علمی و تحقیقی نوعیت کا ہے۔ ایک مضمون 'فانی نہیں جاودانی ہیں ہم' ڈاکٹر عبدالستار دلوی کے نام ہے۔ اس میں ڈاکٹر عبدالستار دلوی کے تحقیقی ولسانی کارناموں کو بہت ہی دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے، نیز ان کی جائے پیدائش 'کوکن' پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے دلوی صاحب کے کارناموں کی عظمت و وقعت کا نقش ابھرتا ہے۔ ساتواں مضمون 'تسنیم انصاری کی شاعری کا ایک تاثر' ہے، اس مضمون سے تسنیم انصاری کے مجموعۂ کلام 'اظہار' پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی شاعری کی خصوصیات، تجربات ومشاہدات پر اپنے تنقیدی نظریات کو پیش کیا ہے۔ ایک مضمون 'پرندے تو مسافر ہیں' میں عبدالرحیم نشتر کی نظموں کے انتخاب 'پرندے تو مسافر ہیں' پر اپنے تاثر کا اظہار کیا ہے۔ 'شور خاموشی' عامر قدوائی کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ اس مضمون میں فنی تقاضے سے ہم آہنگ ان کے کلام کی تحسین کی گئی ہے۔ ف س اعجاز کے نام دو مضامین شامل ہیں۔

پہلا 'جھیل کے بستر پر' دوسرا 'ترجمہ کے شگفتہ اسلوب... منعکس' ہے۔ ف س اعجاز مدیر، صحافی، ادیب، شاعر، افسانہ نگار اور مترجم کی حیثیت سے معروف ہیں۔ 'جھیل کے بستر' میں ان کی نظموں کی شگفتگی اور نرم لہجوں اور روایت کی پاسداری کی عکاسی کی گئی ہے۔ 'منعکس' ان کی ترجمہ کردہ نظموں کا ترجمہ ہے، جن کی فنی خوبیوں پر مکمل دسترس کو سراہا گیا ہے۔ ایک مضمون 'کثیر الجہت تخلیق کار ڈاکٹر صادقہ نواب سحر' ہے۔ سحر بلند پایہ ناول نگار اور منفرد طرز کی افسانہ نگار کی حیثیت سے دنیائے ادب میں اپنا مقام ومرتبہ بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کے افسانے اور ناول پر انھوں نے اپنی تنقیدی نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے۔ ایک مضمون 'ادب شناس محمد دانش غنی' ہے۔ اس میں دانش غنی کی ادب شناسی کو ان کی کتابوں کے ذریعے واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ 'نثری نظم کا روشن ستارہ: نجمہ منصور' یہ بھی ایک مضمون ہے۔ نجمہ منصور نثری نظم کے حوالے سے ایک اہم نام ہے۔ اس میں نظموں کے حوالے سے ان کے فکر وفن کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک مضمون 'سائنس اور سماج' پر ہے جو پروفیسر سید اقبال کے کالموں اور مضامین کا مجموعہ ہے، جسے سید خالد نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔ اس کتاب کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ 'ہندوستانی زبان کے شاعر: امیش شرما'، 'چھپایا اٹھا ولے: سہ زبان شاعر'، 'ایک نئی آواز: مدھولیکا' بھی اس کتاب کے اہم مضامین ہیں۔

یہ مضامین مختلف اور متنوع حیثیت کے حامل ہیں، جو میمونہ علی چوگلے کی علمی، ادبی، تحقیقی وتنقیدی صلاحیتوں کا پتا دیتے ہیں اور اس کے مطالعے سے بیک وقت کئی اصناف اور شخصیتوں سے آگاہی ہوتی ہے۔

شخصیات و سوانح

پروفیسر اخترالواسع: شخصیت اور کارنامے

مرتب: فاروق ارگلی

صفحات: 832، قیمت: 1950 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: فرید بک ڈپو، دریا گنج، دہلی

مبصر: حقانی القاسمی، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

پدم شری پروفیسر اختر الواسع کا شمار موجودہ عہد کی عبقری اور نابغہ شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ ان کی شناخت کے کئی حوالے ہیں اور ہر حوالہ اعتبار اور وقار کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر اسلامیات ان کا میدان ہے، مگر ادبیات، سماجیات، سیاسیات سے بھی ان کا خاص رشتہ ہے۔ انھوں نے اپنی ذات کو کسی ایک فکری یا لسانی دائرے میں محصور نہیں رکھا بلکہ مختلف اور متنوع افکار و اقدار سے اپنے ذہن کو جلا بخشی اور مختلف زبانوں کے ذریعے اپنے ذہن کی روشنی کو اطراف واکناف میں پھیلانے کی کوشش بھی کی، شاید یہی وجہ ہے کہ ان سے محبت کرنے والوں کا حلقہ کشمیر سے کنیا کماری تک ہے۔ وہ جس محفل میں بھی جاتے ہیں، ان کی شخصیت کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

پروفیسر اختر الواسع کو عصری مسائل وموضوعات اور متعلقات کا پورا ادراک ہے۔ دورِ حاضر کے چیلنجز کا بھی احساس ہے، اس لیے وہ صرف اپنے مخصوص موضوع میں محصور نہیں رہتے بلکہ وہ معاشرے کے فعال ومتحرک کردار ایک حساس اور ذمے دار فرد کی طرح اپنا منصبی فریضہ انجام دیتے ہیں۔ وہ اوروں کی طرح یہ کہتے نظر نہیں آتے کہ میں ادب یا اسلامیات کا پروفیسر ہوں اس لیے عصری عالمی وقوعات اور معاشرتی احوال و حوادث سے میرا کیا لینا دینا، بلکہ وہ عموماً ایسے تمام موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے ہیں آج کے عہد کو جن کی ضرورت ہے۔ ذہن سازی اور سمت نمائی میں اختر الواسع کی یہ تحریریں بہت اہم رول ادا کرتی ہیں۔ اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والی ان تحریروں کی وجہ سے ہر طبقے کے لوگ ان کی شخصیت سے نہ صرف آشنا ہیں بلکہ انھیں محبت، عقیدت اور قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ واقعی ان کی شخصیت ہمہ جہت ہے، جہاں وہ طبقۂ عوام میں خاصی شہرت ومقبولیت رکھتے ہیں وہیں حلقۂ دانشوراں میں بھی ان کی ایک الگ شناخت ہے۔ ان کے علمی اور فکری ڈسکورس سے متاثر ہو کر ہی ارباب علم ودانش نے مضامین لکھے ہیں اور انھیں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

آج کے عہد میں اختر الواسع کے علمی اور ادبی آثار وکوائف اور ان کی شخصی خصوصیات اور علمی امتیازات سے نئی نسل کو بھی واقف کرانے کی ضرورت تھی، اس لیے فاروق ارگلی صاحب نے ان پر یہ کتاب مرتب کی ہے جس میں علم وادب سے وابستہ اہم شخصیات پروفیسر خالد محمود، ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی، محمد فہیم اختر ندوی، تحسین منور، عارف عزیز، سہیل انجم، معصوم مراد آبادی، مجتبیٰ حسین، پروفیسر ابن کنول کے تاثراتی اور تنقیدی مضامین اور خاکے ہیں۔ ان کے علاوہ فاروق ارگلی اور ذیشان احمد مصباحی کے خصوصی مصاحبے بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔ ان تمام مضامین اور مکالمات سے اختر الواسع کی شخصیت کے مختلف ابعاد روشن ہوتے ہیں۔ معصوم مراد آبادی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ''یہ بات کم ہی لوگوں کو معلوم ہے کہ پروفیسر اختر الواسع کا اصل نام راحت بن حیرت ہے جو ان کے والد حیرت بن واحد سے مماثل ہے۔ جو ایک خوش گو شاعر تھے۔''

پروفیسر ابن کنول نے اختر الواسع کا خوبصورت خاکہ لکھا ہے اور علی گڑھ کے زمانے کی ان یادوں کو تازہ کیا ہے جب اختر الواسع طلبہ یونین میں سرگرم تھے۔ اس زمانے میں وہ اپنی خطابت کے جوہر دکھا رہے تھے۔ ابن کنول نے لکھا ہے کہ ''ہم آج بھی محسوس کرتے ہیں کہ وہ طلبا یونین کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے تقریر کر رہے ہیں اور ہم یونین ہال میں سامعین میں بیٹھے محظوظ ہو رہے ہیں۔''

مشہور طنز ومزاح نگار مجتبیٰ حسین نے اپنی شگفتہ تحریر کے ذریعے انھیں خراجِ محبت پیش کیا ہے۔ انھوں نے اختر الواسع کے اس چہرے کا بطور خاص ذکر کیا ہے جس میں وہ ایک انقلابی اسٹوڈنٹ لیڈر کے طور پر نظر آتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں ''ہم نے دہلی میں پہلے پہل اس بائیس سالہ چہرہ کو 1973 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک انقلابی اسٹوڈنٹ لیڈر کے متحرک جسم سے جڑا ہوا دیکھا تھا۔ ان دنوں اختر الواسع اگرچہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے (آنرس) کرنے کے بعد غالباً دینیات وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے لیکن زیادہ تر دہلی میں پائے جاتے تھے۔''

سہیل انجم نے اپنے مراسم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اختر الواسع تقریباً 40 کتابیں تصنیف کر چکے ہیں، اس کے علاوہ اردو، انگریزی، ہندی میں 500 سے زائد مضامین و مقالات مختلف اخبارات و مجلّات میں شائع ہوکر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کی بہت سی تحریریں، عربی، فارسی اور فرانسیسی میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔''

عارف عزیز نے اختر الواسع کے شخصی محاسن اور علمی فضائل پر گفتگو کرتے ہوئے ایک خوبصورت جہت کو یوں روشن کیا ہے ''ان کے یہاں نہ علمی پندار ہے نہ تفوق، نہ احساس برتری کا شائبہ۔ اس کے برعکس خاکساری اور فروتنی، ایثار و بے نفسی کا غلبہ نظر آتا ہے جس نے ان کی زندگی کو دوسروں کے لیے ایک مثال بنا دیا ہے۔''

ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی نے پروفیسر اختر الواسع کے افکار کے عصری معنویت کے عنوان سے بہت عمدہ مضمون لکھا ہے۔ ان کے بقول ''پروفیسر اختر الواسع کی سب سے نمایاں اور پاکیزہ خصوصیت فکری اعتدال و توازن اور بقائے باہم کا فلسفہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ بیک وقت امت مسلمہ کے تمام مسالک و مشارب میں یکساں مقبول ہیں۔''

محمد فہیم اختر ندوی نے اختر الواسع کو ایک دیدہ ور دانشور، ایک مرنجا مرنج انسان قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''یوں تو آپ اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر کہے جاتے ہیں، لیکن یہ بھی درست ہے کہ آپ اردو زبان کی محفل شعر و سخن کے مسند نشیں ہیں، ہند اسلامی تہذیب کے باوقار امین ہیں، ہندی زبان کے ہم نشین ہیں، ہندوستانی اور عالمی مذاہب کے درمیان صحت مند اشتراک عمل کے صاحب یقین ہیں، صوفی روایات کے علمبردار اور مسلکی اتحاد و یگانگت کے نقیب ہیں، اس لیے آپ ہر محفل کے شناسا، ہر بزم میں نمایاں اور ہر حلقہ میں آشنا نظر آتے ہیں۔''

تحسین منور نے 'کچھ اور چاہیے وسعت' کے حوالے سے اختر الواسع کی نگارشات کا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ پروفیسر خالد محمود کا خاکہ نہایت دلچسپ اور شگفتہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''تواضع اور مہمان نوازی تو ان کے پورے گھر کا مزاج ہے۔ مہمان کو دیکھ کر یوں بھی بہت خوش ہوتے ہیں کہ مہمان اللہ کی نعمت ہے اور یوں بھی کہ اس کے طفیل بد پرہیزی کے مواقع حاصل ہونے کے امکانات زیادہ روشن ہو جاتے ہیں۔''

فاروق ارگلی نے ان سے خاندانی پس منظر، تعلیمی سفر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز میں تدریسی خدمات، تصوف و روحانیت سے دلچسپی، مسلکی تفریق اور نظریاتی اختلاف، اردو ادب کا منظر نامہ، ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی بقا کے اقدامات، اردو اکیڈمی دہلی کی سربراہی، جودھپور کی مولانا آزاد یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ، مدارس اسلامیہ کی صورت حال، اردو صحافت اور اردو اخبارات کا مستقبل، خسرو فاؤنڈیشن سے وابستگی، غیر ملکی دورے اور دیگر مسائل و موضوعات پر بہت عمدہ گفتگو کی ہے جس سے اختر الواسع کی متنوع شخصیت اور ان کے مثبت اور صحت مند افکار و نظریات سے آگہی کی ایک عمدہ صورت نکلتی ہے۔ فاروق ارگلی کی مرتبہ اس کتاب میں اختر الواسع کی شخصیت پر لکھی گئی تمام تحریریں نہایت وقیع ہیں۔ فاروق ارگلی نے یہ بہت اچھا کیا کہ اختر الواسع کی نگارشات کا ایک جامع انتخاب بھی شامل کیا ہے جس کی وجہ سے اس کتاب کی اہمیت و معنویت دو چند ہو گئی ہے۔ اس میں ان کی اہم کتابیں امن و سلامتی کا راستہ (2002)، روشنی کا سفر (2008)، اجالوں کا سفر (2018)، فکر و فن کے چند اساطین (2020)، شنیدہ و دیدہ (2007)، کچھ اور چاہیے وسعت (2009) کے علاوہ ان کے مختلف النوع مضامین بعنوان گلہائے رنگارنگ شامل کیے گئے ہیں۔ یہ تمام تحریریں واقعی آج کے عہد کے لیے روشنی کا مینار ہیں۔ اسلامیات پر جو تحریریں ہیں وہ چشم کشا اور بصیرت افروز ہیں اور ادبیات کے حوالے سے غالب، میر، حالی، فیض احمد فیض، منٹو، کرشن چندر، عصمت، بیدی، شجاع خاور، مشتاق احمد یوسفی، پریم چند، ولی دکنی، سردار جعفری، قرۃ العین حیدر، ظفر پیامی، ذرائع ابلاغ اور اردو، اردو رسم الخط کا مسئلہ، تحریک آزادی اور قومی یکجہتی میں اردو کا حصہ نہایت جامع اور پر مغز مضامین ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامیات کے ساتھ ساتھ ادبیات پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔

پروفیسر اختر الواسع کی مجموعی خدمات کا یہ عمدہ اعترافیہ ہے۔ ضرورت ہے کہ زندہ شخصیات کی قدر شناسی ان کی زندگی میں ہی کی جائے۔ یہ ایک اچھی روش اور روایت ہے۔ اس سے ان شخصیات کے اندر نئی توانائی اور قوت بھی پیدا ہوتی ہے۔ فاروق ارگلی کی یہ کوشش قابل ستائش ہے پروفیسر اختر الواسع پر ضخیم کتاب مرتب کر کے انھوں نے اردو والوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد مظاہر الحق: حیات و خدمات

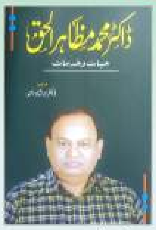

مرتب: ڈاکٹر ارشاد احمد

صفحات: 168، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: صغریٰ میموریل پبلک لائبریری، اسلامیہ نگر، سیوان، بہار

مبصر: انوار الحسن وسطوی، حسن منزل، روڈ نمبر 6، آشیانہ کالونی، سانچی پٹی، پوسٹ: حاجی پور، ضلع: ویشالی- 844101 (بہار)

پیش نظر کتاب کے مرتب ڈاکٹر ارشاد احمد ہیں۔ یہ کتاب اردو کے مشہور و معروف ادیب، محقق، ناقد، خاکہ نگار، انشائیہ نگار، سوانح نگار اور مترجم ڈاکٹر محمد مظاہر الحق (پٹنہ) کی حیات و خدمات پر لکھے گئے نامور مضمون نگاروں کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کا نام اردو دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ موصوف تقریباً ایک درجن کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ 2022 میں رسالہ 'رنگ' دھنباد (جھارکھنڈ) ان کی شخصیت اور خدمات پر ایک وقیع گوشہ شائع کر چکا ہے۔ کئی مشہور ادبی ادارے ان کی ادبی خدمات کے عوض انھیں انعام و اعزاز سے نواز چکے ہیں۔

'ڈاکٹر محمد مظاہر الحق حیات و خدمات' 168 صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کا آغاز مرتب کتاب ڈاکٹر ارشاد احمد کی تحریر بعنوان 'تقریظ' سے ہوا ہے۔ موصوف نے اپنی تحریر میں ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کے تعلق سے بہت صحیح لکھا ہے کہ:

''ڈاکٹر محمد مظاہر الحق اردو شعر و ادب کے خاموش خادم ہیں۔ آپ کا قلم رواں دواں ہے۔ آپ نے کبھی بھی اپنی تحریر کو سود و زیاں کے ترازو پر نہیں تولا اور نہ ہی کسی طرح کے صلے کی پروا کی۔ آپ سے قربت حاصل کرنے کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ آپ کا اردو ادب سے تعلق ہو۔ آپ اس فیلڈ میں مبتدی ہیں کہ منتہی اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر محمد مظاہر الحق ہر اردو داں کو نہایت عزیز رکھتے ہیں اور مختلف طریقوں سے مدد کرتے رہتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے ڈاکٹر محمد مظاہر الحق جیسی نابغۂ روزگار اور کثیر التصانیف شخصیت پر تحریر شدہ مضامین کی ترتیب و تزئین کاری کا کام کیا۔'' (ص: 13، 14)

پیش نظر کتاب 16 مضامین اور 3 منظوم تاثرات پر مشتمل ہے۔ کتاب کا پہلا مضمون جناب افتخار عظیم چاند کا ہے جس کا عنوان ہے 'ڈاکٹر محمد مظاہر الحق: شخص و عکس'۔ موصوف ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کے قریب ترین دوستوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا ڈھیر سارا وقت ڈاکٹر موصوف کے ساتھ گزارا ہے اور انھیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ لہٰذا انھوں نے اپنی مذکورہ تحریر میں اپنے عنوان کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ جناب افتخار عظیم چاند نے اپنے مضمون میں ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کے اخلاق و عادات، سیرت و کردار، ان کی کشادہ قلبی، دینداری، فیاضی، فراخ دلی، مہمان نوازی اور غریب پروری جیسی

خوبیوں کومختلف واقعات کے ذریعے اُجاگر کرتے ہوئے اپنے اوپر کیے گئے احسانات کا بھی برملا اعتراف کیا ہے۔ عبدالمجید حاجی پوری نے 'ڈاکٹر محمد مظاہر الحق ایک ذاتی تاثر' کے عنوان سے تحریر اپنے مضمون میں ڈاکٹر موصوف کے تصنیفی کارناموں کے تعلق سے اپنے تاثرات رقم کیے ہیں جو تفصیلی اور بھرپور ہیں۔ جہانگیر اُنس اور نثار احمد فیضی نے ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کی خاکہ نگاری پر اظہار خیال کیا ہے۔ دونوں مقالہ نگاروں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ موجودہ صدی کی پہلی دہائی میں جن ادیبوں نے اردو خاکہ نگاری میں اپنی شناخت قائم کی ہے ان میں ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کا نام نمایاں اور اہم ہے۔ ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کی حیثیت ایک مستند محقق کی بھی ہے۔ درجنوں تحقیقی مضامین کے علاوہ موصوف کی تین کتابیں 'خونی عاشق'، 'حکیم لطیف احمد اور ان کی تاریخ گوئی' اور 'سیدہ اور ان کی تاریخ گوئی' تحقیقی نوعیت کی کتابیں ہیں۔ لہٰذا ڈاکٹر ارشاد احمد نے بحیثیت محقق ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ ایک انشائیہ نگار کی حیثیت سے بھی ڈاکٹر موصوف کی انفرادیت ہے۔ چنانچہ ان کی انشائیہ نگاری پر ڈاکٹر رضوان اللہ آروی، ڈاکٹر محمد مصلح الدین اور ڈاکٹر محمد کوثر اعظم نے اپنے مضامین قلمبند کیے ہیں۔ ایم نصر اللہ نصر نے جہاں موصوف کی ظرافت نگاری پر خامہ فرسائی کی ہے وہیں ڈاکٹر قطب الدین اشرف نے ان کی مزاح نگاری کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا ہے۔ پروفیسر سراج نادر نے ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کی تصنیف 'مستند ہے میرا فرمایا ہوا' اور ڈاکٹر مقبول منظر نے موصوف کی تنقیدی تصنیف 'مقالاتِ نَو' پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ سید محفوظ عالم نے ڈاکٹر موصوف کی تصنیف 'سوانح حیات الحاج محمد ظہور عالم رضوی انوار' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ احسن امام احسن کی دو تحریریں شامل کتاب ہیں۔ پہلی تحریر میں ڈاکٹر موصوف کی ادبی کارگزاریوں کا جائزہ ہے جبکہ ان کی دوسری تحریر کا عنوان ہے 'ڈاکٹر محمد مظاہر الحق دانشوروں کی نظر میں'۔ جن دانشوروں کی آرا سے یہ مضمون مزین ہے ان کے اسمائے گرامی ہیں پروفیسر ڈاکٹر منظر اعجاز، پروفیسر ڈاکٹر محفوظ الحسن، ڈاکٹر شاہد جمیل اور پروفیسر ڈاکٹر ظفر کمالی۔ جناب پرویز عالم کی تحریر کا عنوان ہے 'ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کی کتابوں پر مشاہیر کی آرا'۔ جن مشاہیر کی آرا کو اس فہرست میں شامل کیا گیا ہے ان میں پروفیسر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی (پاکستان)، پروفیسر ڈاکٹر عبدالمغنی، پروفیسر سید شاہ عطاء الرحمن عطا کاکوی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر ڈاکٹر حسین احمد، پروفیسر ڈاکٹر محمد مصلح الدین، پروفیسر ڈاکٹر منظر اعجاز، پروفیسر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر ڈاکٹر ایم کمال الدین، پروفیسر ڈاکٹر محفوظ الحسن، پروفیسر ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، پروفیسر ڈاکٹر ظفر کمالی، پروفیسر ڈاکٹر رضوان اللہ آروی، پروفیسر محمود نہسوی، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر شاہد جمیل، ڈاکٹر صلاح الدین، ڈاکٹر محمد کوثر اعظم اور افتخار عظیم چاند کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ کتاب کے آخری حصے میں تین شعرا احسان سیوانی، احسن راشد اور یاور راشد کے منظوم تاثرات کے ذریعہ ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کے اوصاف حمیدہ اور ان کی ادب نوازی کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ یہ منظوم تاثرات بھی نثری تاثرات کی طرح لائق مطالعہ ہیں۔

ڈاکٹر محمد مظاہر الحق ابھی عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں ان سے مزید توقعات وابستہ نہ رکھنا ناسمجھی اور کم عقلی کی بات ہوگی۔ قابل مبارکباد ہیں ڈاکٹر ارشاد احمد جنھوں نے ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کی مزید نگارشات اور تصنیف کے منظر عام پر آنے کا انتظار کیے بغیر ان کی اب تک کی ادبی فتوحات اور خدمات پر مشتمل کتاب ترتیب دینے کا کارنامہ انجام دیا۔ عموماً حیات و خدمات پر کام ادبا شعرا کی وفات کے بعد کیا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر ارشاد احمد نے روایت سے بغاوت کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کی حیات و خدمات پر ایسے وقت میں یہ قابل قدر کام کیا ہے جب ڈاکٹر موصوف ابھی مزید ایک درجن کتابیں منظر عام پر لانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں موصوف کی صحت و سلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔

طنز و مزاح

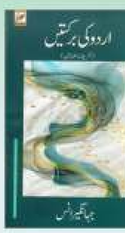

اردو کی برکتیں

مصنف: جہانگیر انس

صفحات: 192، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: محمد فیضان اللہ، ریسرچ اسکالر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی

'اردو کی برکتیں' جہانگیر انس کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ 30 مضامین اور ایک مقدمہ پر مشتمل ہے، مقدمہ عبدالوہاب قاسمی نے لکھا ہے۔

کتاب میں شامل مضمون 'ایک ناک والے کی فریاد' میں مختلف احوال و کوائف میں ناک کی کیفیت، ناک اونچی رکھنے، کٹنے، یا ناک میں دم وغیرہ محاوروں کا استعمال کر کے ناک کی وجہ سے دنیا میں جو فساد برپا ہے ان کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ 'پیاز نامہ' میں پیاز اور اس کی اہمیت کو برمحل محاوروں کا استعمال کر کے مضمون کو دلچسپ بنایا گیا ہے، ساتھ ہی بقیہ اہم اور سنجیدہ امور سے بے اعتنائی پر طنز کیا گیا ہے۔ 'سفر وسیلہ ظفر' میں طنزیہ انداز میں سفر کے احوال و کوائف، ٹرین ٹکٹ میں دھاندلی، ٹرین چلنے میں، مسافروں کی کثرت، جیب کترے جانے کے واقعات کو لطیف انداز میں پیش کیا ہے۔ 'دنیا گول' خالص ظریفانہ مضمون ہے، اس میں جغرافیہ کے استاد اور اس کے طلبہ کے درمیان سوال و جواب کی صورت میں دنیا کے گول ہونے کی دلچسپ وجوہ بتائی گئی ہیں۔ 'ہنسی' میں صاحب مضمون نے ہنسی کو موضوع بنایا ہے۔ ہنسی کی سائنسی و نفسیاتی وجوہات پر گفتگو کے بعد ہنسی کی قسمیں (جیسے مہذب ہنسی، غیر مہذب ہنسی، مسکین ہنسی، غمگین ہنسی) بھی بیان کی ہیں۔ 'دربیان مونچھ' میں مضمون نگار نے مونچھ پر محاروں کا استعمال کر کے مونچھ کے متعلق ایسی باتوں کو واشگاف کیا ہے جو بظاہر تو بہت معمولی لگتی ہیں لیکن حقیقت میں بہت اہم ہوتی ہیں۔ 'ماڈرن حکیم' بھی مزاحیہ مضمون ہے۔ مزاحیہ کے ساتھ اس میں عصر حاضر میں جدیدیت اور نئے پن کے نام پر جو لوٹ مچی ہوئی ہے اور ٹھگی کی جا رہی ہے اس کا بیان ملتا ہے۔ 'جھگڑنا اور جھگڑا لگانا' میں مصنف نے جھگڑے کو لڑائی کا منی ایڈیشن قرار دیا ہے اور یہ بھی کہ جھگڑنا انسانی فطرت ہے اور پھر کٹنا و کٹنی کی حرکتوں کو مثالوں سے واضح کیا ہے۔ 'ہم بھی صاحب تصنیف ہو گئے' بھی مزاحیہ مضمون ہے لیکن اس میں اردو اداروں اور کتابوں کی زبوں حالی، صاحب تصنیف بننے کی بے جا ہوڑ اور تعلق داری کی بنا پر جو کالا بازاری عام ہے، اس تشویش ناک حقیقت کا انکشاف ہے۔

'عمر کی چوری' میں مضمون نگار نے مختلف مثالوں اور حکایتوں کے ذریعے نفس انسانی کے مشہور مسئلے کو موضوع سخن بنایا ہے یعنی انسانوں کا خود کو کم عمر گردانتا۔ 'ماڈرن رخصتی' طنز پر مبنی ایسا مضمون ہے جس میں اک ماں رخصت ہونے والی بیٹی کو سسرال میں رہنے اور شوہر کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے ایسے حیلے و بہانے بتاتی ہے جو مستقبل میں خانگی بدمزگی کی وجہ ہوتی ہیں، اسی وجہ سے مضمون نگار نے اسے ماڈرن رخصتی کا نام دیا ہے جو کہ قدیم و روایتی رخصتی سے بالکل برعکس ہے۔ 'دو ملاؤں میں' مسلکی منافرت پر طنز کرنے والا مذہبی مضمون ہے، اس میں عام اور نارمل مسلمانوں کے حالات کو پیش کیا گیا ہے، جو مسلکی منافرت دیکھ کر الجھ جاتے ہیں کہ وہ کیا کریں کیونکہ ہر مسلک دوسرے کو اسلام مخالف گردانتا ہے مصنف نے اس طرح کے ملاؤں سے دور رہنے کی تلقین کی ہے۔ 'بازار جھوٹ' اس میں موجودہ وقت میں رائج جھوٹ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ 'شک' کا موضوع شک ہی ہے چند مثالوں کے علاوہ سگمنڈ فرائڈ، ایڈگر ایلن پو، چارلس

ڈکنسن کے حوالے سے شک کے مہلک انجام سے آگاہ کیا ہے۔ 'عظیم' میں مصنف نے حقیقت حال کو طنز کا جامہ پہنا کر میدان ادب کے علاوہ سچائی، نیکی، ایمان داری اور حسن کی کم یابی بلکہ نایابی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے ''سچائی کا نام ہے بے وقوفی، نیکی کا مطلب ہے اپنے پانو پر کلہاڑی مارنا اور حسن سے مراد ہے میک اپ''

'ہم نوشہ بنے' میں موجودہ دور کے اس رجحان کو پیش کیا ہے کہ بندہ جب تک پیروں پر کھڑا نہ ہو شادی نہیں کرسکتا۔ اس کے علاوہ اس مضمون میں ہندوستانی مسلم معاشرے میں شادی کے تمام رسوم و رواج کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے، مثلاً ہلدی کا ابٹن اور مہندی لگوانا، بہنوئیوں کا غسل کرانا، جامۂ نوشہ زیب تن کرنے کے لیے خاص تخت پر جانا، بوڑھے بچے جوان سب کا اردگرد موجود ہونا، پگڑی بندھوانا، دو رکعت نفل نماز پڑھنا، بارات کا جانا، پھر نوشہ کا سسرال کے آنگن میں جانا وغیرہ۔ 'میں بیوی اور وہ' اور 'تیر بہدف' میاں بیوی کے رشتے پر مبنی ہے۔ مصنف نے 'وہ' کے ذریعے اس لطیف شک کی طرف اشارہ کیا ہے جس کے ذکر سے زوجین کو لطف آتا ہے جس کا حقیقت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، اور اس وہ کے ذریعے بیوی اپنی بھڑاس نکالتی ہے جبکہ شوہر اس سے محظوظ ہوتا رہتا ہے۔ 'چمچے' میں چمچوں کی مختلف قسمیں بتائی گئی ہیں انھیں قسموں میں انسانی چمچوں کا بھی ذکر ہے اور ان کی بھی قسمیں بیان کی گئی ہیں اور ہر طرح کے چمچوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ 'داڑھی کی باتیں' میں مضمون نگار نے عہد قدیم سے ماضی قریب تک کے داڑھی کے متعلق بدلتے تناظر کو پیش کیا ہے۔

ڈسکو ساڑی، ایک انٹرویو، ساری خدائی ایک طرف، نوک جھونک اور 'گرداب الف' وغیرہ مضامین بھی اہم ہیں۔ آخر الذکر مضمون میں الف کو موضوع بنا کر اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا ہے اور یہ گرداب الف یعنی اماں ابا، اذان، ایمان، اسلام، ابتدا، انتہا، وغیرہ لفظ جو الف سے ہیں، ان کے استعمال سے مضمون کو اچھوتے انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔

مذکورہ تمام مضامین کے مطالعے سے نتیجہ نکلتا ہے کہ مصنف نے اس مجموعے میں سیاسی، سماجی، خانگی، اور نفسیاتی احوال وکوائف کو بہت ہی پر لطف اور خوبصورت انداز میں پیش کر قاری کو محظوظ ہی نہیں بلکہ علم و اصلاح کے زیور سے بھی آراستہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

ترتیب

مغربی بنگال میں اردو تحقیق و تنقید : مسائل و امکانات

مرتب: ڈاکٹر سید علی عرفان نقوی

صفحات: 176، قیمت: 350 روپے، سال اشاعت: 2023

ناشر: شعبۂ اردو، خضر پور کالج، کولکاتا–23

مبصر: سعدیہ صدف

67، کولوٹولہ اسٹریٹ، کولکاتا– 700073

خطۂ مغربی بنگال، ادبی پیش رفت میں کبھی بھی پیچھے نہیں رہا، یہ اور بات کہ نثر کے مقابلے شاعری ہر دور میں حاوی رہی اور تحقیق و تنقید کا میدان طویل مدت تک خالی رہا۔ یوں بھی یہ موضوعات ذرا خشک ہیں کہ ان پر طبع آزمائی کے لیے وسیع مطالعہ، سنجیدگی اور صبر و تحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ قدما میں سے چند اکابر نے اس جانب توجہ کی مگر وہ بھی تشفی بخش نہ تھی۔ بعد ازاں جب اس ضمن میں سنجیدگی برتی گئی تو یہاں کی ادبی فضا کا نقشہ ہی بدل گیا۔ نساخ ہوں کہ وحشت، شانتی رنجن بھٹاچاریہ ہوں کہ ڈاکٹر عبدالرؤف، یہ تمام نام ایسے ہیں جنھوں نے ساری زندگی اسی دشت کی سیاحی میں گزار دی۔ ان ہی اشخاص میں ایک نام ڈاکٹر سید علی عرفان نقوی کا بھی ہے۔ عرفان نقوی صاحب کا شمار ان اہل علم میں ہوتا ہے جو شور و غل سے دور انتہائی خاموشی سے تحقیق و تنقید کے سمندر میں غوطہ زن، بطن صدف سے گوہر مراد کے حصول میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اسی غوطہ زنی کا ثمرہ ان کی تصنیفات 'وحشت کلکتوی: حیات و کارنامے' (2017) اور 'رباعیات میر تقی میر' (2018) ہیں۔

ان کی مرتبہ زیر نظر کتاب 'مغربی بنگال میں اردو تحقیق و تنقید: مسائل و امکانات' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو 2023 میں منظر عام پر آئی ہے۔ یہ کتاب خضر پور کالج کولکاتا کے ذریعہ 2022 میں منعقدہ قومی سیمینار میں پڑھے گئے 11 مقالوں کا مجموعہ ہے۔ مرتب کا پیش لفظ مختصر، مکمل اور جامع ہے۔ جس میں انہوں نے مغربی بنگال میں تحقیق و تنقید کی کمزور روایت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس کے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔

مرتب نے معروضی طور پر ان نکات کو نشان زد کیا ہے جو اس سلسلے میں خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کے مطابق بنگال میں تحقیق و تنقید کے سلسلے میں ناقدین کھٹے میٹھے جملے کا استعمال کرتے ہیں لیکن اس میں حقیقت سے زیادہ احساس کمتری اور تعصب پوشیدہ ہے:

''...اس طرح کے کھٹے میٹھے جملے اور اقتباسات آپ کو بنگال اور بیرون بنگال کے اکثر ادیبوں کے یہاں ملیں گے۔ اس میں کچھ حد تک سچائی بھی ہے لیکن بڑی حد تک احساس کمتری اور تعصّبات پوشیدہ ہیں۔''

یہ سچ ہے کہ ہم اپنوں سے زیادہ دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اہل بنگالہ تساہل پسند بھی ہیں اس لیے نہ تو خود اپنی تخلیقات پر لکھا نہ لکھوایا۔ جب کہ ادھر چند برسوں میں مثبت تبدیلیاں دیکھنے کو مل رہی ہیں:

''بنگال کے لوگ تساہل پسند ہیں۔ بنگال کے فن اور فن کار پر خود تنقیدی مباحث اور اس کی قدر و قیمت لگانے کے بجائے بیرون صوبہ کے ناقدین کی تحریروں کے منتظر رہتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ایک لمبے عرصے تک بنگال کی تخلیقات اور فن کاروں (فورٹ ولیم کالج کو چھوڑ کر) سے لکھنؤ اور دہلی کے تذکرہ نگاروں اور تنقید نگاروں نے تعصب کی حد تک بے توجہی برتی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ بنگال کے لوگوں نے اپنی تخلیقات پر خود لکھا نہ لکھنؤ یا دہلی کے ناقدین تک اپنی تخلیقات بھیجیں اور نہ ہی سیمینار اور سمپوزیم یا ورک شاپ کے عنوان سے پروگرام کا اہتمام کیا۔ پچھلے دس برسوں میں اس قسم کے جلسے ملتے ہیں ورنہ مشاعرے سے قطع نظر نثر کی بزم خال خال اور مخصوص دائرے میں ہوا کرتی تھی۔ صوبہ بہار کے ادیبوں کو دعوت دینے کا چلن بھی محدود تھا۔''

یوں سمجھ لیجیے کہ عرفان نقوی کا یہ پیش لفظ اس کتاب کا حاصل ہے۔ کیونکہ تخلیق کار تنقیدی و تجزیاتی صلاحیت تو رکھتا ہے لیکن تحقیقی صلاحیت ہر کس و ناکس میں موجود نہیں ہوتی۔ لہٰذا ریاستی سطح پر ایسے مشکل موضوع کا انتخاب اور اس پر سیمینار کرانا بذات خود مرتب کی دور اندیشی اور ان کی مشکل پسند طبیعت پر دال ہے۔

کتاب میں شامل پہلا مضمون معروف ناقد ظہیر انور کا تحریر کردہ 'آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اردو تنقید' (چند معتبر تنقید نگاروں کے حوالے سے) ہے۔ جس میں مصنف نے مغربی بنگال میں اردو تنقید کی روایت اور چند اہم ناقدین کے افکار و اسلوب سے بحث کی ہے۔

دوسرا اہم مضمون بعنوان 'آزادی کے بعد مغربی بنگال میں فکشن کی تنقید: ایک اجمالی جائزہ' فکشن ناقد مقصود دانش کا ہے جس میں انھوں نے اجمالی طور پر بنگال میں فکشن تنقید کے تسلسل اور مشہور فکشن نگاروں مثلاً انیس رفیع، ابوذر ہاشمی، ظہیر انور، ف س اعجاز، کلیم حاذق، شبیر احمد اور دبیر احمد کی تنقیدی صلاحیتوں کی ستائش کی ہے۔

''اس کتاب میں انھوں نے ان سبھی کرداروں پر چابک دستی سے قلم اٹھایا ہے اور مختلف کرداروں کے توسط سے جزئیات نگاری اوراظہار یگانگت جورام سے منسلک ہے، اسے فروغ دیا ہے... انھوں نے اپنی ان نظموں کے ذریعے تخلیقی رزمیہ (Creative Epic) کو اپنایا ہے۔عہد حاضر میں ایسے تخلیق کار نہیں ہیں جو(Creative Epic) پر قلم اٹھائیں لیکن شکیل اعظمی نے یہ کام کرکے اردو شاعری میں اپنا الگ مقام بنایا ہے۔'' (ص، 42-41)

کوثر مظہری نے شکیل اعظمی کے فکر وفن، تخلیقی ہنر اور بنواس تفہیم پر مدلل ومفصل گفتگو کی ہے۔انھوں نے بنواس' کی شاعری کو Ecosystem، جمہوریت اور انسانیت کے تناظر میں پرکھنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔وہ اس کتاب پر اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اگر دیکھا جائے تو پوری کتاب Eco Poetry کا خوبصورت مرقع ہے یا یوں کہہ لیں کہ جنگل ایک کینوس ہے جس پر شکیل اعظمی نے چھوٹی چھوٹی نقاشی اور مصوری یعنی Miniature Painting کے ذریعے ایک ایسا متحرک کولاژ خلق کیا ہے جس پر دور ہی سے قدرت کے مناظر متحرک نظر آتے ہیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوگا کہ شکیل اعظمی نے اپنی شاعری میں جنگل کی تہذیبی، تمدنی، سماجی اور ماحولیاتی اقدار کی پاسداری کس طرح کی ہے۔انھوں نے کس طرح جنگل کو دنیا اور سماج کا بنیادی استعارہ بنا کر تخلیقی ادب کے لیے ایک نئی راہ ہموار کی ہے۔شکیل اعظمی جنگل کے چھوٹے چھوٹے پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہوئے جنگل کے ہر رنگ کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور کس طرح دیومالائی کرداروں کے ذریعے ایک ماحول بنانے کی سعی کرتے ہیں۔گویا شکیل اعظمی کی شاعری کو سمجھنے کے لیے بالخصوص 'بنواس' کی تفہیم کے لیے یہ تمام تر مضامین مفید و معاون ثابت ہوں گے۔امید ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقے میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور قارئین اس کتاب کے مطالعے سے اپنے ذوق وشوق کو سیراب کریں گے۔

روہیل کھنڈ میں اردو افسانہ

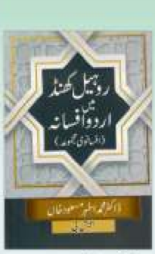

مرتبین: ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں، بینش بی

صفحات: 404، قیمت: 800 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں

مبصر: نشاں زیدی، B-63/S-2، ڈی ایل ایف کالونی

صاحب آباد، ضلع غازی آباد۔ 201005

'روہیل کھنڈ میں اردو افسانہ' کے مرتبین ڈاکٹر اطہر مسعود اور بینش بی ہیں۔اس میں روہیل کھنڈ کے ان 46 افسانہ نگاروں کے افسانوں اور افسانچوں کو شامل کیا گیا ہے جو باحیات ہیں۔موت کب دبے پاؤں دستک دے کچھ خبر نہیں۔مجموعہ کی تکمیل کے دوران مرتضٰی ساحل تسلیمی، ڈاکٹر فرقان سنبھلی، شکیل انوار صدیقی اور شبنم امروہوی اس دار فانی سے رخصت ہوگئے۔ڈاکٹر شریف قریشی اردو افسانے پر خاص نظر رکھتے ہیں۔ان کی کتاب 'رام پور میں اردو افسانہ' ایک اہم کتاب ہے۔کتاب کے ابتدائی صفحات میں ڈاکٹر شریف قریشی کا ایک مضمون شامل کیا گیا ہے۔28 دسمبر 2023 کو اردو کے مایہ ناز ادیب ڈاکٹر شریف نے بھی دنیا کو خیرباد کہہ دیا۔

'روہیل کھنڈ میں اردو افسانہ' اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس میں مرتبین نے ان افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو بھی شامل کیا ہے، جنھوں نے محض ایک دو افسانے ہی لکھے۔کتاب میں جہاں مرد افسانہ نگاروں کے افسانے ہیں، وہیں خواتین کے افسانوں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔کتاب میں 21 افسانے خواتین کے ہیں۔کتاب کی ترتیب میں جونیئر سینئر قلم کار کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی ہے سبھی افسانہ نگاروں کے ناموں کو حروف تہجی کے مطابق رکھا گیا ہے۔کتاب میں شامل تمام افسانے الگ الگ موضوعات پر ہیں۔ان افسانوں کے بارے میں ڈاکٹر اطہر مسعود لکھتے ہیں:

''اس کتاب میں شامل سبھی افسانے منفرد اور الگ الگ موضوعات پر مشتمل ہیں۔سب کے تھیم، مرکزی خیال، پلاٹ، موضوع اور اسلوب میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔اس کتاب میں کئی افسانے بہت اچھے اور دل کو چھو لینے والے ہیں۔کچھ افسانے اصلاح کا پہلو بھی رکھتے ہیں اور ایک افسانہ علامتی انداز کا بھی شامل ہے۔''

یوں تو ہر افسانہ موضوع کے اعتبار سے منفرد ہے لیکن کچھ افسانے ایسے ہیں جو قاری کو تادیر سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔انہی افسانوں میں ایک افسانہ 'کفن' بھی ہے، کفن مشہور افسانہ نگار پریم چند کا شاہکار افسانہ ہے جس میں مادھو اور گھیسو کے لالچی کردار کو پیش کرتے ہوئے سماج کے پسماندہ طبقے کی عکاسی کی گئی ہے۔اس کتاب میں شامل افسانہ 'کفن' ڈاکٹر اطہر مسعود کا ہے جس میں دو لالچی لڑکوں کی ذہنیت کو دکھایا گیا ہے۔ساتھ ہی افسانہ نگار نے یہ بات بھی ذہن نشین کرائی ہے کہ انسان پیسے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے۔

انجم بہار شمسی کا افسانہ 'ذات کا سفر' بھی ایک اچھا افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار نے ان خواتین کی ذہنیت کی عکاسی کی ہے، جن کے لیے شوہر کی محبت سے زیادہ اسٹیٹس کی اہمیت ہوتی ہے۔وہ مرتے دم تک اسٹیٹس کے پیچھے دوڑتی رہتی ہیں۔اسی نوعیت کا افسانہ ناظمہ جبیں کا بھی ہے۔ناظمہ جبیں نے اپنے افسانے 'رائگاں بلندی' میں ان مردوں کی عکاسی کی ہے جو دولت کی خاطر غیر ممالک کو اپنا مسکن بنالیتے ہیں اور وہاں کی چکاچوندھ میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ انھیں خونی رشتوں کی اہمیت بھی یاد نہیں رہتی اور جب والدین جیسی نعمت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہوجاتے ہیں، تو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور یہ کرب ان کو مرتے دم تک ستاتا رہتا ہے۔پھر ان کو سارے عیش وآرام بے معنی لگنے لگتے ہیں۔وہ بلندی کی منازل طے کرنے کے باوجود خود کو پستی میں محسوس کرتے ہیں۔نصرت شمسی اور ترنم جہاں شبنم کے افسانے بھی قاری کی توجہ مبذول کرنے میں کامیاب ہیں۔ترنم جہاں شبنم نے 'کوکھ کی تلاش' میں ان بچیوں کے درد کو کہانی کے قالب میں ڈھالا ہے جو اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی قتل کی جاتی ہیں۔نصرت شمسی نے 'بوجھ' افسانے میں ان والدین کی ذہنیت کو پیش کیا ہے جو لوگ اپنی جائداد کو اپنا سرمایہ سمجھتے ہیں اور اولاد کی تعلیم وتربیت پر اپنی جائداد کو ترجیح دیتے ہیں۔پھر وقت نکل جانے کے بعد ان کی اولاد ان کو بوجھ سمجھنے لگتی ہے۔قمر قدیر ارم جہاں ایک اچھی شاعرہ ہیں، وہیں بہترین افسانے بھی لکھتی ہیں 'دھندھ اور دھوئیں کے درمیان' ایک اچھا افسانہ ہے۔اس افسانے میں قمر قدیر ارم نے سماج کے مختلف مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک عورت کی تنہائی کے کرب کو پیش کیا ہے۔سفینہ بیگم نے 'خوف کے سائے' میں ایک غریب طبقے کی عکاسی کی ہے، جس کا ایک فرد بھوت بنگلے میں کام کرتا ہے اور زیادہ پیسہ کمانے کے لیے ہر طرح کی کوشش کرتا ہے، طرح طرح کی ترکیبیں سوچتا رہتا ہے۔نکہت آرا نے اپنے افسانے 'ساجھا چولہا' میں بڑے خاندان کی خوشحالی کا ذکر کرتے ہوئے سمٹتے خاندانوں کا ذکر کیا ہے۔

طالب رام پوری سینئر افسانہ نگار ہیں ان کا افسانہ 'مِیچ فکسر' دل کو چھو لینے والا افسانہ ہے۔افسانہ ایک مثبت جملے سے شروع ہوتا ہے ''کسی کا مستقبل سنوارنے کے لیے اگر تمھارا تھوڑا سا نقصان ہوجائے تو برداشت کرلینا چاہیے۔'' پورے افسانے میں اس خیال کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔

ذاکر فیضی کا افسانہ 'وائرس' بھی ایک اچھا افسانہ ہے، جس میں انھوں نے ایک ایسے قاتل کی کہانی بیان کی ہے جس کا کام راہزنی ہے اور ایک دن وہ ایک ایسے معصوم کو شکار بنالیتا ہے جو اپنی ماں کا واحد سہارا ہے۔ روبینہ رحمٰن راعی کا افسانہ 'کاش لڑکا ہی ہوتا' معاشرے کے ایسے المیے کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو ہمارے سماج میں ہمیشہ سے رائج ہے، سماج میں آج بھی بیٹیوں کو کچھ لوگ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ شکیل انوار صدیقی کا افسانہ 'اپنا گھر' دلچسپ ہے اور قاری کے ذہن پر اچھا اثر چھوڑتا ہے۔ فرقان سنبھلی کی کہانی 'آب حیات' خوبصورت پیرایے میں لکھی گئی بہترین کہانی ہے جس میں انھوں نے قدرت سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے نتائج پر توجہ مبذول کراتے ہوئے پانی کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

ایمن تنزیل کا افسانہ 'آدھا خواب' مختصر سا افسانہ ہے لیکن قاری کے ذہن پر چھاپ چھوڑنے میں کامیاب ہے۔

مذکورہ افسانوں کے علاوہ بھی کچھ افسانے بہترین ہیں اور ان میں سماجی مسائل کو سلیقے سے پرویا گیا ہے۔ افسانوں کے تھیم، مرکزی خیال، پلاٹ اور موضوع میں انفرادیت ہے۔ کچھ افسانے سپاٹ سے ہیں اور کہانی پن سے عاری بھی ہیں۔ مجموعی طور پر اس کتاب میں شامل افسانوں کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ روہیل کھنڈ کے بیشتر افسانہ نگاروں کا مطالعہ وسیع ہے اور سماج کے مختلف موضوعات پر ان کی گہری نظر ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اہل علم ودانش میں یہ افسانوی انتخاب اہم مقام حاصل کرنے میں کامیاب اور مستقبل میں افسانوں کے موضوع پر کام کرنے والے طلبا کے لیے سودمند ثابت ہوگا۔

فکشن

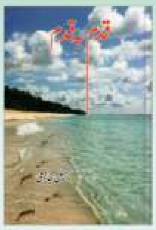

قدم بہ قدم

مصنف: سہیل جامعی

صفحات: 160، قیمت: 300 روپے

ناشر: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، دربھنگہ، بہار

مبصر: فرحانہ نازنین، اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

سہیل جامعی کا شمار عصر حاضر کے سلجھے ہوئے باوقار قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ سہیل جامعی نے لگ بھگ تیرہ کتابیں تصنیف کی ہیں، ان کی 13 ویں کتاب قدم باقدم افسانچوں کا مجموعہ ہے۔ یوں تو فن افسانچہ نگاری کا آغاز 70,80 کی دہائی میں ہی ہو چکا تھا مگر اس وقت اس کی شناخت اور ادبی حیثیت کا تعین نہیں ہوا تھا۔ سعادت حسن منٹو کے 'سیاہ حاشیہ' تک یہ فن اپنی شناخت کے مراحل میں ہی محوِ سفر رہا۔ منٹو کے وقت تک یہ صنف منی کہانی، مختصر افسانہ، ایک صفحہ کہانی ہی کہلاتا رہا پھر جوگیندر پال نے افسانہ کے طرز پر اس کا نام افسانچہ رکھا اور پہلا افسانچوں کا مجموعہ جوگندر پال کے نام سے ہی منسوب ہے۔ جوگندر پال کے بعد بہت سے مصنفین نے اس فن میں طبع آزمائی کی اور اردو ادب کو کئی کامیاب افسانچوں کے مجموعے دیے۔ افسانچہ دراصل کم سے کم لفظوں میں زندگی کے کسی ایک واقعے کو کہانی کی شکل میں پیش کرنا ہے۔ دور جدید میں اس صنف نے کافی ترقی کی ہے اور مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اپنی ایک کامیاب صنفی شناخت بنالی ہے۔ اب اردو داں طبقہ اس صنف کی نہ صرف پذیرائی کرتا ہے بلکہ اسے اردو ادب میں ایک کامیاب صنف کا درجہ بھی حاصل ہوگیا ہے۔ بہر حال اس صنف نے اب اردو ادب میں اپنی ایک مستحکم حیثیت تسلیم کرالی ہے۔

سہیل جامعی کی شناخت ایک نفسیاتی افسانہ نگار کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانے انسانی نفسیات کے درمیان ہی پروان چڑھتے ہیں۔ انھوں نے انسانی نفسیات کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا اور بہت ہی چابک دستی وکامیابی کے ساتھ اپنے افسانوں میں اسے پیش کیا ہے۔ قدم باقدم بھی سہیل جامعی کے ایک ایسے ہی افسانچوں کا مجموعہ ہے جس میں جابجا انسانی نفسیات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس کتاب میں لگ بھگ 160 افسانچے شامل ہیں اور سہیل جامعی کے سارے افسانچے انسانی نفسیات کی گتھیوں کو سلجھانے اور اس کے گوناگوں پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان افسانچوں میں اپنے حالات اور آس پاس کے مسائل کی بھی عکاسی ہوتی ہے، بدلتے وقت نے انسان کو کن اخلاقی وسماجی مسائل سے دوچار کیا ہے، اس کا عکس بھی جابجا ان کے افسانچوں میں بکھرا ہوا نظر آتا ہے۔

اس افسانچے میں انسانی نفسیات کے ساتھ انسان کی اخلاقی اور سماجی پسماندگی کی جو چیخ سنائی دیتی ہے، وہ ایک حساس قاری کو جھنجھوڑ کر جگا دینے کا کام کرتی ہے۔ سہیل جامعی کے بیشتر افسانچے سماج کے بدلتے رجحانات ونظریات کی عکاسی کرتے ہیں۔ 'سوچ کا آئینہ'، 'کھلا دروازہ'، 'تشنگی' کچھ ایسے ہی افسانچے ہیں جو مکمل طور پر بدلتے ہوئے سماجی رجحانات ونظریات کی نمائندگی کرتے ہیں، جب کہ سمجھوتہ، نئی دشا، سہارا، ڈرپوک، لمحہ فکریہ، کیسے بتائے جیسے افسانچے انسانی نفسیات کی مکمل تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان افسانچوں کو پڑھتے ہوئے قاری کبھی تو چونک جاتا ہے، کبھی حیرت کے بحر بیکراں میں غوطہ زن ہوتا ہے، تو کبھی افسردہ وملول ہو جاتا ہے۔ غرض کہ سہیل جامعی کے افسانچے قاری پر ایک خاص اثر ڈالتے ہیں۔ سوچ کے نئے نئے زاویوں کو کھولتے ہیں اور زندگی کے نئے نئے واقعات سے روشناس کراتے ہیں۔

مجموعی طور پر 'قدم باقدم' ایک دلچسپ، پراثر افسانچوں کا مجموعہ ہے۔ یہ افسانچے کی دنیا میں اپنے ایک الگ اور نئے اسلوب کی وجہ سے منفرد مقام بنالے گا۔

رسائل و جرائد

امکان (مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کا علمی وادبی جریدہ)

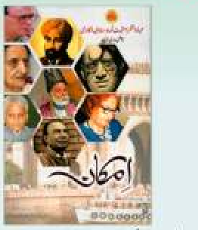

ایڈیٹر: سید شعیب ہاشمی

صفحات: 200، قیمت: 50 روپے

ناشر: مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی، ڈی ڈی بلڈنگ اولڈ کسٹم ہاؤس، شہید بھگت سنگھ مارگ، فورٹ ممبئی-4

مبصر: صدر عالم گوہر (بھیونڈی، مہاراشٹر)

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کا علمی وادبی جریدہ امکان ایک اہم جریدہ ہے کیونکہ یہ جریدہ عام ڈگر سے ہٹ کر اپنی انفرادی شناخت رکھتا ہے۔ اس میں وقتاً فوقتاً ایسی نادر تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں جنھیں تلاش بسیار کے باوجود حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

زیر نظر جریدہ امکان کا تیسواں شمارہ ہے۔ اس شمارے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ اردو کے تین معروف ادیبوں راجندر سنگھ بیدی، سلمٰی صدیقی اور ساحر لدھیانوی کی ذاتی زندگیوں سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے۔

اس شمارے میں ماہر قلم کاروں کی پیاری پیاری باتوں اور ان کے لکھنے کے انداز نے اسے خاص بنا دیا ہے۔ جیسے قرۃ العین حیدر، جن کا ادبی مقام مسلم ہے۔ اس شمارے میں ان کا مضمون 'ایک اہم اسکالر ڈاکٹر رفیق زکریا' بہت ہی دلچسپ ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر رفیق زکریا کو خراج عقیدت اور بمبئی جواب ممبئی ہوگئی ہے اس کی تہذیب وتمدن کو بیان کیا ہے۔

اس شمارے کا دوسرا مضمون 'منٹو صاحب' بھی خاصے کی چیز ہے۔ کوئی مضمون نگار کتنا سچا ہے یہ اس کی تحریر سے پتہ چلتا ہے۔ کمال احمد رضوی نے سعادت حسن منٹو پر یہ مضمون لکھا ہے۔ یہ مضمون کیا ہے، خراج عقیدت ہے۔ لیکن یہ مضمون کتنی ایمانداری سے لکھا گیا ہے یہ پڑھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کمال احمد رضوی منٹو سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ بہت ہی عزت کرتے تھے اور دل ہی دل میں سوچتے تھے کہ منٹو تک کیسے رسائی ہو۔ انھوں نے اس کا ذکر بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ تیسرا مضمون ہے، 'کنیز فاطمہ: جنھیں برے خواب کو اچھے خواب میں بدلنا آتا تھا' یہ مضمون ڈاکٹر عتیق اللہ نے لکھا ہے۔ یہ مضمون بھی خراج عقیدت ہے اورنگ آباد کی ایک ادیبہ کو جو مضمون نگار کی شاگردہ بھی تھیں۔

چوتھا مضمون 'دشمنان غالب اور غالب' ڈاکٹر ظ انصاری کا یہ مضمون بھی اہم ہے۔ چونکہ ڈاکٹر ظ انصاری نے خود ہی کہا تھا کہ میری ساری تحریریں دریا برد کر دی جائیں، اس لیے ظ انصاری کی تحریروں کو بعد میں نہ تلاش کیا گیا اور نہ توجہ دی گئی۔ میں بذات خود ڈاکٹر ظ انصاری کی تحریر و تقریر سے بہت متاثر رہا۔ کئی اسٹیج پر ان کو تقریر کرتے ہوئے دیکھا اور جب تک وہ انقلاب کے مدیر رہے ان کے اداریے کو کاٹ کر رکھتا تھا۔ لیکن زمانے کے سرد و گرم کے ساتھ ان کی وصیت کے مطابق وہ ساری تحریریں بھی دریا برد ہو گئیں۔ امکان میں ان کا ایک مضمون نظر آیا تو میں نے بغور اسے پڑھا اور پڑھ کر نہ صرف متاثر ہوا بلکہ میری معلومات میں بھی اضافہ ہوا۔ یہ مضمون قاضی عبدالودود کی تحقیق سے متعلق ہے۔ پانچواں مضمون 'میں اور بمبئی' ہے۔ یہ یوسف ناظم کا مضمون ہے۔ جس میں انھوں نے کرشن چندر، سلمیٰ صدیقی، خواجہ احمد عباس، شام کشن نگم، راہی معصوم رضا، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر اور کیفی اعظمی کو یاد کیا ہے۔

چھٹا مضمون 'ترقی پسند مصنفین کی بھیونڈی کانفرنس کے چند منتشر اوراق' ہے۔ جسے ملک تاسے نے تحریر کیا ہے۔ یہ مضمون بھی اپنی نوعیت کا ایک اہم مضمون ہے۔ 'آل انڈیا ریڈیو، ممبئی، بزم اردو' ممبئی اور اردو کے تعلق سے تحریر کیا گیا سعید راہی کا مضمون ہے۔ بزم اردو کی ریڈیو نشریات میں اردو کے لیے کیا کیا کوششیں کی گئیں، ان کا ذکر ہے۔ کس طرح بزم اردو میں ہندو پاک کے سارے بڑے شاعر، ادیب، گلوکار، موسیقار کو اپنے پروگراموں میں مدعو کیا، ان کے انٹرویو، افسانے، مضامین، غزلیں، گلوکاری وغیرہ ریکارڈ کیے گئے، ان تفصیلات کا بیان ہے۔

'راجندر سنگھ بیدی: ایک یاد' یہ مضمون رفعت سروش کا ہے۔ جس میں راجندر سنگھ بیدی کو یاد کیا گیا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی پر ایک اور اہم مضمون اوپندر ناتھ اشک کا ہے جس کا ترجمہ شاہد ندیم نے کیا ہے۔ شاہد ندیم 'امکان' کے مدیروں میں شامل ہیں اور انھوں نے ایسا ترجمہ کیا ہے کہ یہ ترجمہ نہ ہو کر اصل مضمون معلوم ہوتا ہے۔ یہ ان کی بہترین ترجمہ نگاری کی ایک مثال ہے۔ اس مضمون کا نام ہے 'راجندر سنگھ بیدی کی زندگی کا آخری باب' یہ مضمون اتنے دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے کہ پڑھیے تو پڑھتے جایئے۔ راجندر سنگھ بیدی جتنے اچھے افسانے لکھتے تھے، ان کی زندگی ان افسانوں سے کم دلچسپ نہیں ہے۔

یہ شمارہ سلمیٰ صدیقی پر بھی خصوصی طور سے شائع کیا گیا ہے، اس لیے اس شمارے میں سلمیٰ صدیقی پر شاہدہ منیر عالم کا ایک مضمون خواتین افسانہ نگاروں میں معتبر نام: 'سلمیٰ صدیقی' اور اسلم پرویز کا انٹرویو 'سلمیٰ صدیقی کا ایک انٹرویو جو غالباً ان کا آخری تھا'۔ شامل ہے۔

اس شمارے میں ساحر لدھیانوی پر حافظ لدھیانوی کا ایک مضمون ہے۔ جو بہت متاثر کرتا ہے۔ ساحر کی شاعری کو انقلابی شاعری کی طرف موڑنے کی جو ترغیب ملی، وہ کیسے ملی، اس کا بھی ذکر مصنف نے کیا ہے۔ ساحر کے معاشقوں کا بھی ذکر ہے۔ کالج کے زمانے سے ساحر عاشق مزاج تھے اور ان کا معاملہ شروع سے رہا ہے 'چلو ایک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں'۔

'وقت کے چاک پر: قاضی سلیم'۔ اس مضمون کو عارف خورشید نے تحریر کیا ہے اور خوب تحریر کیا ہے۔ قاضی سلیم کو سمجھنے میں اس مضمون سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اورنگ آباد کئی معنوں میں اہم ہے۔ اس نے اردو دنیا کو بہت سے لعل و جواہر دیے، سراج اورنگ ابادی کی یہ دھرتی ہے، اسی سرزمین سے بشر نواز اور قاضی سلیم جیسی نابغہ روزگار شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ یہ مضمون قاضی سلیم کی ہر چھوٹی بڑی باتوں کا احاطہ کرتا ہے۔

ندیم صدیقی کا مضمون 'مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں' میں ندیم صدیقی نے گوپی چند نارنگ کو یاد کیا ہے اور اردو کے حوالے سے بہت سی باتیں کہی ہیں۔ 'اردو کے گہوارے' عنوان سے مبشر اکبر نے صوبہ مہاراشٹر میں اردو زبان و ادب کے مراکز جن جن مقامات پر ہیں اور بخوبی پھل پھول رہے ہیں ان پر بات کی ہے۔ اس شمارے کا اگلا مضمون ہے 'محمد بہاء الدین: یاد کریں گی صدیاں'۔ اس کے مضمون نگار سید محمود علی سحر ہیں۔ محمد بہاء الدین نے اردو کے ارتقا میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو اکیڈمی کے قیام کے لیے کوشاں رہے اور آخر کار اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا۔ اس مضمون میں محمد بہاء الدین کی حیات و خدمات کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔

''اصغر حسین قریشی: ایک ستارہ جو ڈوب گیا'۔ میں مدیر 'تکمیل' کو مبشر اکبر نے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ 'قرۃ العین حیدر: ایک عہد ساز شخصیت' میں صبا ناز محمد انصاری نے قرۃ العین حیدر کو یاد کیا ہے اور آخر میں سلام و پیام کے تحت امکان میں لکھے گئے قارئین کے خطوط شامل کیے گئے ہیں۔ ■

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورت حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔بس اس کی شکل وصورت ذراسی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبرنامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان وادب کی سمت و رفتار کا بھی۔

یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دہلی

یوم غالب

دہلی: انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام غالب کے یوم وفات پر 'یومِ غالب' کا انعقاد کیا گیا۔ دوپہر تین بجے ایوانِ غالب میں مذاکرے، بزم موسیقی اور مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ مذاکرے کی صدارت کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) کے صدر جناب اقبال مسعود فاروقی نے کہا کہ غالب صدی کے موقعے پر غالب کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر غالب سے متعلق نہایت معیاری لٹریچر شائع ہوا لیکن اپنی تمام خوبیوں کے باوجود اس میں کچھ غلطیاں بھی در آئی ہیں۔ ہمارے علمی اداروں کا فریضہ ہے کہ ان غلطیوں کی نشان دہی کرکے خواہ وہ ضمیمے کی شکل میں ہوں متن کے ساتھ شائع کریں۔ انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) کے جنرل سکریٹری جناب خورشید عالم نے کہا کہ غالب کی شاعری ہو یا نثر اس نے اردو کو جدید اسلوب سے متعارف کرایا ہے۔ وہ صرف اردو ہی نہیں عالمی ادب میں ہندستان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) نے ہمیشہ یوم غالب کو بڑے اہتمام سے منایا ہے میں خود 35 سال سے اس پروگرام کا حصہ رہا ہوں۔ اس دن سے میری بہت عزیز یادیں وابستہ ہیں۔ انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) کی رکن جناب ہاجرہ منظور صاحبہ نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ غالب کو یاد رکھنا دراصل اپنی تہذیبی وراثت کو یاد رکھنا ہے۔ مذاکرے کے بعد طرحی مشاعرے کا اہتمام ہوا جس کی صدارت جناب دلدار

دہلوی نے فرمائی اور نظامت کے فرائض جناب محمد انس فیضی نے انجام دیے۔ مشاعرے میں جن شعرا نے شرکت کی ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں: جناب فنافٹ، جناب شاہد انجم، جناب ابوالفیض، جناب واحد نظیر، ڈاکٹر امتیاز احمد اور محترمہ کایتری مہتا۔ مشاعرے کے بعد شام غزل کا اہتمام کیا گیا جس کے روح رواں جناب اکرام مرزا تھے۔ جناب پنڈت دلیپ پریہار، محترمہ جیوتی زیو، جناب محمد عامر خان نے اپنے مخصوص انداز میں غالب کی غزلوں کو پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 فروری 2024

پروفیسر بدرالدین الحافظ کی حیات وخدمات

نئی دہلی: تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے زیر اہتمام مشہور عالم دین، متعدد کتابوں کے مصنف اور مختلف دانش گاہوں میں عربی زبان و ادب کے استاذ پروفیسر بدرالدین الحافظ کی حیات وخدمات پر تسمیہ آڈیٹوریم، اوکھلا

نئی دہلی میں ایک مذاکرے کا انعقاد ہوا جس کی صدارت تسمیہ ٹرسٹ کے صدر ڈاکٹر سید فاروق نے کی۔ مقررین نے پروفیسر موصوف کو خراجِ تحسین پیش کیا اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں نئی نسل کے لیے قابل تقلید قرار دیا۔ ڈاکٹر سید فاروق نے اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر موصوف کے ساتھ اپنے دیرینہ تعلق کا اظہار کرتے ہوئے ان کی خودداری، استغنا اور لطافت طبع کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر شفیق احمد ندوی سابق پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ پروفیسر موصوف سے میرا نصف صدی سے بھی زیادہ کا خوشگوار تعلق رہا ہے۔ مذاکرے میں مشہور صحافی معصوم مرادآبادی نے کہا کہ اگرچہ میرا اور پروفیسر موصوف کا تعلق ایک تلخی سے شروع ہوا تھا اور وہ تلخی یہ تھی کہ انھوں نے میرے امریکہ کے دورے پر سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے ایک طویل خط تحریر کیا تھا جسے میں نے جوں کا توں اپنے اخبار کے صفحہ اول پر شائع کردیا، اس پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ نے اپنے خلاف سخت تنقیدی تحریر کو اپنے ہی اخبار میں کیسے شائع کردیا پھر اس کے بعد میرا اور ان کا تعلق ایک ایسی محبت میں تبدیل ہوگیا کہ وہ میرے اخبار کے مستقل کالم نگار بن گئے اور میری پیشکش کے باوجود اپنی تحریروں کا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبرنامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی و ثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔

یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

یوم غالب

دھلی: انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام غالب کے یوم وفات پر 'یومِ غالب' کا انعقاد کیا گیا۔ دوپہر تین بجے ایوانِ غالب میں مذاکرے، بزم موسیقی اور مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ مذاکرے کی صدارت کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) کے صدر جناب اقبال مسعود فاروقی نے کہا کہ غالب صدی کے موقعے پر غالب کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر غالب سے متعلق نہایت معیاری لٹریچر شائع ہوا لیکن اپنی تمام خوبیوں کے باوجود اس میں کچھ غلطیاں بھی در آئی ہیں۔ ہمارے علمی اداروں کا فریضہ ہے کہ ان غلطیوں کی نشان دہی کر کے خواہ وہ ضمیمے کی شکل میں ہوں متن کے ساتھ شائع کریں۔ انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) کے جنرل سکریٹری جناب خورشید عالم نے کہا کہ غالب کی شاعری ہو یا نثر اس نے اردو کو جدید اسلوب سے متعارف کرایا ہے۔ وہ صرف اردو ہی نہیں عالمی ادب میں ہندستان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) نے ہمیشہ یوم غالب کو بڑے اہتمام سے منایا ہے میں خود 35 سال سے اس پروگرام کا حصہ رہا ہوں۔ اس دن سے میری بہت عزیز یادیں وابستہ ہیں۔ انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) کی رکن جناب ہاجرہ منظور صاحبہ نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ غالب کو یاد رکھنا دراصل اپنی تہذیبی وراثت کو یاد رکھنا ہے۔ مذاکرے کے بعد طرحی مشاعرے کا اہتمام ہوا جس کی صدارت جناب دلدار

دہلوی نے فرمائی اور نظامت کے فرائض جناب محمد انس فیضی نے انجام دیے۔ مشاعرے میں جن شعرا نے شرکت کی ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں: جناب فنا فٹ، جناب شاہد انجم، جناب ابوالفیض، جناب واحد نظیر، ڈاکٹر امتیاز احمد اور محترمہ کایتری مہتا۔ مشاعرے کے بعد شام غزل کا اہتمام کیا گیا جس کے روح رواں جناب اکرام مرزا تھے۔ جناب پنڈت دلیپ پریہار، محترمہ جیوتی زیو، جناب محمد عامر خان نے اپنے مخصوص انداز میں غالب کی غزلوں کو پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 فروری 2024

پروفیسر بدرالدین الحافظ کی حیات وخدمات

نئی دھلی: تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے زیر اہتمام مشہور عالم دین، متعدد کتابوں کے مصنف اور مختلف دانش گاہوں میں عربی زبان و ادب کے استاذ پروفیسر بدرالدین الحافظ کی حیات وخدمات پر تسمیہ آڈیٹوریم، اوکھلا

نئی دہلی میں ایک مذاکرے کا انعقاد ہوا جس کی صدارت تسمیہ ٹرسٹ کے صدر ڈاکٹر سید فاروق نے کی۔ مقررین نے پروفیسر موصوف کو خراجِ تحسین پیش کیا اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں نئی نسل کے لیے قابل تقلید قرار دیا۔ ڈاکٹر سید فاروق نے اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر موصوف کے ساتھ اپنے دیرینہ تعلق کا اظہار کرتے ہوئے ان کی خودداری، استغنا اور لطافت طبع کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر شفیق احمد ندوی سابق پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ پروفیسر موصوف سے میرا نصف صدی سے بھی زیادہ کا خوشگوار تعلق رہا ہے۔ مذاکرے میں مشہور صحافی معصوم مرادآبادی نے کہا کہ اگرچہ میرا اور پروفیسر موصوف کا تعلق ایک تلخی سے شروع ہوا تھا اور وہ تلخی یہ تھی کہ انھوں نے میرے امریکہ کے دورے پر سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے ایک طویل خط تحریر کیا تھا جسے میں نے جوں کا توں اپنے اخبار کے صفحہ اول پر شائع کردیا، اس پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ نے اپنے خلاف سخت تنقیدی تحریر کو اپنے ہی اخبار میں کیسے شائع کردیا پھر اس کے بعد میرا اور ان کا تعلق ایک ایسی محبت میں تبدیل ہوگیا کہ وہ میرے اخبار کے مستقل کالم نگار بن گئے اور میری پیشکش کے باوجود اپنی تحریروں کا

کوئی معاوضہ لینا گوارا نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر موصوف ایک طرف تو دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ دوسری طرف جامعہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسی عصری درسگاہوں سے بھی اکتساب فیض کیا تھا جس کی وجہ سے ان کی شخصیت روشن ضمیری اور روشن دماغی کا حسین امتزاج بن گئی تھی۔ اس موقعے پر مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی، پروفیسر موصوف کے صاحب زادے یوسف سعید، مولانا عبدالستار سلام قاسمی، مولانا محمد رفیق قاسمی، مولانا محمد مزمل الحق الحسینی نے بھی خطاب کیا۔ مذاکرے کی نظامت ڈاکٹر عبدالقادر خاں نے کی جب کہ مولانا محمد شمیم قاسمی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 فروری 2024

افسانے کی روایت اورفن

نئی دھلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی (جے این یو) میں پروفیسر غضنفر کا توسیعی خطبہ بنام 'افسانے کی روایت اورفن' منعقد کیا گیا۔ استقبالیہ کلمات اسسٹنٹ پروفیسر نصیب علی چودھری نے پیش کیے جس میں انھوں نے مہمان خصوصی پروفیسر غضنفر کا تعارف کراتے ہوئے ان کے فن کی مختلف جہات بیان کیں۔ گفتگو کافی پرلطف ہوئی، بالخصوص اردو ادب کے مایہ ناز فکشن نگار پروفیسر غضنفر کی گفتگو سے طلبہ مستفیض ہوئے۔ موصوف نے کئی چیزوں کو سامنے رکھ کر افسانے کا فن، اس کی روایت اور اس میں عہد بہ عہد ہونے والی تبدیلیوں کی نشاندہی کی۔ ان کی گفتگو فنون لطیفہ سے شروع ہوئی اور اس کی شاخ ادب پر سیر حاصل کلام کیا۔ انھوں نے کتھارسس یعنی تزکیہ نفس کو افسانے کے پیرائے میں بیان کرتے ہوئے پریم چند اور معاصرین پریم چند ترقی پسندی سے وابستہ افسانہ نگار اور آزادی کے بعد افسانہ نگاروں میں جو ذہنی وفکری تبدیلیاں ہوئیں ان کی وضاحت کی۔ صدارتی خطبہ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے دیا۔ انھوں نے پورے سینٹرل ایشیا کی زبانوں کا محاسبہ کرکے اردو کی بقا پر سنجیدہ گفتگو کی۔ ساتھ ہی انھوں نے پروفیسر غضنفر کی تخلیقی جہات پر سیر حاصل گفتگو کی اور ان کے افسانوں اور ناولوں کو عہد حاضر کے مسائل سے جوڑ کر اس کی اہمیت وافادیت کو پیش کیا۔ اختتامیہ ڈاکٹر پرویز اعظمی کے ایما پر جے این یو کے طالب علم مجتبیٰ نے دیا۔ لیکچر کے آخر میں طلبہ وطالبات نے فکشن اور اردو کی موجودہ صورت حال کے متعلق متعدد سوال کیے جن کے تشفی بخش جوابات مہمان خصوصی پروفیسر غضنفر کی طرف سے دیے گئے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 15 فروری 2024

غالب کے متداول اورغیر متداول کلام کی تفہیم

نئی دھلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام ہر سال کی طرح امسال بھی توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ یہ

توسیعی خطبہ شعبۂ تاریخ وثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سیمینار ہال میں منعقد ہوا۔ خطبے کا موضوع 'سماجی اقدار اور ادبی کارگذاری: غالب کے متداول اور غیر متداول کلام کی تفہیم' تھا۔ معروف اسکالر پروفیسر مہر افشاں فاروقی (ورجینیا یونیورسٹی) نے ادبی کارگذاری پر طباعت، سامعین اور قارئین کے زیر اثر بدلتی ہوئی سماجی اقدار کا جائزہ لیتے ہوئے غالب کے غیر متداول کلام کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ مخطوطے عموماً خواص کے لیے تیار کیے جاتے تھے، لیکن کتابوں کی طباعت عام ہونے کی وجہ سے قارئین کا حلقہ وسیع ہوگیا۔ اس لیے غالب کو مطبوعہ کلام میں انتخاب کی ضرورت پیش آئی اور انھوں نے تجریدیت سے مملو بیشتر کلام کو مسترد کردیا۔ غالب کا مشکل اور غیر متداول کلام آج کے دور میں غالب کے متداول کلام کی طرح مقبول اور اہمیت کا حامل اس لیے ہے کہ انٹرنیٹ کے دور میں عام ادبی ذوق رکھنے والے قارئین کے لیے پہلے جیسی مشکلات نہیں ہیں۔ انھوں نے غیر متداول اشعار کی مثالوں سے ثابت کیا کہ تخلیقی کارگذاری کی سطح پر غالب کے متعدد غیر متداول اشعار ایسے ہیں کہ انھیں متداول کلام میں لازماً شامل ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا اس لیے نہیں ہوسکا کہ غالب کو اپنے کلام پر قارئین کے ردعمل کی بھی فکر تھی اس لیے مشکل لیکن عمدہ اشعار بھی ان کے انتخاب سے باہر ہوگئے۔ صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر احمد محفوظ نے صدارتی تقریر میں مہمان مقرر کی ہمہ جہت شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے غالب کے تعلق سے ان کی تحقیقی وتنقیدی خدمات کا اعتراف کیا اور کہا کہ مہمان مقرر کا خطبہ موضوع کے لحاظ سے تازہ اور فکر انگیز تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ غالب سے پہلے شاہ نصیر، شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش بھی خیال بند شاعر ہیں، لیکن ان شعرا کے بالمقابل غالب کا خیال بند کلام تجریدیت کی وجہ سے بہت زیادہ مشکل ہے۔ خطبے کی نظامت کنوینر ڈاکٹر محمد مقیم نے انجام دی۔ ڈاکٹر خوشتر زریں ملک نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس خطبے میں مختلف شعبوں کے اساتذہ واسکالرز موجود تھے۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام، 9 فروری 2024

ادب وصحافت میں زبان کی اہمیت

نئی دھلی: شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام ہر سال کی طرح امسال بھی توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ معروف صحافی اور ادیب جناب معصوم مرادآبادی نے 'ادب وصحافت میں زبان کی اہمیت' کے موضوع پر گراں قدر خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ زبان خیالات کی

ترسیل کے علاوہ تہذیبی اور سماجی ضرورت بھی ہے۔ زبان انسان اور دیگر مخلوقات کے درمیان فرق کرنے کا وسیلہ ہے۔ اچھی اور سچی زبان پر قدرت نہ ہو تو تحریر دیرپا نہیں ہوتی اور اپنی تاثیر کھودیتی ہے۔ تحریر کی مشق اچھی تحریروں کے کثیر مطالعے سے پیدا ہوتی ہے۔ کثرت مطالعہ کے بغیر اچھی اور موثر تحریر لکھنا ناممکن ہے۔ مہمان مقرر نے مزید کہا کہ کفایت لفظی ہر قسم کی تحریر کے لیے ضروری ہے لیکن صحافتی تحریر میں کفایت لفظی کی خاص اہمیت ہے۔ ماضی میں وہی ادیب اور صحافی ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب رہے جنھیں کفایت لفظی کا ہنر آتا تھا۔ آج زبان کے تعلق سے اردو صحافت کی صورت حال خاصی بے راہ روی کی شکار ہے۔ صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر احمد محفوظ نے صدارتی تقریر میں مہمان مقرر کی صحافتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ صحافتی تحریر کے قارئین میں عوام وخواص دونوں شامل ہیں لیکن خواص کے بالمقابل عوام کی تعداد زیادہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کثرت مطالعہ کی بنا پر تخلیقی اور ادبی تحریروں سے زیادہ صحافتی تحریریں پڑھی جاتی ہیں۔ لہٰذا صحافی کو زبان کے تعلق سے زیادہ حساس اور ذمے دار ہونا چاہیے۔ خطبے کی نظامت کنوینر پروفیسر شہزاد انجم نے انجام دی۔ آخر میں ڈاکٹر راہین شمع نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام، 15 فروری 2024

اردو ادب کے 75 سال

دھلی: غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں وزارت ثقافت کے تعاون سے امرت مہوتسو کے تحت ایک کل ہند سمینار 'اردو ادب کے پچہتر سال' کے عنوان سے منعقد کیا گیا۔ شمیم طارق

نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ غالب کے خطوط کی سلاست اور نفاست رشید احمد صدیقی، شبلی نعمانی، سردار علی جعفری اور ظ انصاری کے یہاں نظر آتی ہے۔ مگر بعد میں یہ روایت مزاحیہ اور غیر مزاحیہ نثر میں تقسیم ہوگئی۔ بعض مزاحیہ نثر مضحکہ خیز نثر کہی جانے کی مستحق ہے۔ پچہتر سال میں اردو میں ویدک ادب پر لکھا گیا۔ جاں نثار اختر نے اپنشدوں کو سامنے رکھ 'آدمی کا گیت' لکھا، جینت پرمار نے دلت ادب پر لکھا۔ آدی واسی علاقوں تک اردو کی وہ رسائی نہیں ہوئی جو ہونی چاہیے تھی، گوپی چند نارنگ نے مطالعہ لسانیات کو اردو تنقید کا جز بنایا، میر انیس اور علامہ اقبال کے کلام کا لسانیاتی جائزہ پیش کیا۔ نکڑ ناٹک کی روایت قائم ہوئی اور اس پر کتابیں بھی لکھی گئیں، ثقافتی مطالعہ کا رجحان بڑھا، ترجمے کے ضمن میں ظ۔ انصاری کے روسی زبان سے اردو میں بہترین تراجم سے پچہتر سال میں اردو کا دامن وسیع ہوا۔ افتتاحی اجلاس میں ڈاکٹر نفیس بانو نے پچہتر سال میں اردو غزل کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ صدارتی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ اردو میں فارسی روایات کا گہرا اثر ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر جی آر کنول نے کہا کہ پچہتر سال میں اردو تعلیم کا نظام بدتر ہوا ہے۔ دوسرے اجلاس میں پروفیسر قاضی جمال حسین نے 'اردو نظم جدیدیت کے بعد' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ غالب کلاسیکل شاعری کا آخری اور جدید شاعری کا پہلا شاعر تھا۔ منشور بنانے سے زندگی کا رویہ تبدیل نہیں ہوتا۔ ترقی پسندی سے طرز احساس اور عصری حسیت بدل گئی۔ پچاس سال میں نظموں میں تبدیلی آئی، طرز احساس بدل گیا۔ ساٹھ ستر سال میں نظریے بدل جاتے ہیں۔ ڈاکٹر نگار عظیم نے اردو افسانے میں تانیثیت کے عنوان سے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ عورت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے استحصال کی راہیں بھی ہموار ہوئیں۔ نعیمہ جعفری نے اپنے مقالے میں اردو ناول کے ارتقا کا منظر نامہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ پچہتر سال میں جو اردو ناول لکھے گئے وہ قابل اطمینان اور قابل فخر ہیں۔ ڈاکٹر شاداب تبسم نے جاوید احمد کا مقالہ پچہتر سال میں اردو صحافت پڑھ کر سنایا۔ خالد علوی نے پچہتر سال میں غالب تنقید پر بولتے ہوئے یاس یگانہ چنگیزی کی کتاب غالب شکن کا ذکر کیا۔ غالب پر لکھی گئی دوسری کتابوں نیر مسعود، خورشید الاسلام اور نارنگ صاحب کی غالب سے متعلق کتابوں پر گفتگو کی۔ پروفیسر عبدالحق نے اپنی تقریر میں کہا کہ غالب کے فارسی کلام میں بڑی رنگینی ہے اور فارسی میں غالب نے کئی نعت لکھی ہے۔ خالد محمود نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ایک وسیع موضوع کو چار گھنٹوں میں مقالہ نگار حضرات نے بیان کیا۔ اس میں غیر افسانوی نثر کا ذکر ہونا چاہیے۔ پروفیسر قاضی افضال حسین نے اپنی صدارتی تقریر میں مقالہ نگاروں کی ستائش کی، اکیڈمی کے صدر ڈاکٹر جی آر کنول نے سامعین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مقالے طویل لکھے جائیں لیکن اس کی تلخیص بھی تیار کر لی جائے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 فروری 2024

قومی تعلیمی پالیسی کے ترجیحی نکات

نئی دھلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام 'قومی تعلیمی پالیسی کے ترجیحی نکات' توسیعی خطبے کا انعقاد کیا

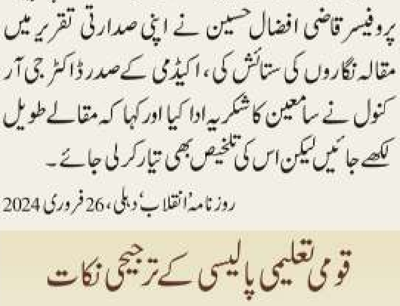

گیا۔ معروف اسکالر پروفیسر ریاض احمد نے 'قومی تعلیمی پالیسی (این ای پی 2020) کے ترجیحی نکات' پر گراں قدر خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے تعلیمی پالیسی کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی تہذیب جتنی قدیم ہے۔ یہاں کا تعلیمی نظام بھی اتنا ہی قدیم ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں جدید تعلیم اور نئے تعلیمی نظام کو فروغ دینے اور رجحان سازی میں راجا رام موہن رائے اور سر سید احمد خاں کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ اس کے بعد قومی تعلیمی پالیسی میں قابل ذکر تنظیم نو کا کام کوٹھاری کمیشن نے کیا۔ نئی تعلیمی پالیسی 2020 میں روبہ عمل آئی جس میں ابتدائی تعلیم اعلیٰ تعلیم، پیشہ ورانہ تعلیم اور تعلیم بالغان پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ ابتدائی تعلیم میں دلچسپ تدریسی عمل پر زور دیا گیا ہے تاکہ طلبہ اپنی تعلیم درمیان میں ہی ترک نہ کر دیں۔ اعلیٰ تعلیم میں تدریسی عمل کو کارآمد بنانے کے لیے کلاس روم کی تکثیری فضا کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت پر اصرار کیا گیا ہے۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے مہمان مقرر نے نئے تعلیمی پالیسی کے ترجیحی نکات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر احمد محفوظ نے صدارتی تقریر میں موضوع پر مہمان مقرر کی گرفت اور موضوع کے قابل فہم اظہار کی ستائش کی۔ صدر شعبہ نے کہا کہ یہ موضوع نہایت اہم اور وقت کی بڑی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ موضوع نہ صرف طلبہ بلکہ اساتذہ کے لیے بھی اہم اور مفید ہے کیونکہ اس پالیسی کا اولین سروکار انھی سے ہے۔ خطبے کی نظامت کنوینر ڈاکٹر سید تنویر حسین نے کی۔ ڈاکٹر نوشاد منظر نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ شعبہ کے اساتذہ کے علاوہ بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالرز اور طلبہ و طالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 فروری 2024

مشینی دور میں ادب کا سماجی و ثقافتی بیانیہ

نئی دھلی: ورلڈ اردو ایسوسی ایشن نے 24 اور 25 فروری 2024 کو 'مشینی دور میں ادب کا سماجی و ثقافتی بیانیہ' کے عنوان سے دو روزہ آن لائن بین الاقوامی سمینار کا انعقاد کیا۔ اس سمینار میں پیش کیے مقالات کا موضوع متنوع تھا۔ افتتاحی سیشن میں کل چھ مقالے پیش کیے گئے۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر فضل اللہ مکرم، صدر شعبۂ اردو، سینٹرل یونیورسٹی، حیدر آباد، ڈاکٹر مشتاق احمد، دربھنگہ، ڈاکٹر شگفتہ فردوس، سیالکوٹ جب کہ مہمان اعزازی کی حیثیت سے ڈاکٹر وصی بختیاری نے شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، چیرمین، ورلڈ اردو ایسوسی ایشن، نئی دہلی نے 'مشینی دور

میں ادب کا سماجی وثقافتی بیانیہ' کا تعارف کراتے ہوئے اس موضوع کی اہمیت و افادیت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر شگفتہ فردوس نے مشینی دور میں اردو ادب کی صورت حال پر اظہار خیال کیا۔ پروفیسر فضل اللہ مکرم نے مشینی دور میں ادب کے سماجی وثقافتی بیانیے پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ دوسرے سیشن کی صدارت ڈاکٹر محمد توحید خان اور ڈاکٹر شفیع ایوب نے کی۔ جب کہ اس سیشن میں کل سات مقالات پیش کیے گئے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر غضنفر علی، پروفیسر نجمہ رحمانی اور پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی۔ پروفیسر غضنفر نے مشینی دور میں ادب کے بیانیے پر بات کرتے ہوئے کہا کہ اس عہد میں سوچنے، لکھنے اور پڑھنے کا انداز بدل گیا ہے۔ اظہار کے طریقوں میں تبدیلی آئی ہے چنانچہ متن کو سامنے رکھ کر ان حوالوں سے غور وفکر کیا جانا چاہیے۔ مشینی دور میں مثبت اور منفی دونوں پہلو پر بات کرنے کی گنجائش ہے تاہم ادب کی ادبیت اور قلم کار کی حیثیت سے بھی انکار ممکن نہیں۔

پروفیسر نجمہ رحمانی نے اپنے صدارتی خطاب میں مشینوں نے فن کار کو کیسے متاثر کیا؟ متن میں کیا کیا تبدیلیاں پیش آئیں؟ مشین کو ادب کے لیے کیسے کارآمد بنایا جائے؟ مشین کے دور میں انسان کی کیا ضروریات ہیں؟ انٹرنیٹ کے دور میں کتاب کی اہمیت کیا ہے؟ مشین نے انسانی نبض کو کیسے اپنی گرفت میں لے لیا ہے؟ نئے وسائل نے سماج اور ادیب کو کیسے متاثر کیا ہے؟ ان سوالوں پر مقالہ نگاران کی توجہ مبذول کرائی۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے مشینی دور میں ادب کی اہمیت پر بات کی۔ مقالوں پر بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس سیشن میں سماج اور ثقافت کی تو بات ہوئی لیکن مشینی پس منظر میں کم بات ہوئی، اس جانب بھی مقالہ نگاران کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

آخری سیشن کی صدارت پروفیسر صدف نقوی، محترم نصر ملک اور ایڈوکیٹ ناصر عزیز نے فرمائی۔ پروفیسر صدف نقوی نے مقالات پر بات کرتے ہوئے ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کی کاوشوں کو سراہا، ایڈوکیٹ ناصر عزیز نے مصنوعی ذہانت اور ادب پر بات کرتے ہوئے عہد حاضر میں اس کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی، جناب نصر ملک نے بھی مشینی دور میں ادب کا سماجی وثقافتی بیانیہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ چاروں سیشن کی سلسلے وار نظامت ڈاکٹر محمد رکن الدین، ڈاکٹر مہوش نور، ڈاکٹر امتیاز رومی اور شہلا کلیم نے کی۔

پریس ریلیز: محمد رکن الدین، جے این یو، 25 فروری 2024

دکنی زبان وادب: روایت اور معاصر صورتِ حال

نئی دھلی: اردو اکادمی، دہلی کے قمر رئیس سلور جوبلی آڈیٹوریم میں 'دکنی زبان و ادب: روایت اور معاصر

صورت حال' کے عنوان سے بتاریخ 16 تا 18 فروری 2024 سہ روزہ قومی سمینار منعقد ہوا، جس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت پرفیسر عبدالحق نے کی، مہمان اعزازی کی حیثیت سے پروفیسر صادق، کلیدی خطبہ ڈاکٹر اودھیش رانی باوا حیدرآباد، استقبالیہ کلمات محمد احسن عابد سکریٹری اردو اکادمی دہلی اور تعارفی کلمات پروفیسر معین الدین جینا بڑے کنوینز سمینار نے پیش کیے۔

صدارتی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ اردو کی ابتدا خسرو سے نہیں بلکہ مدرسہ ناصریہ سے ہوئی ہے۔ انھوں نے ولی کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ولی کی کلیات میں ساٹھ سے زائد قرآنی تلمیحات کا ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے حاتم، آبرو اور قلی قطب شاہ کا ذکر کرتے ہوئے بہت سی نظموں کا ذکر کیا اور کہا کہ ہندوستانی تہواروں پر ان کی نظمیں آج بھی بے حد مقبول ہیں۔ ڈاکٹر اودھیش باوارانی نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے خطبے کو تین ادوار میں تقسیم کیا، عہد صوفیا، دبستان گولکنڈہ وبیجاپور اور عہد حاضر۔ انھوں نے کہا کہ یہ زبان پہلے ہندوی، گجری، دکنی اور پھر اردو کہلائی، دبستان دکن کے ادبی منظرنامے پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ان علاقوں کے بادشاہوں نے خود بھی شاعری کی اور ان کے زیر اثر بہت سے شعرا نے عمدہ مثنویاں تحریر کیں جن سے اس زبان کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ مہمان اعزازی پروفیسر صادق نے اپنے خطاب میں کہا کہ اس زمانے میں زیادہ تر مثنویاں تحریر کی گئیں، اس لیے کہ اس وقت مثنوی لکھنے والے شاعر کو بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا تھا۔ ماہنامہ شگوفہ پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ وقت میں یہ رسالہ دکنی ادب کی نمائندگی کرتا ہے، دکنی زبان کے حوالے سے اس رسالے کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ پروفیسر معین الدین جینا بڑے کنوینز سمینار نے تعارفی کلمات اور سمینار کے اغراض ومقاصد پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس موضوع پر اردو اکادمی، دہلی پہلی بار سمینار منعقد کر رہی ہے، جس میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ان تمام موضوعات کا احاطہ کیا جائے جن کا ابھی تک نہیں کیا گیا ہے۔ دکنیات کی طرف راغب کرنے کی یہ ایک اہم کوشش ہے۔ سکریٹری اکادمی محمد احسن عابد نے کہا کہ دکنی ادب کی اہمیت وافادیت اس بات سے واضح ہوتی ہے کہ تقریباً سارے کالجز اور یونیورسٹیوں میں دکنی ادب پر کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور دکنی ادب نصاب میں شامل ہے، چونکہ آج کل دکنی ادب پر زیادہ توجہ نہیں ہے، اس لیے یہ سمینار منعقد ہوا ہے تاکہ لوگ دکنی ادب کی اہمیت کو سمجھیں۔

دوسرے دن 17 فروری 2024 کو پہلا اجلاس قمر رئیس سلور جوبلی آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر شریف حسین قاسمی اور پروفیسر سید محمد عزیزالدین نے کی جب کہ نظامت ڈاکٹر نورین علی حق نے کی۔ اس اجلاس میں پانچ مقالہ نگاروں پروفیسر عبدالحق نے 'دیوان ولی کی تدوین: روایت و مسائل'، پروفیسر شہاب الدین ثاقب نے 'مثنوی قطب مشتری کے مدونہ متون کا ناقدانہ جائزہ'، پروفیسر احمد محفوظ نے 'دکنی شعری متون کی قرأت کے مسائل'، پروفیسر شگفتہ شاہین نے 'دکنی شاعری میں عورت کا تصور' اور جناب اسلم مرزا نے 'دکنی تہذیب کی ایک جھلک' کے عناوین پر مقالات پیش کیے۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے صدارتی خطاب میں کہا کہ دکنی زبان پر کئی زبانوں کے اثرات ہیں خاص طور پر تلگو، مراٹھی، گجراتی اور کنڑ وغیرہ کا اثر زیادہ ہے۔ پروفیسر سید محمد عزیزالدین نے اپنے خطاب میں کہا کہ تیرہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک کوئی عورت ادیب نہیں ملتی ہے، خاص طور پر شاعری میں ان کی کمی کھلتی ہے۔ اس سمینار کے دوسرے دن کا دوسرا اجلاس لنچ کے وقفے کے بعد شروع ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر عبدالحق اور

پروفیسر شہاب الدین ثاقب نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر امیر حمزہ نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں بھی چار مقالات پیش کیے گئے۔ پروفیسر اے آر فتیحی نے 'دکنی زبان: سماجی لسانیات کے تناظر میں'، پروفیسر سید محمد عزیز الدین نے 'دکن کے صوفیا کی دکنی نگارشات اور تاریخ نویسی'، پروفیسر غضنفر نے 'دکنی زبان وادب کی تدریس: علم درسیات کی روشنی میں'، پروفیسر سجاد شاہد نے 'دکنی ادب میں تصور قومیت' کے عناوین پر اپنے مقالات پیش کیے۔

تیسرے دن 18 فروری 2024 کو سمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر سجاد شاہد اور پروفیسر ابوبکر عباد نے کی جب کہ نظامت ڈاکٹر جاوید حسن نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر معین الدین جینابڑے نے 'اورنگ آباد کی دبستانی حیثیت: تعارف و توضیح'، پروفیسر خالد علوی نے 'ولی اور ریختہ گوئی: ادبی و تاریخی مباحث'، جناب خورشید اکرم نے 'مثنوی پھول بن: معاصر فکشن نگار کے تاثرات' اور جناب مقصود دانش نے 'مثنوی قطب مشتری کی فنی انفرادیت (پلاٹ کے حوالے سے)' کے عناوین پر اپنے مقالات پیش کیے۔ صدارتی خطاب کرتے ہوئے پروفیسر ابوبکر عباد نے کہا کہ تنقید کا کام یہ ہے کہ جو چیز لکھی ہوئی ہے، اس پر بات کرے اور اس پر اپنی رائے قائم کرے، اس لیے کہ جو چیز شائع ہو چکی ہے وہ اب کسی کی پراپرٹی نہیں ہے بلکہ وہ اب عوام کے درمیان ہے اور تنقید نگار جس طرح چاہے اس پر تنقید کر سکتا ہے۔ پروفیسر سجاد شاہد نے اپنی تقریر میں چاروں پیش کردہ مقالات پر تفصیلی گفتگو کی اور بتایا کہ ادب بہت اہم چیز ہے، اس کے بغیر نہ تو ہم ماضی کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی مستقبل کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں، جب تک ذہن اور مطالعہ وسیع نہیں ہوگا تب تک ادب اور تاریخ کو صحیح طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ دوسرا اجلاس لنچ کے بعد شروع ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر احمد محفوظ اور پروفیسر خالد علوی نے کی جب کہ نظامت ڈاکٹر شاہنواز فیاض نے کی۔ اس اجلاس میں بھی پانچ مقالات پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر رؤف خیر نے 'دکنی کے ادبی معرکے'، پروفیسر ابوبکر عباد نے 'ہندوستانی فکر وتمدن کا پہلا ترجمان شاعر: قلی قطب شاہ'، ڈاکٹر امان اللہ ایم بی نے 'تمل ناڈو میں دکنی زبان وادب: روایت وصورتحال'، ڈاکٹر معید رشیدی نے 'اردو شعرا کے ابتدائی تذکروں میں دکنی شعرا کا ذکر: تنقیدی جائزہ' اور ڈاکٹر عالیہ نے 'دکنی غزل ولی سے قبل' کے عناوین پر مقالات پیش کیے۔ پروفیسر خالد علوی نے پانچوں مقالات پر فرداً فرداً گفتگو کی، انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ انگریز نے ہندوستان والوں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا کہ تم لوگوں کے پاس جو ادبی سرمایہ ہے وہ بالکل معمولی ہے جبکہ ہمارے پاس علم کا وافر ذخیرہ موجود ہے، لیکن آج جب ہم ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے پاس پہلے سے وہ چیزیں موجود ہیں جن کے متعلق وہ کہتے تھے کہ یہ تمہارے یہاں نہیں ہے۔ اس کے بعد متن خوانی کا سیشن منعقد ہوا، جس میں ڈاکٹر اودھیش رانی باوا، پروفیسر معین الدین جینابڑے، جناب اسلم مرزا، ڈاکٹر سجاد شاہد اور ڈاکٹر رؤف خیر نے دکنی متون کو اپنے خاص انداز میں پیش کیا، سامعین اس متن خوانی سے بے حد محظوظ ہوئے۔ اس کے بعد متصلاً اختتامی اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر شگفتہ شاہین اور پروفیسر معین الدین جینابڑے نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر اودھیش رانی باوا، پروفیسر شہاب الدین ثاقب، ڈاکٹر رؤف خیر، جناب اسلم مرزا اور ڈاکٹر معید رشیدی نے اپنے وقیع خیالات کا اظہار کیا اور اس سمینار سے متعلق اپنے تاثرات پیش کیے۔ شکریے کی رسم اردو اکادمی دہلی کے سکریٹری محمد احسن عابد نے ادا کی۔

پریس ریلیز: اردو اکادمی، دہلی 1 مارچ 2024

عرب و ہند تعلقات: ماضی، حال اور مستقبل

نئی دھلی: تہذیب وثقافت، اقتصاد وسیاست اور معاشرہ وتجارت گویا کسی بھی میدان میں ہندوستان عربوں کے لیے کبھی بھی کوئی اجنبی ملک نہیں رہا ہے۔ جہاں ہندوستانی مسالے اور کشمیری شالیں عرب بازاروں میں فروخت کی جاتی تھیں، وہیں طب، نجوم اور فلکیات جیسے علوم میں ہندوستانی تالیفات کا عربوں کے حکمت خانوں میں ترجمہ کیا جاتا تھا۔ ان خیالات کا اظہار ذاکر حسین دہلی کالج کے شعبہ عربی میں منعقد مولانا مملوک العلی یادگاری لکچر میں 'انڈین کاونسل برائے بین الاقوامی امور' سے وابستہ سینئر ریسرچ فیلو ڈاکٹر فضل الرحمٰن صدیقی نے کیا۔ واضح رہے کہ شعبہ عربی مولانا مملوک العلی نانوتوی کی یادگار میں ہر سال ایک خصوصی لکچر کا اہتمام کرتا ہے۔ 'عرب و ہند تعلقات: ماضی، حال اور مستقبل' کے عنوان پر منعقد ہونے والا یہ لکچر اس سلسلے کی چھٹی کڑی تھی۔ شعبے کے استاذ ڈاکٹر محمد عبید اللہ نے کالج، شعبہ عربی اور حالیہ مملوک العلی لکچر سیریز سے مہمان محاضر اور سامعین کو واقف کرایا۔ اسی طرح شعبے کے دوسرے استاذ ڈاکٹر قمر الدین نے طلبہ و مشارکین کے سامنے مہمان محاضر کا تفصیلی تعارف پیش کرتے ہوئے 'آئی سی ڈبلیو اے' کی کارکردگی اور حکومتی پالیسی سازی میں اس کے کردار کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ مہمان محاضر نے اپنے لکچر کا آغاز کرتے ہوئے مولانا مملوک العلی کی شخصیت کے بارے میں کہا کہ جب ان سے فیض یافتہ شاگردوں نے علی گڑھ اور دیو بند جیسی تحریکیں برپا کیں تو خود ان کی حیثیت کیا رہی ہوگی؟ موضوع محاضرہ کی مناسبت سے موصوف نے اپنی گراں قدر معلومات پیش کرتے ہوئے کہا کہ عرب و ہند کے یہ تعلقات کوئی نئی پیش رفت نہیں ہیں؛ بلکہ اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 1 مارچ 2024

عرب دنیا میری نظر میں

نئی دھلی: شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام 'عرب دنیا میری نظر میں' کے موضوع پر توسیعی خطبے کا انعقاد پروفیسر نسیم اختر ندوی صدر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدارت میں کیا گیا جس میں نائجیریا، ناروے اور الجیریا میں ہندوستان کے سفارت خانوں کے سابق سفیر مہیش سچدیوا نے خطیب کی حیثیت سے شرکت کی اور اپنا خطبہ پیش کیا، اس پروگرام میں شعبہ کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ وطالبات نے شرکت کی۔ پروگرام کی کوآرڈینیٹر ڈاکٹر ہیفا شاکری نے حاضرین کا استقبال کرتے ہوئے اس توسیعی خطبے کے مقرر سابق سفیر مہیش سچدیوا کا تعارف پیش کرتے ہوئے مختلف ملکوں میں ان کی سفارتی خدمات کا تذکرہ کیا۔ فاضل مقرر نے اپنے خطبے کے آغاز میں اپنی سفارتی زندگی پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے عربی زبان دمشق میں سیکھی اور عربی ثقافت اور عرب ممالک کی سیاست کا وہیں مطالعہ کیا، موصوف نے عربی زبان پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ زبان صرف 22 عرب ملکوں ہی میں نہیں بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ دوسرے غیر عرب ممالک میں بھی سمجھی اور بولی جاتی ہے اس کے بارے میں انھوں نے عربی زبان میں غیر عرب باشندوں کے ساتھ عربی زبان میں گفتگو کے اپنے تجربات کا تذکرہ کیا۔ سابق سفیر نے عرب ملکوں کے مابین زبان وثقافت اور رسم ورواج کے اختلاف پر بھی روشنی ڈالی نیز انھوں نے ہندوستان اور عرب ممالک کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے بعض انگریز سیاحوں کی کتابوں کے حوالے سے بتایا کہ یہ تعلقات بہت قدیم ہیں اور بعض عرب ملکوں میں ہندوستانی روپیہ بطور کرنسی رائج تھا، آپ نے آخر میں موجودہ وقت میں ہندوستان اور عرب ممالک کے تعلقات پر بھی گفتگو کی۔ صدر جلسہ پروفیسر نسیم اختر ندوی نے اپنے صدارتی خطاب میں

خطیب محترم کا اس قیمتی لکچر کے لیے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آج کا یہ لیکچر ہمارے طلبہ اور ہمارے لیے بہت مفید لیکچر تھا، ہم نے تفصیل سے ایک ایسی شخصیت سے عرب دنیا کے بارے میں خطبہ سنا جنھوں نے کئی عرب ملکوں میں بطور سفارت کار کے کام کیا ہے اور عرب ملکوں کی مختلف چیزوں کو قریب سے دیکھا ہے، آپ نے محترم سفیر کی عربی زبان کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ آپ ہمارے طلبہ کے لیے نمونہ ہیں۔ ڈاکٹر ہیفا شاکری کے شکریہ پر اس پروگرام کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 2 مارچ 2024

ناول نئی فیکٹری پر مذاکرہ

نئی دہلی: بندھوتو فاؤنڈیشن دہلی کی جانب سے غالب انسٹی ٹیوٹ میں ناول نئی فیکٹری پر مذاکرہ منعقد ہوا جس میں ناول نگار ذاکر فیضی کو بندھوتو سمان سے نوازا گیا۔ اس

پروگرام کے صدر پروفیسر معین الدین جینابڑے نے خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ ناول کی کرافٹنگ بہت خوب ہے۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر اجیت پاٹھک نے اس طرح کی محفلوں کے انعقاد پر مسرت کا اظہار کیا۔ مہمان اعزازی کے طور پر ایڈووکیٹ سیف قریشی اور اویناش پنوار نے شرکت کی۔ مذاکرے میں ایس ایم حسینی، فرقان عالم، ابھے کمار اور عشرت ظہیر نے ناول نئی فیکٹری سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر رخشندہ روحی، ڈاکٹر خالد مبشر، ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا اور حقانی القاسمی صاحب نے نئی فیکٹری ناول کو عصرِ حاضر کا بہترین ناول قرار دیا۔ نظامت کے فرائض ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی ذبیح اللہ ذبیح نے انجام دیے۔ مدھو صاحبہ نے استقبالیہ کلمات پیش کیے اور مذاکرہ کا اختتام بندھوتو فاؤنڈیشن کے روحِ رواں نریند کمار پانڈے کے اظہار تشکر پر ہوا۔ سوال جواب کے سیشن میں شرکا نے نئی فیکٹری پر سوالات قائم کیے جس کا ناول نگار ذاکر فیضی نے تشفی بخش جواب دیا۔ اس پروگرام میں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے طلبا نے کثیر تعداد میں شرکت کر کے پروگرام کو کامیاب بنایا۔

پریس ریلیز: ذبیح اللہ ذبیح، دہلی، 21 فروری 2024

اتر پردیش

جذبی کی شعری خدمات

لکھنؤ: معین احسن جذبی کو احتجاج اور انقلاب کی شاعری میں جہاں اس بات کا علم تھا کہ کیا کہنا چاہیے، وہیں اس

بات کا بھی احساس تھا کہ کیا نہیں کہنا چاہیے، اس لیے وہ وفورِ تخلیق کے ساتھ ضبطِ تخلیق کے بھی قائل تھے۔ جذبی کی شاعری مختصر ہے مگر معتبر ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار اتر پردیش اردو اکادمی کے مالی اشتراک ہوپ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ہوٹل میزبان میں منعقد سمینار 'معین احسن جذبی کی شعری خدمات' کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر عباس رضا نیر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی نے کیا۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر نے مزید کہا کہ جذبی اپنے ابتدائی دور کی شاعری میں ملال تخلص رکھتے تھے لیکن بعد میں جذبی اختیار کیا، شاعری کا شعور گھر کے ماحول سے مل چکا تھا، جھانسی کے ادبی ماحول نے اس میں مزید نکھار پیدا کیا۔ سمینار کے ابتدا میں ہوپ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن کے سکریٹری اعزاز حسین نے اتر پردیش اردو اکادمی اور اس کے سکریٹری ایس ایم عادل حسن کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا کہ اردو کے فروغ میں اکادمی اور اس کے سکریٹری اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس موقعے پر تمام مہمانان اور مقالہ نگاران کا بھی شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر سیما صدیقی نے کہا کہ جذبی ایک شاعر کے ساتھ محقق اور نقاد بھی تھے، انھوں نے اپنی تنقید میں بڑا ہی اعتدال پسند رویہ اختیار کیا ہے۔ مہمان خصوصی سیاسی و سماجی کارکن سلمان بشر نے کہا کہ طویل عمر پانے کے باوجود جذبی نے شاعری بہت کم کی لیکن جو بھی کی اس کو ایک پہچان دی اور اردو ادب پر اپنے نقوش چھوڑے۔ مہمانان اعزازی سیاسی و سماجی کارکن چچا امیر حیدر اور معروف و معتبر شاعر رحمت لکھنوی نے کہا کہ معین احسن جذبی کی شاعری میں کلاسیکیت کا عنصر غالب ہے، ان کی نظموں میں بھی ان کی غزلوں کی طرح کلاسیکیت اور رومانیت نمایاں ہے، نظموں میں ان کی سلیقہ مندی، ان کی نغمگی، ان کا محاکاتی در و بست اور ان کا احساس تعمیر زیادہ نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں جذبے کی شدت، احساس کی تازگی اور شعری کینوس کو مختلف رنگوں سے مزین کیا ہے۔ مقالہ نگاران ڈاکٹر عشرت ناہید (مولانا آزاد یونیورسٹی)، ڈاکٹر سیما صدیقی، ڈاکٹر نزہت فاطمہ، ڈاکٹر اعظم انصاری، ڈاکٹر موسیٰ رضا، ریسرچ اسکالر سعید اختر، مجتبیٰ حسین صدیقی، اور صحافی ضیاء اللہ صدیقی نے اپنے مقالات میں کہا کہ معین احسن جذبی شاعر، ادیب اور نقاد تھے۔ آخر میں مہمانان، حاضرین اور مقالہ نگاران کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پروگرام کے کوآرڈینیٹر ضیاء اللہ صدیقی نے کہا کہ یہ اتر پردیش اردو اکادمی نے اہم شاعر معین احسن جذبی پر سمینار کا انعقاد کرا کر اپنی اردو دوستی کا ثبوت دیا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 4 مارچ 2024

فراق گورکھپوری شخصیت اور شاعری

لکھنؤ: فراق کی تصنیف 'اندازے' قابل مطالعہ کتاب ہے، فراق نے ایسے وقت میں اپنی الگ شناخت بنائی جب فانی، جگر، اصغر، شاد عظیم آبادی اور حسرت کی آوازیں

فضا میں گونج رہی تھیں۔ فراق نے انگریزی ادب سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی شاعری میں بھی اس طرز کو سمونے کی بھرپور کوشش کی، حالانکہ بہت سے لوگ فراق کی شاعری کو عظیم شاعری نہیں مانتے، مذکورہ خیالات کا اظہار اتر پردیش اردو اکادمی کے مالی اشتراک وامپیریل کمپیوٹر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام منعقد یک روزہ سمینار 'فراق گورکھپوری شخصیت اور شاعری' میں ڈاکٹر فخر عالم (صدر شعبۂ اردو خواجہ معین الدین چشتی لسانیات یونیورسٹی) نے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے کیا، مزید انھوں نے فراق کی شخصیت اور شاعری پر سیر حاصل گفتگو بھی فرمائی، اور مقالہ نگاران کے مقالات پر مفید

تبصرہ بھی کیا۔ مذکورہ سمینار بلہرہ ہاؤس قیصر باغ، لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ مہمان خصوصی ایس رضوان سابق سکریٹری اترپردیش اردو اکادمی نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فراق کی شعری و نثری تخلیقات کو اردو ادب کا سرمایہ قرار دیا، انھوں نے مقالہ نگاران کی تعریف کی اور حوصلہ افزائی فرمائی، اور امپیریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے ذریعے کرائے گئے انتظامات کی بھی تعریف کی۔ مہمان اعزازی معروف افسانہ نگار و ناول نگار محسن خان نے فراق گورکھپوری کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ میری نظر میں فراق عظیم شاعر نہیں بلکہ عظیم نثر نگار ضرور کہے جاسکتے ہیں، محسن خان نے فراق کے حوالے سے تفصیلی گفتگو بھی کی۔ مقالہ نگار ضیاء اللہ صدیقی نے کہا کہ فراق نے عشقیہ شاعری کو آفاقی گونج دی، ان کی شاعری میں انسانی تہذیب کی صدیاں بولتی ہیں، فراق صدی کی آواز تھے، ایک ایسی آواز جس میں درد و کرب، تڑپ، عیش و عشرت، محرومی، گھٹن، روایت اور تجربہ سب کچھ شامل ہے۔ فراق کے بنیادی موضوعات حسن و عشق، انسانی تعلقات کی دھوپ چھاؤں وغیرہ ہیں۔ دوسرے مقالہ نگار محمد راشد خان نے کہا کہ فراق نے اپنی غزلوں کو اپنے گہرے مطالعے، عمیق مشاہدے، لطیف احساس و جذبات، فکر و خیال اور فن کی ندرت، تازگی، شگفتگی، نادر تشبیہات و استعارات اور علامات سے مالا مال کیا۔ ایک اور مقالہ نگار ممتاز احمد نے کہا کہ فراق گورکھپوری نہایت عظیم شخصیت کے مالک تھے، انھوں نے ادبی دنیا کو اپنی شعری اور نثری تخلیقات کے ذریعے بہت کچھ دیا، ان کی شاعری اردو کی ادبی تاریخ کا درخشاں ستارہ تھی۔ آخری مقالہ نگار نثار احمد نے کہا کہ فراق مخلوط تہذیب پر یقین رکھتے تھے کیونکہ ان کی نظر میں ہندوستان کسی ایک طبقے کا نام نہیں بلکہ کثرت میں وحدت کا نام ہے، ان کی شاعری میں اصل ہندوستان کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔ سمینار کی شروعات سمینار کے ناظم عقیل احمد فاروقی نے اپنے مخصوص انداز میں سوسائٹی کے کاموں پر روشنی ڈالتے ہوئے کی۔ نظامت کے فرائض انجام دے رہے عقیل احمد فاروقی نے اپنے فرائض کو بخوبی انجام دیا۔ سمینار میں اکادمی اسٹاف کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 1 مارچ 2024

جشن اسرار

میرٹھ: اسرار الحق اسرار نے تخلیقی اعتبار سے اردو غزل کو اس سطح پر لے جانے کی کوشش کی جہاں خیال وفکر کی ایک نئی کائنات آباد ہونے کے امکانات روشن تھے۔ انھوں نے اپنے عہد کو سمجھا۔ انسانی رویوں کے تضاد پر نگاہ کی، حالات کی ستم ظریفیاں محسوس کیں اور اپنے نفیس وجلیس اور خوددار شخصیت کو بھی شامل رکھا۔ اسرار نے غزل کو ایک طرف تعمیری حسن عطا کیا تو دوسری طرف حقیقتوں کا آئینہ دار بنایا۔ یہ الفاظ تھے بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر پروفیسر شہپر رسول کے جو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے برہسپتی بھون میں 5 مارچ 2024 کو منعقد شعبۂ اردو اور حیات فاؤنڈیشن کے مشترکہ اہتمام میں 'جشن اسرار الحق اسرار' کے دوران اپنی صدارتی تقریر میں ادا کر رہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی جب کہ صدارت کے فرائض پروفیسر شہپر رسول نے انجام دیے۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر آصف علی اور شکریے کی رسم حیات فاؤنڈیشن کے چیئرمین علی جوہر خان نے ادا کی۔

پروگرام تین حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلے حصے میں اسرار الحق اسرار کی شخصیت اور فن پر مقالے پیش کیے گئے جن میں ڈاکٹر ارشاد سیانوی، شاہد چودھری اور دہلی یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر خوشبو پروین نے مقالے پیش کیے۔ دوسرے حصے میں پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اسرار الحق اسرار کا ایک تفصیلی انٹرویو کیا اور پروگرام کے آخری حصے میں معروف غزل سنگر مکیش تیواری نے اسرار الحق اسرار کی مختلف غزلوں کو اپنی جادوئی آواز دے کر سامعین کو مسحور کر دیا۔ اس دوران اسرار الحق اسرار کو شال، ٹرافی اور نشان یادگار پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ میرٹھ کی اس سرزمین نے ایک سے بڑھ کر ایک شاعر پیدا کیا۔ اسماعیل میرٹھی، قلق میرٹھی، رنج میرٹھی، بیاں میرٹھی، علامہ سحر عشق آبادی روش صدیقی، بشیر بدر، حفیظ میرٹھی وغیرہ ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے میرٹھ کی بہترین اور کامیاب نمائندگی کی۔ آج اسرار الحق اسرار میرٹھ کے ان عظیم شعرا کی روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ اسرار کے کلام میں ایک قسم کی شائستگی اور کردار کی بلندی نظر آتی ہے۔ وہ اپنے ان اشعار سے اصلاح کا کام بھی لیتے ہیں۔ معروف دانشور ڈاکٹر مہر عالم خاں نے کہا کہ اسرار استاد الشعرا ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کے نشیب وفراز اور جستجو کو اپنے اشعار میں ڈھالا ہے۔ اسرار الحق اسرار قدیم اور جدید شاعری کا بہترین امتزاج ہیں۔ عشق ومحبت کے اشعار میں بھی ان کا اپنا نظریہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر معراج الدین نے کہا کہ میں شعبۂ اردو کے اراکین کو مبارک باد پیش کرتا ہوں جو ایسے شعرا کی خدمات کو منظر عام پر لا رہے ہیں جنھوں نے واقعی اردو کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور ایک نسل کو اپنی شاعری سے متاثر کیا ہے۔ شاہد چودھری نے کہا کہ اسرار الحق اسرار کی تخلیقی فکر غضب کی ہے اور ساتھ ہی ان کی غزلیہ شاعری معنی آفرینی سے بھرپور ہے۔ نوازش منظور نے کہا کہ اسرار صاحب ایک بہترین شاعر ہیں اور ہم نے جو کچھ بھی اردو سیکھی ہے وہ آپ کے ہی طفیل سے سیکھی ہے۔ اس موقعے پر کثیر تعداد میں طلبہ وطالبات موجود رہے۔

پریس ریلیز: پروفیسر اسلم جمشید پوری، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، 5 مارچ 2024

پروفیسر ہریش نارنگ کا ترجمہ نگاری پر لیکچر

علی گڑھ: ترجمہ کرتے وقت متن میں مکمل طور پر ڈوبنا میرا حتمی مقصد ہوتا ہے کیونکہ یہ مجھے اصل مصنف کے خیال اور جذبے کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے۔ جو نہ صرف الفاظ اور اظہار میں پوشیدہ ہوتا ہے بلکہ تحریر کے انداز میں بھی پنہاں ہوتا ہے۔'' ان خیالات کا اظہار جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے سابق استاد پروفیسر ہریش نارنگ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی کے ڈسکشن گروپ اور شعبہ لسانیات کے اشتراک سے ترجمہ کے موضوع پر منعقدہ اپنے لیکچر میں کیا۔ پروفیسر ہریش نارنگ نے ترجمے کی پیچیدگیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی تحریر کی کشش، ترجمے کی سب سے بڑی وجہ ہوتی ہے۔ جب انھیں کوئی تحریر پسند آتی ہے تو وہ اس کا ترجمہ کرتے ہیں اور پسند آنے کی وجہ صرف الفاظ نہیں بلکہ تحریر کا انداز اور اس کا پیغام بھی ہوتا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے کہا کہ بعض

اوقات، ترجمہ کے لیے کسی متن کو دو یا تین سے زیادہ بار پڑھنا پڑتا ہے۔ انھوں نے پریم چند کی گئودان، اوم پرکاش والمیکی کی جوٹھن، ایم جی وسان جی کی اوہورو اسٹریٹ سے مثالیں بھی پیش کیں۔ پروفیسر عائشہ منیرہ نے پروفیسر نارنگ کا تعارف کرایا اور ترجمے میں ان کی غیر معمولی مہارت کو اجاگر کیا۔ پروفیسر جہانگیر وارثی، چیئر پرسن، شعبہ لسانیات نے اپنے اختتامی کلمات میں کہا کہ ترجمہ کرتے وقت مترجم کو مصنف کے استعمال کردہ کسی بھی لفظ اور اظہار کے سیاق وسباق، ٹائم فریم اور ثقافت پر توجہ دینی ہوتی ہے۔ پروفیسر عاصم صدیقی، چیئر پرسن، شعبہ انگریزی نے معلوماتی خطاب کے لیے پروفیسر نارنگ کا شکریہ ادا کیا اور سیشن کے فوائد بیان کیے۔ آخر میں سوال جواب کا سیشن بھی ہوا۔ ریسرچ اسکالر عظمیٰ آفرین نے شکریہ ادا کیا جب کہ مریم صدیقی نے پروگرام کی نظامت کی۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 25 فروری 2024

اردو اور ہندی مشترکہ تہذیبی وراثت

لکھنؤ: ہندی اور اردو دونوں اہم ہندوستانی زبانیں ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ دونوں زبانوں کا فروغ مغلیہ حکومت کے زوال کی آہٹ کے ساتھ ہی شروع ہوتا ہے۔ دونوں زبانوں کی گرامر تقریباً ایک ہونے کی وجہ سے ان کا فروغ بھی ایک ساتھ ہی شروع ہوا مگر وقت گزرنے کے ساتھ دونوں زبانوں کے اسلوب میں تھوڑی بہت تبدیلی نظر آنا شروع ہوتی ہے اور اس وجہ سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ زبانوں کی سطح پر جتنا گہرا رشتہ اور قربت اردو اور ہندی زبانوں میں ہے دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں ہے بلکہ اردو اور ہندی ملک کی مشترکہ ثقافت اور وراثت ہیں۔ مذکورہ خیالات کا اظہار انڈین نیشنل لیگ اتر پردیش کے صدر حاجی فہیم صدیقی نے اتر پردیش اردو اکادمی کے اشتراک اور اودھ ویلفیئر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقد یک روزہ سمینار 'ارد و اور ہندی مشترکہ تہذیبی وراثت' کی صدارت کرتے ہوئے دارالشفا لکھنؤ میں کیا۔

سمینار میں افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے کنوینر پروگرام و صدر فاؤنڈیشن صبیحہ سلطانہ نے مہمانوں کا استقبال کرنے کے بعد فاؤنڈیشن کے اغراض ومقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ نظامت کے فرائض صحافی ضیاء اللہ صدیقی نے انجام دیے۔ مہمانِ خصوصی انیس منصوری (سابق ریاستی وزیر وقومی صدر پسماندہ مسلم سماج) نے سمینار میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہندی اور اردو دونوں سگی بہنیں ہیں اور اردو کے کچھ روزمرہ استعمال میں آنے والے الفاظ کا بدل کوئی دوسرا ہندی لفظ نہیں ہے۔ زبانوں کا تعلق مذہب سے ہرگز نہیں ہوتا ہے۔ مہمان اعزازی سینئر صحافی ہمایوں چودھری اور ناگرک ادھیکار پریشد کے صدر رفیع احمد نے مشترکہ طور پر کہا کہ کچھ معاملات اور حالات میں اردو اور ہندی مختلف ہونے کے باوجود دونوں زبانیں متحدہ ہندوستانی کلچر اس وقت اختیار کرنے لگیں، اور اس گنگا جمنی تہذیب کو ایک نئے معنی میں پنپنے کا موقع تب ملا جب اردو نے اپنے برگ وبار ہندوستان کے گوناگوں خطوں میں پھیلانا شروع کردیا۔ مولانا الیاس منصوری، ڈاکٹر ارشاد احمد خان، ڈاکٹر سید محمد صبیح، ضیاء اللہ صدیقی ندوی، ڈاکٹر ناظر حسین، ڈاکٹر اعجاز احمد، صفی ابن صفی، نکہت زہرا اور صدف فاطمہ نے موضوع کے مختلف پہلوؤں پر مقالات پڑھے، آخر میں کنوینر سمینار صبیحہ سلطانہ اور کوآرڈینیٹر شفعت سلطانہ نے مہمان اور مقالہ نگاران وحاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 فروری 2024

شمیم حنفی کی تنقید نگاری

میرٹھ: ہم ادیبوں کی بات کرتے ہیں، ادب کی بات کرتے ہیں اور ناقدین کی بات کرتے ہیں مگر یہ نہیں

بتاتے کہ ان کی کون سی تخلیق یا تنقید اچھی ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی جدیدیت کے بڑے نمائندہ تھے لیکن کبھی انھوں نے ترقی پسندی کی برائی نہیں کی۔ یہ الفاظ تھے جرمنی سے معروف ادیب عارف نقوی کے جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے زیر اہتمام منعقد 'پروفیسر شمیم حنفی کی تنقید نگاری' میں اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی۔ مہمانان کے بطور ڈاکٹر عقیل احمد اور ڈاکٹر سراج اجملی نے آن لائن شرکت کی۔ مقالہ نگار کے بطور شعبہ اردو کے ریسرچ اسکالر شاہ زمن اور شہناز پروین نے شرکت کی۔ جب کہ مقرر کے بطور ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین شریک رہیں۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی، نظامت شاہ زمن اور شکریے کی رسم ریسرچ اسکالر عظمیٰ سحر نے ادا کی۔ موضوع کا تعارف پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے کہا کہ پروفیسر شمیم حنفی ناقد کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ پوری اردو دنیا آپ کی تنقید نگاری کو تسلیم کرتی ہے۔ آپ کی ناقدانہ صلاحیت اور تنقیدی بصیرت سے اردو اسکالرز بڑی تعداد میں مستفیض ہو رہے ہیں۔ صدر شعبۂ اردو اور معروف ادیب اور فکشن ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ شمیم حنفی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک ناقد ہی نہیں ایک بہترین شاعر اور اچھے ڈراما نگار بھی تھے۔ آپ نے 'جامعہ' کے کئی خصوصی نمبر شائع کرائے۔ انھوں نے اپنی تنقید سے پوری دنیا میں اپنا منفرد اور اہم مقام بنایا۔ پروفیسر سراج اجملی نے کہا کہ شمیم حنفی کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ ان کی تخلیقی اور تنقیدی تحریروں سے ایک بڑی تعداد استفادہ کر رہی ہے۔ پروفیسر عقیل نے کہا کہ شمیم حنفی اپنے عہد کے بڑے ناقد، محقق اور فلسفی تھے۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ وہ ایک بہترین استاد بھی تھے۔ پروفیسر ریشما پروین نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر شمیم حنفی صاحب ایسی شخصیت کے مالک تھے کہ ان پر ایک بڑا پروگرام منعقد ہونا چاہیے۔ ایک نشست میں ان کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا جاسکتا۔ ان پر مستقل کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر شاہ زمن نے 'پروفیسر شمیم حنفی بحیثیت محقق وناقد: ایک مطالعہ' اور شہناز پروین نے 'پروفیسر شمیم حنفی ایک مطالعہ' عنوانات سے اپنے پر مغز مقالات پیش کیے جن کو سامعین نے خوب پسند فرمایا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 9 فروری 2024

قانون مزاح اور اردو شاعری

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی فیکلٹی آف لا کے زیر اہتمام سپریم کورٹ آف انڈیا، نئی دہلی کے سینئر ایڈوکیٹ مسٹر اعجاز مقبول نے 'قانون، مزاح اور اردو شاعری' کے عنوان پر ایک لیکچر دیا اور قانونی بحث میں اردو شاعری کے دلچسپ امتزاج کا ذکر کرتے ہوئے اس کے استعاراتی، طنزیہ اور مزاحیہ جہات پر روشنی ڈالی، مہمان مقرر کا خیر مقدم کرتے ہوئے فیکلٹی آف لا کے ڈین پروفیسر ایم زیڈ ایم نعمانی نے وکالت، خاص طور پر معذوری سے متعلق قانون اور پالیسی سازی میں ان کی خدمات کو سراہا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 16 فروری 2024

مولانا آزاد کی صحافتی خدمات

لکھنؤ: مولانا آزاد نے اردو صحافت کو اس معراج پر پہنچایا کہ وہ دیگر ترقی یافتہ زبانوں کی صحافت کے ہم پلہ

قرار پائی۔ انھوں نے اردو صحافت کو نہ صرف ایک عظیم مشن اور مقصد کی راہ پر ڈالا بلکہ اسے زمانے کی رفتار سے بھی آنکھیں چار کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ ان خیالات کا اظہار اردو کے ممتاز صحافی جناب معصوم مرادآبادی نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے لکھنؤ کیمپس میں مولانا آزاد کے یوم وفات کی مناسبت سے منعقد توسیعی خطبے کے دوران کیا۔ وہ 'مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافتی خدمات' کے موضوع پر کیمپس میں توسیعی خطبہ پیش کررہے تھے۔ خطبے کی صدارت اردو کے ممتاز ادیب اور دانشور ڈاکٹر مسعودالحسن عثمانی نے فرمائی۔ کیمپس کی انچارج ڈاکٹر ہما یعقوب نے خیر مقدمی کلمات ادا کیے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر عمیر منظر نے کی۔ شکریہ ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی نے ادا کیا۔

معصوم مرادآبادی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مولانا آزاد کو ہم کئی حیثیتوں سے جانتے ہیں۔ لیکن ان میں صحافت ایک ایسا میدان تھا، جہاں ان کی موجودگی سب سے زیادہ محسوس کی گئی۔ صحافت ان کی مقبولیت اور ہردلعزیزی ہی کا ذریعہ نہیں بنی بلکہ خود ان کے افکار، طرز نگارش، منفرد اسلوب اور جدت طرازی نے اسے بام عروج تک پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ صحافت کو ان کی فطرت ثانیہ بھی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے توسیعی خطبے میں کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد پر اخبار نویسی کو اختیار کرنے سے پہلے اس کے خدوخال واضح تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہاں ترقی حاصل کرنے کے علاوہ آزادی کے حصول کے لیے عوام الناس میں بیداری اور شعور پیدا کرنے کا کام صحافت سے جس مؤثر انداز میں لیا جاسکتا ہے اتنا کسی دوسری چیز سے نہیں لیا جاسکتا۔ انھوں نے مزید کہا کہ مولانا آزاد صحافت کے مشن میں کسی بھی آلائش اور ذاتی مفاد کے مخالف تھے اور اخبار نویس کے قلم کو پوری طرح آزاد اور بے باک دیکھنا چاہتے تھے۔

صدارتی خطاب میں ڈاکٹر مسعودالحسن عثمانی نے کہا کہ مولانا آزاد خود ایک تاریخ تھے۔ انھوں نے جس میدان میں قدم رکھا اسے بام عروج تک پہنچایا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد اردو صحافت کا معیار اور اعتبار دونوں ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 23 فروری 2024

اردو میں ناولٹ نگاری

میرٹھ: ہم انگریزی میں ناولٹ کا استعمال کیوں کررہے ہیں۔ کیا اردو میں کوئی نام نہیں ہے۔ اس پر بھی غور کرنا چاہیے۔ اردو میں ہمیں کوئی لفظ نظر کیوں نہیں آتا۔ عام طور سے یہ پڑھتے ہیں کہ پہلا ناول یا پہلا افسانہ کس نے لکھا، لیکن کیوں لکھا اس کی بھی وضاحت ہونی چاہیے۔ جہاں تک تکنیک کا سوال ہے تو اس تکنیک پر کوئی بھی کتاب لکھ سکتا ہے۔ یہ الفاظ تھے جرمنی سے معروف ادیب عارف نقوی کے جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے زیر اہتمام منعقد 'اردو میں ناولٹ نگاری' موضوع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کررہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی۔ مہمانانِ خصوصی کے بطور معروف صحافی اور ناقد ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی اور پروفیسر عابد حسین حیدری نے آن لائن شرکت کی۔ مقالہ نگار کے بطور ریسرچ اسکالر شہناز پروین، شاہ زمن اور ڈاکٹر شبستاں آس محمد نے شرکت کی۔ تعارف ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور نظامت کے فرائض ریسرچ اسکالر علمہ نصیب نے انجام دیے۔ موضوع کا تعارف پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے کہا کہ داستان، ناول کی مانند ناولٹ بھی اردو فکشن کی اہم صنف ہے۔ یہ ایک ایسی صنف ہے جس کے اجزائے ترکیبی ناول سے کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ ناولٹ کے میدان میں جن ناقدین ادب کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور پڑھا جاتا ہے ان میں ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی اہمیت کے حامل ہیں۔ آپ نے ناولٹ پر پہلا تحقیقی وتنقیدی مقالہ پیش کیا جس میں ناولٹ کے فن اجزائے ترکیبی وغیرہ پر خاص بحث کی گئی ہے۔ اس موقعے پر صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ آج کل اردو میں ناولٹ پر بات بہت کم ہوتی ہے۔ ناول طویل ہوتا ہے جس میں کینوس بھی بڑا ہوتا ہے جب کہ ناولٹ میں کہانی چھوٹی ہوتی ہے اور کردار بھی کم ہوتے ہیں۔ اس کی ابتدا کا سہرا بھی ڈپٹی نذیر احمد کے ناول 'ایامیٰ' کو جاتا ہے۔ 'لندن کی ایک رات' بھی اچھا ناولٹ ہے۔ اس میں پہلی بار اردو میں شعور کی رو کا استعمال ہوا ہے۔ ناولٹ ایک الگ صنف ہے جس کا فروغ ہونا چاہیے۔ ایم جی ایم پی کالج، سنبھل کے سابق پرنسپل پروفیسر عابد حسین حیدری نے کہا کہ ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نے اپنے مقالے میں جو سوال اٹھایا ہے کہ کون سا پہلا ناولٹ ہے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے جب کہ ہم آپ نے نذیر احمد کے ناول 'ایامیٰ' کو پہلا ناولٹ تسلیم کیا ہے۔ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نے کہا کہ پہلا ناول یا پہلا ناولٹ کون سا ہے اور کیوں ہے اس پر بہت کم بات ہوتی ہے۔ ناولٹ کے تجزیے کے ساتھ ساتھ تکنیک پر بھی بھرپور کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اب ضخیم ناول پڑھنے کا وقت نہیں ہے۔ ناولٹ کی ترویج ہونا چاہیے اور ناولٹ نگار کو اعزاز و اکرام سے بھی نوازا جائے۔ اس پروگرام میں شہناز پروین نے 'ناولٹ اور ہماری ذمے داریاں'، شاہ زمن نے 'ناولٹ نگاری کا مختصر تعارف' اور ڈاکٹر شبستاں آس محمد نے 'قدرت اللہ شہاب کی ناولٹ نگاری یا خدا کے آئینے میں' عنوانات سے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 23 فروری 2024

مادری زبان کی اہمیت

میرٹھ: اسماعیل نیشنل مہیلا پی جی کالج کے شعبۂ اردو کی جانب سے عالمی یوم مادری زبان کے موقعے پر کالج کی پرنسپل پروفیسر انیتا راٹھی کی رہنمائی میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی مہمانِ خصوصی پروفیسر دیپا تیاگی نے مادری زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ زبان ہمیں آپس میں باندھنے کا کام کرتی ہے۔ سچے ہندوستانی لسانی تنازعات میں نہیں پڑتے۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ تمام زبانوں کو پڑھیں اور ان کا احترام کریں۔ اس موقعے پر طالبات نے جوش وخروش سے حصہ لیا۔ اریبہ نے 'مادری زبان کا تعارف اور اہمیت' پر اپنے خیالات پیش کیے۔ کشش خان نے 'مادری زبان ہماری پہچان'، ذکیہ کوثر نے 'اردو زبان اور ہم' کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ طالبہ مدیحہ رحمان نے اقبال اشہر کی نظم 'اردو ہے میرا نام میں خسرو کی پہیلی' مترنم آواز میں پڑھ کر سب کو محسور کردیا۔ پروگرام کی کنوینر ڈاکٹر عفت ذکیہ نے پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے کہا کہ مادری زبان کے تئیں محبت ہر انسان پر فرض ہے کیونکہ مادری زبان ہی انسان کی شخصیت سازی میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے ہم پر فرض ہے کہ یوم مادری زبان کو جوش وخروش سے منائیں۔ فاکہہ نے سب کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 22 فروری 2024

مجنوں گورکھپوری کی ادبی شخصیت

لکھنؤ: یاسمین شریف ویلفیئر سوسائٹی بہ اشتراک اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ شہر کے سید حامد علی ہال، آغوش حمیدیہ میں ایک 'کلیدی خطبہ' بہ عنوان پروفیسر احمد صدیق مجنوں گورکھپوری اور شعری نشست کا اہتمام کیا گیا، جس میں خطبہ کے لیے جے این یو کے شعبہ اردو کے پروفیسر محمد شاہد حسین اور صدارت کے لیے شہر کے معروف ڈاکٹر عزیز احمد و مہمان خصوصی کے طور پر اتر پردیش اردو اکادمی کے سابق چیئر مین چودھری کیف الوری انصاری و مہمان ذی وقار کی حیثیت سے پروفیسر چترنجن مشر، محبوب سعید حارث، مہمان ذی شان کی حیثیت سے ڈاکٹر درخشاں تاجور نے شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز فرخ جمال نے کیا۔ بعد ازاں سوسائٹی کے سکریٹری ڈاکٹر اشفاق احمد عمر نے اپنے تعارفی کلمات میں اتر پردیش اردو اکادمی سابق چیئر مین و سکریٹری ڈاکٹر ایس ایم عادل حسن صاحب و شوکت علی کا خصوصی شکریہ ادا کیا اور پروفیسر محمد شاہد حسین کو کلیدی خطبہ پیش کرنے کے لیے دعوت سخن بھی پیش کی۔ شاہد حسین نے کہا کہ مجنوں نے جو مضبوط ڈگر اردو ادب کو فراہم کی تھی آج ہم اردو والے کہیں نہ کہیں اسی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ مزید کہا کہ مجنوں کی چوکھی شخصیت کی تراش خراش اسی شہر گورکھپور سے ہوئی جنھوں نے اپنے تنقیدی اور شاعرانہ خوبیوں سے پورے ہندوستان میں شہر گورکھپور کی نمائندگی کی۔ شاہد حسین کی گفتگو کے بعد شہر کے ابھرتے ہوئے محقق و تنقید نگار ڈاکٹر اشفاق احمد عمر کی کتاب اردو زبان کے امتیاز کی رسم رونمائی بھی عمل میں آئی۔ سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے شہر کے تین مشہور ڈاکٹر کو 'پیغام انسانیت' اعزاز بھی دیا گیا جن میں ڈاکٹر ندھی کھیتان، ڈاکٹر دشینت سنگھ، ڈاکٹر ثروت علی شامل تھے۔ پروگرام میں مہمان ذی وقار پروفیسر چترنجن مشر نے کہا کہ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم مجنوں کے شہر کے ہیں۔ مجنوں کو اردو انگریزی اور ہندی کا کوئی ایسا طالب علم نہیں جو نہ جانتا ہو۔ ان کے کارنامے جگ ظاہر ہیں اردو ہندی آلوچنا میں ان کے کام سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر درخشاں تاجور نے مجنوں کی شخصیت اور ان کی شاعری پر مقالہ پڑھا جسے سامعین نے خوب پسند کیا۔ اسلامیہ کالج

کے مینیجر محبوب سعید حارث نے بتایا کہ مجنوں صاحب کا تعلق اسلامیہ انٹر کالج سے بھی رہا ہے وہ بحیثیت استاد یہاں رہ چکے ہیں، اس زمانے کے لوگ بتاتے تھے کہ ان کی شخصیت میں جو بالیدگی اور گہرائی ہے وہ اب عنقا ہوگئی ہے۔ پروگرام کے اختتام پر ڈاکٹر عزیز احمد نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ مجنوں صاحب سے ہمارے دیرینہ مراسم تھے وہ علی گڑھ کے زمانے میں والد محترم سے بڑے قریب تھے، ہمیشہ گھنٹوں گھنٹوں والد صاحب سے ان کی الگ الگ موضوعات پر گفتگو چلتی تھی۔ ان جیسا وسیع النظر اب میری نظر سے اوجھل ہے۔ پروگرام کے پہلے سیشن کے بعد ایک شعری نشست کا بھی اہتمام تھا، جس میں شہر کے مشہور و معروف شاعروں نے شرکت کی۔

پریس ریلیز: اشفاق احمد عمر، لکھنؤ، 26 فروری 2024

پروفیسر افغان اللہ خاں اردو ادب کی نستعلیق شخصیت: ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

لکھنؤ: 2 مارچ 2024 پروفیسر افغان اللہ خاں کی وفات کے بعد شہر گورکھپور کی ادبی دنیا جو انکی بے تکلف گفتگو سے

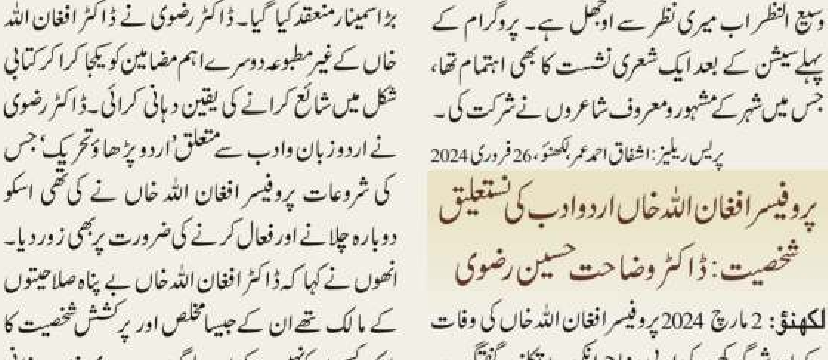

گلزار رہتی تھی بے جان اور سونی ہوگئی۔ اپنی قلندرانہ مزاج کے سبب وہ سب کو عزیز تھے۔ اردو ادب کی ترقی و ترویج کی فکر میں تا حیات جدو جہد کرتے رہے۔ ان کو سیاحت کا بڑا شوق تھا جس سے بھی ملتے اسکو اپنا بنا لیتے تھے۔

افغان اللہ خان میموریل کمیٹی کے تحت گورکھپور میں واقع 'آغوش حمیدیہ' میں ان کی سولہویں برسی پر منعقد سمینار کے صدارتی خطبے میں معروف معالج ڈاکٹر عزیز احمد نے یہ اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ وہ ہمیشہ ادب کی آبیاری میں سرگرداں رہے۔ ان کی شخصیت کے نقوش ہمارے دلوں میں ثبت ہیں۔ سابق ڈپٹی ڈائریکٹر و ماہنامہ نیا دور کے ایڈیٹر ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نے کہا کہ معاشرے میں کچھ شخصیت ایسی ہوتی ہیں جنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انھیں میں سے ایک پروفیسر افغان اللہ خان ہیں۔ وہ میرے شفیق استاد تھے، جب بھی وہ کسی سے میرا تعارف کراتے تو کہتے کہ یہ میری پہلی اولاد ہے۔ کیونکہ ان کی سرپرستی میں ہی پہلا ریسرچ اسکالر تھا۔ ڈاکٹر رضوی نے کہا کہ استاد محترم کی خدمات پر جتنا کام ہونا چاہیے ابھی نہیں ہوا ہے۔ انھوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کو مستحکم بنانے اور ترقی دینے میں اپنی جی جاں لگا دینے سے والی شخصیت پر 16 برس گزر جانے کے بعد بھی ان کی حیات و خدمات سے متعلق کسی طالب علم کا پی ایچ ڈی میں رجسٹریشن نہیں کیا گیا اور نہ ہی ان پر کوئی بڑا سمینار منعقد کیا گیا۔ ڈاکٹر رضوی نے ڈاکٹر افغان اللہ خاں کے غیر مطبوعہ دوسرے اہم مضامین کو یکجا کرا کر کتابی شکل میں شائع کرانے کی یقین دہانی کرائی۔ ڈاکٹر رضوی نے اردو زبان و ادب سے متعلق 'اردو پڑھاؤ تحریک' جس کی شروعات پروفیسر افغان اللہ خاں نے کی تھی اسکو دوبارہ چلانے اور فعال کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر افغان اللہ خاں بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے ان کے جیسا مخلص اور پرکشش شخصیت کا مالک کسی اور کو نہیں دیکھا۔ وہ لوگوں سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے تھے، سب کو پیار کرتے تھے۔ سینئر صحافی قاضی عبدالرحمٰن نے کہا کہ افغان اللہ صاحب نے ادبی سنجیدگی

خود پر طاری نہیں کی وہ عوام کے لیے تھے انھوں نے اردو کو مقبول بنانے کے لیے دور دراز علاقوں میں شعبہ اردو قائم کر کے اردو زبان کی خدمت کی۔ فراق گورکھپوری پر کوئی مقالہ افغان اللہ خاں کے تذکرہ کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر درخشاں تاجور نے افغان اللہ خاں کی شاعری کے پس منظر میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے جس طرح میری رہنمائی کی اس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر ترنم حسن پروفیسر افغان اللہ خاں کی شاگردہ ہونے پر فخر کا اظہار کرتے ہوئے انکی تخلیقات کا اجمالی جائزہ لیا۔ اس تقریب میں محمد افراہیم، ڈاکٹر رفیع اللہ، محمد انور ضیا، ڈاکٹر طاہر علی سبز پوش، ڈاکٹر اعظم بیگ، ڈاکٹر احتشام الحق، ڈاکٹر جاوید احتشام الحق، ڈاکٹر اشفاق عمر، ڈاکٹر بہار گورکھپوری، عبدالباقی، قاضی کلیم الحق خاں، عامر عباسی، عاصم روف، عمیر صدیقی کے علاوہ کثیر تعداد میں ادب دوست موجود تھے۔ پروگرام میں نظامت کے فرائض فرخ جمال نے کی۔ آخر میں کمیٹی کے صدر جناب رضوان اللہ خاں نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: وضاحت حسین رضوی، لکھنؤ، 3 مارچ 2024

پنجاب

ادیب سے ملیے

چنڈی گڑھ: اردو نے دنیا کے بڑے ادب سے آنکھ ملانے والا ادب پیدا کیا ہے، شعر اور نثر دونوں میں اردو میں جن ادبی شاہکاروں کی تخلیق ہوئی ہے وہ کسی بھی طرح عالمی ادب کی اعلیٰ پائے کی تخلیقات سے کم نہیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر انیس اشفاق نے پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ کی اس لینگویج کانگریس میں کیا جس میں انھیں 'ادیب سے ملیے' عنوان کے تحت پروگرام میں اپنے فن اور شخصیت پر تفصیلی گفتگو کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے سے زائد کی اس گفتگو میں پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر علی عباس ان سے محو مکالمہ رہے۔ اس اہم اور تفصیلی گفتگو میں پروفیسر انیس اشفاق نے نہ صرف اپنی ادبی اور تخلیقی تصنیفات پر گفتگو کی بلکہ اردو ادب کی مجموعی صورت حال کو بھی موضوع گفتگو بنایا۔ ادبی دنیا میں اس وقت چونکہ انیس اشفاق کے ناول موضوع گفتگو ہے اس لیے اس گفتگو کا بیشتر حصہ ان کے ناولوں پر مرکوز رہا۔ انیس اشفاق نے سامعین کے سامنے اپنے ناولوں کے موضوعات اور ان کے وجود و محرکات تفصیل سے بیان کیے اور ناول کے فن پر بھی سیر حاصل گفتگو کی نیز انھوں نے اپنے تازہ ناول 'پیچ' کے موضوع پر بھی مختصراً روشنی ڈالی۔ پروفیسر انیس اشفاق نے اپنے ناولوں کے علاوہ اپنی تنقید اور شاعری پر بھی بات کی۔ انھوں نے اردو تنقید کی صورت حال پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو تنقید بہت آگے نکل چکی ہے اور اس میں تنقید کے سارے نئے عالمی رجحانات کی نمائندگی ہو رہی ہے، جب ان سے ان کی شاعری کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ 'میں شاعری میں کیا کہنا ہے سے زیادہ کیسے کہنا ہے؟ کو اہمیت دیتا ہوں اور موضوع سے زیادہ اسلوب کو اہم جانتا ہوں۔ اس گفتگو میں انیس اشفاق کی سفرنامہ نگاری اور رپورتاژ نگاری پر بھی سوال کیے گئے جن کے جواب میں انھوں نے کہا کہ سفرنامے اور رپورتاژ دونوں میں ادبی اور تخلیقی عناصر کا ہونا ضروری ہے، صرف واقعے کو واقعہ کی سطح پر بیان کر دینے سے بات نہیں بنتی۔ خاکہ نگاری اور ترجمے کے فن پر کیے گئے سوالوں کے جواب میں انیس اشفاق نے کہا کہ ترجمہ بہت مشکل کام ہے۔ ایک اچھے ترجمے کے لیے مترجم کی دونوں زبانوں سے یکساں واقفیت ضروری ہے۔ ایک اچھا اور کامیاب ترجمہ کسی اچھی تخلیق سے کم نہیں، اسی طرح خاکہ نگاری بھی ایک مشکل فن ہے، اچھا خاکہ وہی ہے جس میں جس پر خاکہ لکھا جا رہا ہے وہ زندہ ہو جائے۔ پروفیسر انیس اشفاق نے اس موقعے پر نیر مسعود، شمس الرحمٰن فاروقی، عرفان صدیقی اور شمیم حنفی کا نام لے کر اردو کی ان چار بڑی ہستیوں کو یاد کیا، حال ہی میں جن کے اٹھ جانے سے فکشن، تنقید اور شاعری کا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ اس تفصیلی گفتگو میں عالمی اور علاقائی ادب کے برمحل حوالے بھی آتے رہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 20 فروری 2024

تلنگانہ

مطالعہ میر کی اہمیت

حیدرآباد: ''میر کی شاعری کی بہت ساری جہتیں ہیں۔ انھیں تلاش کرنے اور منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔'' ان خیالات کا اظہار ممتاز ادیب و نقاد اور محقق پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، استاد ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نے شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جانب سے منعقدہ لیکچر 'مطالعہ میر کی اہمیت' میں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ بڑے فنکاروں کے صرف ایک پہلو کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ ان کے دیگر پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ میر، نظیر، اکبر، میر امن، مرزا رسوا کے ساتھ بھی یہی معاملہ درپیش ہے۔ ان کی تمام خدمات پر توجہ نہیں دی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں بندھی ٹکی راہ پر چلنے کی روش عام ہے۔ ادب کی ترویج و ترقی کے لیے نئے گوشے تلاش کرنے اور نئی بات کہنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے مطالعہ اور تحقیق لازمی ہے۔ میر کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ مثنوی، قصیدہ، رباعی، حمد، نعت، منقبت وغیرہ بھی موجود ہیں۔ لیکن ان کی غزل گوئی پر ہی زیادہ توجہ دی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طلبہ اور شائقین مکمل دیوان پڑھنے کی بجائے انتخاب کلام کا مطالعہ کرتے ہیں۔ میر نے زبان کا خلاقانہ استعمال کیا ہے۔ انھوں نے نئی لفظی جہات کے ساتھ معانی کی ایک نئی دنیا آباد کی ہے۔ انھوں نے ایسے حروف پر مبنی الفاظ کا استعمال کیا ہے جن سے اشعار میں دھیما لہجہ اور موسیقیت پیدا ہو گئی ہے۔ انھیں چاہ کر بھی اونچے سر میں پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ پروگرام کے آخر میں موصوف نے طلبہ کے سوالات کے جواب بھی دیے اور انھیں کھلے ذہن کے ساتھ مطالعے کی ترغیب دی۔ پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی، صدر شعبۂ اردو نے مہمان مقرر کا جامع تعارف پیش کیا اور کارروائی چلائی۔ انھوں نے میر کے مطالعے کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے مخفی گوشوں کو اجاگر کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور ریسرچ اسکالرز کو مشورہ دیا کہ شعرا کے کلام کا انتخاب پڑھنے کی بجائے مکمل دواوین کا مطالعہ کریں۔ تبھی وہ شعرا کے ساتھ خاطر خواہ انصاف کر سکیں گے۔ ڈاکٹر فیروز عالم، ایسوسی ایٹ پروفیسر کے اظہارِ تشکر پر پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد مصطفیٰ علی سروری، پبلک ریلیشنز آفیسر انچارج 8 فروری 2024

اردو شاعری میں تصوف

حیدر آباد: تصوف اور اردو شاعری دونوں کی بنیاد محبت ہے۔ تصوف کو ہمارے بزرگوں نے دل کی بیداری کے طور پر پیش کیا۔ تصوف پر جغرافیائی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ تصوف مذہب کا متبادل نہیں بلکہ تصوف مذاہب کے باطنی پہلو پر توجہ دیتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز شاعر و ادیب، محقق اور صحافی جناب شمیم طارق نے شعبۂ اردو مانو کی جانب سے 'اردو شاعری میں تصوف' کے موضوع پر توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے متعدد صوفیوں بشمول بلھے شاہ اور شعراء میر، درد، غالب، مومن، اقبال، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی وغیرہ کے کلام میں تصوف کے عناصر کی نشاندہی کی۔ انھوں نے مزید بتایا کہ غیر مسلم شعرا نے بھی تصوف کے مضمون کو شاعری میں برتا۔ شمیم طارق صاحب نے تصوف کی اصطلاحات مثلاً ذات الٰہی، فنا اور بقا، مجاز اور حقیقت، جنت اور جہنم، سلوک و معرفت، مجذوبیت وغیرہ سے واقف کرانے کے ساتھ ساتھ مومن اور موحد کا فرق اور سوشلزم اور تصوف کے تعلق پر بھی روشنی ڈالی۔ صدر اجلاس پروفیسر سید علیم اشرف جائسی، ڈین بہبودی طلبہ اور صدر شعبہ عربی، مانو نے کہا کہ تصوف کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ خلق خدا کے ساتھ نرمی کی جائے۔ تصوف تزکیہ نفس کا نام ہے۔ تصوف صرف اسلام میں ہے۔ بقیہ مذاہب میں روحانیت ہے۔ ابن عربی نے وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا۔ یہ ایک فلسفیانہ نظر ہے۔ انھوں نے کہا کہ تصوف نے تین کام کیے۔ تبلیغ کتاب یعنی قرآنی تعلیمات کو عام کیا، نفوس کی تطہیر کی اور علم و حکمت یعنی شریعت کی تشہیر کی۔ پروفیسر عزیز بانو ڈین اسکول برائے السنہ، لسانیات و ہندوستانیت نے شعبہ اردو کو اس لیکچر کے انعقاد کے لیے مبارکباد دی اور کہا کہ جناب شمیم طارق نے تصوف کے موضوع پر بہترین گفتگو کی اور اس کے مختلف پہلوؤں سے واقف کرایا۔ پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی، صدر شعبہ اردو نے خیر مقدمی تقریر میں اردو شاعری میں تصوف کے حوالے سے جامع گفتگو کی اور شعرا مثلاً ولی، سراج، میر، درد، آتش، اصغر وغیرہ کے کلام سے مثالیں پیش کیں۔ انھوں نے اس بات پر اظہارِ مسرت کیا کہ تصوف کے موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے آج دو اہم ماہرین شعبے میں تشریف فرما ہیں۔ انھوں نے مہمان مقرر شمیم طارق کا تفصیلی تعارف بھی پیش کیا۔ پروگرام کے کنویز ڈاکٹر فیروز عالم نے موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو زبان صوفیائے کرام کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ اردو میں شعری و نثری ادب کی ابتدا میں بھی صوفیوں کو ہی اولیت حاصل رہی ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 14 فروری، 2024

مخطوطہ شناسی پر دو روزہ ورکشاپ

حیدر آباد: مخطوطہ شناسی بہت مشکل فن ہے ہمیں کافی محنت اور جستجو کرنی پڑتی ہے، تب کہیں جا کر صحیح نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ یہ باتیں پروفیسر نسیم احمد (سابق صدر، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی) نے حیدرآباد یونیورسٹی میں منعقدہ دو روزہ مخطوطہ شناسی ورکشاپ میں کلیدی خطبہ دیتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر کسی متن کے کئی مخطوطات موجود ہیں تو ان کے حصول کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے اور ان تمام مخطوطات کی روشنی میں ہی کتاب مرتب کی جانی چاہیے تاکہ اصل متن تک رسائی ہو سکے۔ مخطوطہ شناسی میں عجلت بہت سی خرابیاں پیدا کرتی ہے۔ انھوں نے تدوین متن میں رونما ہونے والی کئی تسامحات کی نشاندہی کی۔ شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد میں دو روزہ قومی ورکشاپ 'انسٹی ٹیوشن آف ایمنس، یونیورسٹی آف حیدرآباد اور تلنگانہ گورنمنٹ اورینٹل مینو اسکرپٹس لائبریری، حیدرآباد' کے تعاون سے 15,16 فروری 2024 کو اسکول آف ہیومانٹیز کے کانفرنس ہال میں منعقد ہوا۔ اس ورکشاپ کے افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر وی۔ کرشنا (ڈین، اسکول آف ہیومانٹیز، یونیورسٹی آف حیدرآباد) نے کی۔ پروفیسر سید فضل اللہ مکرم نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقعے پر مخطوطہ شناسی کے ماہرین موجود تھے۔ پروفیسر نسیم الدین فریس (سابق ڈین، اسکول آف لینگویجز، مانو) نے مخطوطہ شناسی کے بنیادی نکات پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر مجید بیدار (سابق صدر، شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد) نے کہا کہ ہم نے اس موضوع کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ تقریباً تیس سال کے بعد مخطوطہ شناسی پر ورک شاپ منعقد ہو رہا ہے، شعبہ اردو مبارکباد کا مستحق ہے۔ ڈاکٹر پی سباراؤ (ڈائرکٹر، ٹی جی، ایم، اورینٹل لائبریری، حیدرآباد) نے مخطوطہ شناسی کی پوری تاریخ سلائڈس کے ذریعے سمجھانے کو کوشش کی اور کہا کہ سیکڑوں مخطوطات ریسرچ اسکالرز کے منتظر ہیں۔ گھسے پٹے موضوعات پر تحقیق کرنے کے بجائے مخطوطات پر کام کریں۔ جناب احمد علی (کیوریٹر، نظام میوزیم حیدرآباد) نے لکھنے کی روایت کو سب سے قدیم فن بتاتے ہوئے کہا کہ ہماری قدیم تحریروں میں بہت کچھ چھپا ہوا ہے، جنھیں پڑھ کر سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ نیز انھوں نے مخطوطوں کی نوعیت، دستیاب شدہ کاغذات اور سیاہی کے اقسام، اور رسم الخط پر تفصیلی گفتگو کی۔ پروفیسر وی کرشنا (ڈین، اسکول آف ہیومانٹیز، یونیورسٹی آف حیدرآباد) نے صدارتی خطبہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ آج قدیم مخطوطات کو سائنٹفک طریقے سے پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ دو روزہ ورک شاپ میں طلبا اور ریسرچ اسکالرز کے علاوہ شعبہ اردو کے اساتذہ نے بھی حصہ لیا اور ماہرین کے زیر نگرانی مخطوطات کے متون کی بازیابی کی کوشش کی۔ اس موقعے پر جناب فریداللہ (ریسرچ ایسوسی ایٹ سالار جنگ میوزیم) اور ڈاکٹر عبدالغنی نے ریسرچ اسکالرز کی اعانت کی۔ اس ورکشاپ میں ساتا واہنا یونیورسٹی سے ڈاکٹر جعفر جری اور ڈاکٹر ابرار الباقی اور امبیڈکر اوپن یونیورسٹی سے ڈاکٹر مخدوم محی الدین نے شرکت کی جب کہ مانو کے ریسرچ اسکالرز بھی شریک رہے۔ ورکشاپ کے آخر میں تمام شرکا کو سند اور مومنٹو پیش کیا گیا۔ بعد ازاں صدر شعبہ اردو پروفیسر فضل اللہ مکرم اور معاون کنویز ڈاکٹر اے آر منظر نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم، پروفیسر، شعبۂ اردو، اسکول آف ہیومنٹیز، یونیورسٹی آف حیدرآباد، 23 فروری 2024

اردو ادب کی نشو و نما میں غیر مسلم شعرا کا حصہ

حیدر آباد: شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد کے زیر اہتمام، انسٹی ٹیوٹ آف ایمنس کے تعاون سے، سہ روزہ قومی سمینار بعنوان 'اردو ادب کی نشو و نما میں غیر مسلم شعرا کا حصہ' مورخہ 6,7,8 فروری 2024 کو اسکول آف ہیومانٹیز کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ افتتاحی اجلاس میں 'عزت مآب وائس چانسلر پروفیسر بی جے راؤ' نے شرکت کی اور شمع روشن کر کے باقاعدہ پروگرام کا آغاز کیا۔ اس پروگرام کی صدارت پروفیسر وی کرشنا (ڈین، اسکول آف ہیومانٹیز، یونیورسٹی آف حیدرآباد) نے کی اور پروگرام کے مہمانان ذی وقار پروفیسر نسیم الدین فریس (سابق ڈین، اسکول آف لینگویجز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)، پروفیسر خواجہ اکرام الدین (جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)، پروفیسر شہزاد انجم (شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)، پروفیسر نجمہ رحمانی (صدر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف دہلی)، پروفیسر آفتاب آفاقی (شعبہ اردو، بنارس یونیورسٹی)، پروفیسر شہاب عنایت ملک (جموں یونیورسٹی) اسٹیج پر موجود تھے۔

پروگرام کی نظامت ڈاکٹر نشاط احمد (کنویز سمینار) نے کی اور سمینار کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ سمینار

کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے بتایا کہ اس سمینار کا مقصد اردو کے غیر مسلم شعرا کو منظر عام پر لانا، اردو زبان و ادب کی فلاح و بہبودی میں غیر مسلم شعرا کے کارناموں کو یاد کرنا اور یہ واضح کرنا ہے کہ اردو کسی ایک مذہب یا ایک قوم کی زبان نہیں ہے بلکہ ہندوستان میں رہنے والے تمام مذاہب واقوام کے لوگوں نے مل کر اس زبان کی نشو نما میں حصہ لیا ہے۔ ان کے بعد عزت مآب وائس چانسلر پروفیسر بی۔ جے۔ راؤ کو دعوت سخن دی گئی۔ انھوں نے اس اہم موضوع کے انتخاب پر شعبہ اردو کو مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے والد بھی اردو جانتے تھے یہی وجہ ہے کہ مجھے اس زبان سے جذباتی لگاؤ ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ایسے سمینار ہوتے رہنے چاہیے کیونکہ اس سے ہمارے زبان و ادب کو تقویت ملتی ہے۔ یہ سمینار ہمارے لیے کسی تہوار سے کم نہیں ہے۔ وائس چانسلر کے اس گراں قدر خطاب کے بعد پروفیسر شہاب عنایت ملک (جموں یونیورسٹی) نے خطاب کیا۔ انھوں نے شعبہ اردو کو مبارکباد پیش کی کہ انھوں نے کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک کے تمام غیر مسلم شعرا پر مقالات لکھوائے اور ایک واضح تصور پیش کیا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ ہندوستان کی زبان ہے۔ اس موقعے پر آفتاب احمد آفاقی (شعبہ اردو، بنارس یونیورسٹی) نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آفتاب احمد آفاقی کے بعد پروفیسر خواجہ اکرام الدین (جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی) نے سامعین سے خطاب کیا۔

پروفیسر نجمہ رحمانی (صدر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف دہلی) اس موقعے پر منشی نول کشور کو یاد کیا جنھوں نے پہلی پریس قائم کی جہاں اردو کی کتابیں چھپی۔ انھوں نے ریختہ کے فاؤنڈر سنجیو صراف کا ذکر کیا جنھوں نے اردو کی سب سے بڑی ڈیجیٹل لائبریری قائم کی ہے۔ پروفیسر نسیم الدین فریس (سابق ڈین، اسکول آف لینگویجز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی) نے موضوع کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس موضوع کی اپنی اہمیت ہے۔ شمال سے لے کر جنوب تک غیر مسلم شعرا کی طویل فہرست ہے جنھوں نے اردو ادب کی نشو نما میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر نسیم الدین فریس کی گفتگو کے بعد کلیدی خطبہ کے لیے پروفیسر شہزاد انجم (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) کو مدعو کیا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ اردو میں بے شمار غیر مسلم شعرا گزرے ہیں جنھوں نے اپنی شاعری سے اردو ادب کو تروتازہ کیا ہے جن میں جگن ناتھ آزاد، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، کرشن موہن طور، کرشن کمار، گلزار، چندر بھان خیال وغیرہ ہیں۔ فراق کے بغیر تو اردو غزل کی تاریخ ادھوری ہے۔ اس کلیدی خطبے کے بعد اجلاس کے صدر پروفیسر وی کرشنا (ڈین، اسکول آف ہیومانٹیز، یونیورسٹی آف حیدرآباد) نے صدارتی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ میرے والد پولیس میں تھے اور پڑھے لکھے نہیں تھے مگر دستخط اردو میں کیا کرتے تھے اور اسی بہانے اردو سے میرا پورا جیون جڑا ہوا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اردو اتنی پیاری زبان ہے کہ جتنی میری مادری زبان تلگو بھی نہیں ہے۔ افتتاحی جلسے کے بعد مشاعرہ کا آغاز پروفیسر مقبول فاروقی کی صدارت میں ہوا جس میں ملک بھر سے بہت سے شعراء کرام نے شرکت کی اور اپنا کلام پیش کیا۔

دوسرے دن باضابطہ ٹیکنیکل سیشنز کا آغاز ہوا اور کل سات ٹیکنکل سیشنز ہوئے۔ پہلے سیشن کے صدور پروفیسر آفتاب احمد آفاقی اور پروفیسر نجمہ رحمانی، دوسرے سیشن کے صدور پروفیسر مجید بیدار اور پروفیسر خواجہ اکرام الدین، تیسرے سیشن کے صدور پروفیسر شمس الہدی دریابادی اور پروفیسر شہاب عنایت ملک، چوتھے سیشن کے صدور پروفیسر نسیم الدین فریس اور پروفیسر سجاد حسین، پانچویں سیشن کے صدور پروفیسر قاسم علی خان اور ڈاکٹر معید جاوید، چھٹے سیشن کے صدور جناب رفیق جعفر، پروفیسر آمنہ تحسین ساتویں سیشن کے صدور ڈاکٹر صادقہ نواب سحر، شوکت حیات، ڈاکٹر عرشیہ جبین تھے۔ ان سیشنز میں 60 سے زائد مقالے پڑھے گئے۔

مقالہ نگاروں میں پروفیسر بشیر احمد، پروفیسر خواجہ اکرام الدین، پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر مقبول احمد مقبول، جناب اسلم مرزا، ڈاکٹر عبدالغنی، ڈاکٹر رؤف خیر، پروفیسر شمس الہدی دریابادی، ڈاکٹر امین اللہ، ڈاکٹر چمن لال، ڈاکٹر گل رعنا، ڈاکٹر شکیلہ گوری خان، ڈاکٹر الطاف انجم، ڈاکٹر شیخ عمران، ڈاکٹر ایف ایم سلیم، ڈاکٹر وصی اللہ بختیاری، ڈاکٹر اسرار الحق سبیلی، پروفیسر مسرت جہاں، ڈاکٹر نثار احمد، ڈاکٹر عبدالباری، ڈاکٹر انوپما پول، ڈاکٹر علیم اللہ حسینی، ڈاکٹر حکیم رئیس فاطمہ، ڈاکٹر محمد شارب، ڈاکٹر نصرت جبیں، ڈاکٹر محمد سمیع، ڈاکٹر محمد معین الدین، ڈاکٹر حمیرہ تسنیم، ڈاکٹر شمس الدین، ڈاکٹر عتیق اجمل، ڈاکٹر اطیع اللہ، ڈاکٹر فارق باشا، ڈاکٹر مخدوم، ڈاکٹر کلیم محی الدین، ڈاکٹر عبدالقوی، ڈاکٹر مبیدہ مزمل، ڈاکٹر مدثر احمد، ڈاکٹر زہرہ جبیں، ڈاکٹر جعفر جری، ڈاکٹر فیض اللہ، ڈاکٹر بی بی رضاء خاتون، ڈاکٹر ممتاز، ڈاکٹر نجمہ سلطانہ، ڈاکٹر ارشد سعدی، ڈاکٹر سردار ساحل، ڈاکٹر سمیہ، ڈاکٹر نوری خاتون، ڈاکٹر غوثیہ، ڈاکٹر ثمینہ جناب سیفی عمری، شبلی آزاد، اسما امروز، عاصم بدر، جمال الدین، نسرین، نازیہ، محمد نسیم، غوث محی الدین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز: پروفیسر سید فضل اللہ مکرم، صدر شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد، 22 فروری 2024

تملناڈو

یوم اردو

چینئی: شعبۂ اردو نیو کالج کے طلبا کی انجمن بزم اردو ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام بتاریخ 29 فروری 2024 کو یوم اردو و مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر سید سجاد عنایت نے استقبالیہ کلمات پیش فرمایا جبکہ پروگرام

کی نظامت شعبہ اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر ساجد حسین ندوی نے کی۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایم اسرار شریف نے اپنے افتتاحیہ کلمات میں کہا کہ پوری دنیا میں اس زبان کو پڑھنے، لکھنے اور بولنے والوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔ مہمان خصوصی اور مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سدن انڈیا (میاسی) کے سکریٹری جناب الیاس سیٹھ نے اپنے خطاب میں کہا کہ شعبہ اردو نیو کالج کا قیام 1951 میں ہوا اور اپنے قیام کے اول روز سے ہی یہ شعبہ فعال اور متحرک ہے، دن بدن اردو تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کی تعداد میں اضافہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ میاسی نے اردو کو گھر گھر پہنچانے کا عزم کیا ہے اور اس عزم کو پورا کرنے کے لیے جنوری 2024 میں فری آن لائن اردو کلاسیز کا آغاز کیا گیا جس میں فی الحال 50 سے زائد طلبا و طالبات زیر تعلیم ہیں جس میں ہر عمر کے خواتین وحضرات شامل ہیں۔ میاسی اردو اکیڈمی کے چیئرمین جناب اے محمد اشرف نے سامعین کو مخاطب کر کے کہا کہ اردو سب سے پیاری اور میٹھی زبان ہے، اس زبان کے ساتھ کسی اور زبان کی ملاوٹ غیر مناسب ہے۔ میاسی اردو اکیڈمی کے کنوینر جناب محمد روح اللہ صاحب نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ زبانیں کوئی بھی ہو ہر زبان کو سیکھنا چاہیے، زبان کی تعلیم کا مقصد نوکری حاصل کرنا نہیں، بلکہ اپنے اخلاق کو سنوارنا اور قوم کی خدمت کرنا ہے۔

جنوبی ہند نے ہمیشہ اردو کی خدمت کی ہے اور اردو کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کا تعلق بھی جنوب ہند سے تھا۔ ڈاکٹر حیات افتخار صاحب سابق صدر شعبہ اردو، قائد ملت کالج، چینئی نے اردو زبان کی اہمیت و افادیت پر ایک طویل خطبہ پیش کیا جس میں انھوں نے کہا کہ اگر مشترکہ طور پر دونوں زبانوں کا کوئی نام ہوسکتا ہے تو وہ ہندوستانی زبان ہے۔ خطابات کے بعد بابائے اردو تمل ناڈو جناب علیم صبا نویدی اور روزنامہ مسلمان کے سابق نائب مدیر عثمان غنی جنھوں نے بے لوث اردو کی خدمت کی تھی ان دونوں احباب کا حال ہی انتقال ہوا، ناظم مشاعرہ ساجد حسین ندوی نے ان دونوں کی خدمات کا مختصر تذکرہ کرتے ہوئے ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔

اس کے بعد مشاعرہ کا آغاز ہوا جس کی صدارت جناب محمد روح اللہ صاحب نے کی۔ شعرا نے خوبصورت لب و لہجے میں اپنے غزلیہ اشعار سے سامعین کو محظوظ کیا اور خوب داد حاصل کیے۔ اخیر میں شعبہ اردو کے ڈپارٹمنٹ سکریٹری محمد شعیب نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ پریس ریلیز: ساجد ندوی، چینئی، 1 مارچ 2024

مہاراشٹر

شمیم طارق: شخصیت اور علمی ادبی فتوحات کے موضوع پر یک روزہ سمینار

پونے: 'شمیم طارق: شخصیت اور علمی ادبی فتوحات' کے موضوع پر پونا کالج کے آڈیٹوریم میں منعقدہ سمینار میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سابق پرو وائس چانسلر پروفیسر تسنیم

فاطمہ نے کہا کہ پونا کالج کی اہم فتوحات میں ایک اہم فتح یہ ہے کہ اس نے شمیم طارق کی علمی ادبی فتوحات پر یہ سمینار منعقد کیا ہے۔ جامعہ کے سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ شمیم طارق شخصی اعتبار سے بھی لاجواب ہیں اور علمی اعتبار سے بھی۔ انھوں نے علم و ادب میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ بلاشبہ فتوحات کہلانے کی مستحق ہیں۔ آپ نے شمیم طارق کی علمی ادبی اور ذاتی زندگی کے کئی گوشوں پر روشنی ڈالی اور یہ بھی کہا کہ اتنے باکمال شخص کے کچھ حاسدین کا ہونا فطری ہے۔ حاسد سب کے نہیں ہوتے بلکہ انہی کے ہوتے ہیں جو خوبیوں اور صلاحیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر مہتاب عالم نے کہا کہ شمیم طارق کی ادبی خدمات فتوحات ہی کہے جانے کی مستحق تھیں اور ان کا جشن منایا جانا بھی لازم تھا۔ انھوں نے اردو میں بہت کچھ ایسا لکھا ہے جس کو 'شہ رگ' کی حیثیت حاصل ہے۔ کلیدی خطبہ کالج کے وائس پرنسپل پروفیسر معین الدین خان فلاحی نے پیش کیا اور اس کلیدی خطبے میں انھوں نے شمیم طارق کی مختلف جہتوں کو جمع کیا جس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ شمیم طارق کی تحریر بہتر ہے یا تقریر! کیونکہ قدرت نے انھیں دونوں نعمتوں سے نوازا ہے۔ شمیم طارق نے بھی اس موقعے پر مختصر خطاب کیا اور دہلی، علی گڑھ، بنارس، حیدرآباد، بھوپال، گلبرگہ، اورنگ آباد، ممبئی اور پونے وغیرہ سے آئے ہوئے مہمانوں کا نام لے کر کہا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علم و ادب کی کہکشاں پونا کالج کے آڈیٹوریم میں اتر آئی ہے۔ میں سب کو سننا پسند کروں گا میرا بولنا ضروری نہیں ہے ہاں یہ ضرور کہتا ہوں کہ جب میرے پاس کچھ نہیں تھا تو مایوس نہیں تھا آج کچھ ہے تو مغرور نہیں ہوں۔ میری کوشش فیض رساں بننے کی ہے۔

افتتاحی سیشن کے صدر اور کالج کے پرنسپل پروفیسر آفتاب انور شیخ نے پونا کالج کی اردو کو فروغ دینے کی کوششوں کا ذکر کرنے کے ساتھ یہ بھی کہا کہ کسی زندہ ادیب پر سمینار کے انعقاد کی روایت کو اور زیادہ مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔

سمینار کے ٹیکنیکل سیشن کی صدارت پروفیسر مسعود انور علوی، پروفیسر آفتاب احمد آفاقی اور پروفیسر عزیز بانو نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ممبئی اردو نیوز کے ایڈیٹر شکیل رشید نے شرکت کی اور کہا کہ میں شمیم طارق کو ایک زمانے سے جانتا اور اس حیثیت سے مانتا ہوں کہ انھوں نے غریبی میں نام پیدا کیا ہے۔ رزق حلال کے التزام میں تو وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کی علمی ادبی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر جن لوگوں نے مقالات پڑھے ان کے نام حقانی القاسمی، جمشید احمد ندوی، عزیز بانو، اسلم چشتی، خواجہ کوثر حیات، مہتاب عالم، غضنفر اقبال اور عظمی تسنیم ہیں۔ نظامت و تعارف ابرار احمد، جاوید اختر، اور سید عبدالباری نے پیش کیے۔ آخری سیشن کی صدارت آفتاب احمد آفاقی نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر شریک شاہنواز تھانہ والا نے کہا کہ شمیم طارق میرے خاندان کا حصہ ہیں اور دن رات کے ساتھ کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی زندگی میں ریاکاری یا دکھاوا نہیں ہے میں ان کے بافیض ہونے کی بھی گواہی دیتا ہوں۔ صدارتی کلمات میں پروفیسر مسعود انور علوی نے کہا کہ شمیم طارق کا تعارف میرے والد نے 50 سال پہلے کرایا تھا۔ میں محسوس کرسکتا ہوں کہ وہ کس طرح دن بہ دن تناور درخت بنتے گئے ہیں۔ میں ان کی شخصی اور علمی کمالات کا احاطہ ایک مجلس یا ایک تقریر میں نہیں کرسکتا۔ پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے موازنہ کی روایت اور اطلاقی و مشرقی شعریات کے حوالے سے شمیم طارق کی تنقید کا قابل اعتبار تجزیہ کیا۔ آفتاب احمد آفاقی کی جامع تقریر نے سامعین پر جادو جیسا اثر کیا اور وہ مسحور ہوکر سنتے رہے۔ تنقید و تحقیق کی روایت کو آگے بڑھانے میں شمیم طارق کی کتابوں اور مضامین کے حوالے سے آفتاب آفاقی کی تقریر بہت موثر تھی اور چونکہ یہ سمینار کی آخری تقریر تھی اس لیے اس پر بعد میں بھی صدائے تحسین بلند کی جاتی رہی۔ عام طور سے اعتراف کیا گیا کہ اتنا کامیاب سمینار پونا کی حالیہ تاریخ میں کبھی نہیں ہوا تھا۔

پریس ریلیز: ادبی کارواں، بھیونڈی، 3 مارچ 2024

اعزاز و اکرام

گیان پیٹھ ایوارڈ

نئی دہلی: اردو کے مشہور شاعر گلزار کو 58 ویں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا جائے گا۔ اسی کے ساتھ سنسکرت کے نامور اسکالر جگد گرو رام بھدراچاریہ بھی اس ایوارڈ کے مستحق قرار دیے گئے ہیں۔ گیان پیٹھ ایوارڈز کی جیوری

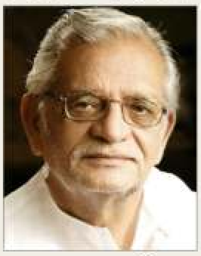

نے سال 2023 کے لیے 58 ویں گیان پیٹھ ایوارڈز کا اعلان کیا۔ گیان پیٹھ ایوارڈ دو زبانوں کے نامور ادیبوں،

جگد گرو رام بھدراچاریہ (سنسکرت ادب) اور مسٹر گلزار (اردو ادب) کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ مشہور کہانی کار اور گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ پرتبھا رائے کی صدارت میں سلیکشن کمیٹی کی میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا۔ اس میٹنگ میں سلیکشن کمیٹی کے دیگر ممبران مسٹر مادھو کوشک، دامودر موجو، پروفیسر سورنجن داس، پروفیسر پروشوتم بلمالے، پرفل شیلیدار، پروفیسر ہریش ترویدی، پربھا ورمنا، ڈاکٹر جانکی پرساد شرما، اے کرشنا راؤ اور گیان پیٹھ کے ڈائریکٹر مدھوسودن آنند شامل تھے۔ اتر پردیش کے چتر کوٹ کے رہنے والے مسٹر رام بھدراچاریہ ایک مشہور عالم، ماہر تعلیم، کثیر لسانی عالم، تخلیق کار، مبلغ، فلسفی اور ہندو مذہبی رہنما ہیں۔ وہ چترکوٹ میں واقع سنت تلسی داس کے نام سے منسوب تلسی پیٹھ نامی مذہبی اور سماجی خدمت ادارے کے بانی اور صدر ہیں۔ وہ کئی زبانوں کے ماہر ہیں اور 22 زبانیں بولتے ہیں۔ وہ سنسکرت، ہندی، اودھی، میتھلی سمیت کئی زبانوں کے آشوکوی اور مصنف ہیں۔ ان کے چار مہاکاویوں میں دو سنسکرت زبان اور دو ہندی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ اس سے قبل انھیں 2015 میں پدم وبھوشن سے نوازا جا چکا ہے۔ گلزار کے نام سے معروف سمپورن سنگھ کالرا (1934) ہندی فلموں کے مشہور گیت کار ہیں۔ اس کے علاوہ وہ شاعر، اسکرین رائٹر، فلم ڈائرکٹر، ڈرامہ نگار اور مشہور شاعر ہیں۔ ان کی تخلیقات بنیادی طور پر اردو، ہندی اور پنجابی میں ہیں۔ اس سے قبل گلزار کو سال 2002 میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ اور سال 2004 میں پدم بھوشن سے نوازا جا چکا ہے۔ اپنے طویل فلمی سفر کے ساتھ ساتھ گلزار ادب کے میدان میں نئے سنگ میل طے کر رہے ہیں۔ نظم میں انھوں نے ایک نئی صنف 'تروینی' ایجاد کی ہے جو تین سطروں کی غیر مقفی نظم ہوتی ہے۔ قابل ذکر ہے کہ سنسکرت زبان کو دوسری بار اور اردو کے لیے پانچویں بار یہ ایوارڈ دیا جا رہا ہے۔ ملک کے سب سے بڑے ادبی اعزاز، گیان پیٹھ ایوارڈ کے ایک حصے کے طور پر جیتنے والوں کو 11 لاکھ روپے کی انعامی رقم اور توصیفی سند سے نوازا جائے گا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 18 فروری 2024

پروفیسر عتیق اللہ

لکھنؤ: جب تک اردو ادب رہے گا تب تک پروفیسر شارب ردولوی کا نام بھی زندہ رہے گا۔ یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ آج شارب ردولوی کے نام سے پہلا ایوارڈ دیے جانے کے موقعے پر مجھے بلایا گیا۔ یہ ایوارڈ پروفیسر عتیق اللہ کو دیا جا رہا ہے جو فی الواقع ہر طرح

سے اس ایوارڈ کے مستحق ہیں وہ ادب کے ناقد بھی ہیں اور ایک اچھے شاعر بھی، میں ان کو اس ایوارڈ کے لیے دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ساتھ ہی ایوارڈ کمیٹی کے سبھی ممبران اور ان کے شاگردوں کو بھی مبارکباد دیتا ہوں، کیونکہ آپ تمام لوگوں نے پروفیسر شارب رودولوی کے کارناموں کو زندہ رکھنے اور ان کی خدمات کو آگے بڑھانے کا نیک کام کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار اتر پردیش کے سابق گورنر عزت مآب رام نائک نے آل انڈیا کیفی اعظمی میں منعقدہ پروفیسر شارب ردولوی میموریل ایوارڈ کمیٹی کی جانب سے پروفیسر شارب ردولوی یادگاری خطبہ اور ایوارڈ تقریب میں کیا۔ بحیثیت مہمان خصوصی سابق گورنر نے اپنے خطاب میں پروفیسر شارب ردولوی سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ بہت بڑے ادیب تھے۔ ان کی لکھی کتابیں چاہے کسی شخصیت پر ہوں، چاہے تحقیق یا تنقید پر ہوں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ پروفیسر عتیق اللہ کو ایوارڈ سے نوازنے سے پہلے ان کے لیے تحریر کردہ سپاس نامہ پروفیسر امتیاز احمد نے پیش کیا جس میں پروفیسر عتیق اللہ کے مختصر سوانحی اور علمی کوائف کا ذکر کیا گیا تھا۔ بعدہ سابق گورنر شری رام نائک کے بدست پہلا شارب ردولوی ایوارڈ پروفیسر عتیق اللہ کو دیا گیا اور دیگر مہمانوں کو شال پیش کر ان کا اعزاز کیا گیا۔ اس موقعے پر پروفیسر عتیق اللہ نے اپنے تاثرات میں ایوارڈ کمیٹی اور شارب ردولوی کے شاگردوں کی محبتوں کے تئیں ہدیہ تشکر پیش کیا اور کہا کہ شارب صاحب سے میرا گھریلو قسم کا رشتہ تھا۔ شمیم باجی کی محبتیں بھی مجھے حاصل رہیں۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ پروفیسر شارب نے اپنی حیات کے مقاصد کا تعین کر لیا تھا اور اسی اعتبار سے انھوں نے لمحات زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ وہ زبردست قوت ارادی کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر یکے بعد دیگرے کئی غم ٹوٹے مگر وہ نہیں ٹوٹے۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ، 27 فروری 2024

ندیم برنی

دیوبند: پرفیسر عنوان چشتی کی علمی، ادبی، سماجی اور ملی خدمات کے اعتراف میں ہر سال اتراکھنڈ سرکار کے ذریعے دیے جانے والا ایک لاکھ روپے نقد اور سند توصیف پر مشتمل 'اردو ایوارڈ' امسال مشہور ادیب اور شاعر ندیم برنی دہرادونی کو وزیر اعلیٰ اتراکھنڈ پشکر سنگھ دھامی نے وزیر لسانیات سبودھ انیال اور ڈائرکٹر محترمہ بھدر دوریہ کی موجودگی میں دیا گیا۔ اس موقعے پر وزیر اعلیٰ پشکر سنگھ دھامی نے کہا کہ آئین میں درج اور ہندوستان میں بولی جانے والی تمام زبانیں ہماری ہیں اور ہمیں ان زبانوں پر فخر ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان ہندوستان میں پیدا ہوئی اور یہ ایک آریائی زبان ہے۔ اس زبان

میں دراوڑی زبانوں کے اثرات دکھائی نہیں دیتے۔ اسی لیے اردو کا تعارف ایک ہند آریائی زبان کی حیثیت سے کیا جاتا ہے جس کی حقیقی بہن ہندی قرار پائی ہے۔ وہ بھی ہند-آریائی السنہ سے تعلق رکھتی ہے۔ محترمہ پروفیسر اوشا رانی پانڈے نے کہا کہ اردو خالص ہندوستانی زبان ہے، وزیر لسانیات انیال نے کہا کہ اردو زبان کی اہمیت اور افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ عومی طور پر عالمی اور خاص طور پر برصغیر کی زبان ہے۔ انھوں نے ندیم برنی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ ندیم برنی جہاں ڈپٹی ڈائرکٹر رہے، وہیں وہ ایک معمر اور کہنہ مشق شاعر بھی ہیں، ان کی چنیدہ غزلوں کا مجموعہ ندائے ندیم ہے۔ آپ رسالہ 'ساز سرمدی' کے معاون مدیر بھی رہے ہیں۔ ندیم برنی اس پیرانہ سالی کے باوجود ادبی حلقوں میں متحرک رہتے ہیں اور تمام ادبی کاوشوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 23 فروری 2024

فاروق جاذب لکھنوی اور ناز پرتاپ گڑھی

لکھنؤ: دبستان اہلِ قلم لکھنؤ کے زیر اہتمام مشاعرہ بیادِ صوفی بستوی و تقریب اعزاز ڈاکٹر مخمور کاکوروی کی سرپرستی و سابق ایڈیٹر نیا دور ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ نظامت کے فرائض روزنامہ 'اودھ نامہ' ریزیڈنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر ہارون رشید نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب ریحان عباس (ایڈیٹر نیا دور) و جناب شکیل انصاری نے شرکت کی۔ اس موقعے پر استاد شاعر فاروق جاذب لکھنوی و استاد

شاعر ناز پرتاپ گڑھی کو صوفی بستوی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ صدر تقریب ڈاکٹر وضاحت رضوی نے کہا کہ صوفی بستوی کے افسانوی مجموعے 'خوابوں کے دریچے' کی بات کی جائے یا ان کے شعری مجموعے 'افکارِ صوفی' کی دونوں ہی جگہ وہ منفرد نظر آتے ہیں۔ ایڈیٹر نیا دور ریحان عباس نے دبستانِ اہلِ قلم کی کارکردگی پر مبارکباد پیش کی۔ ڈاکٹر ہارون رشید نے صوفی بستوی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 5 مارچ 2024

لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ

نئی دھلی: دہلی کے انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر میں 10 فروری 2024 کو ایک پروگرام کا انعقاد ہوا جس میں

امروہہ فاؤنڈیشن کی جانب سے ڈاکٹر کشور جہاں زیدی (سنبھل) اور حقانی القاسمی (دہلی) کو اردو زبان وادب کی خدمات کے اعتراف میں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ دیا گیا۔ فاؤنڈیشن کے چیئرمین فرمان حیدر نے ان دونوں کی خدمت میں سپاس نامے پیش کیے۔ پروفیسر اختر الواسع اور دیگر معززین کے ہاتھوں ایوارڈ دیے گئے۔ سپاس نامے میں اردو زبان سے ان دونوں کی جذباتی وابستگی اور تصنیفات وتالیفات کا بطور خاص ذکر کیا گیا۔

روزنامہ 'انوار قوم' کانپور، 15 فروری 2024

اجرا

معاصر فکشن پر ایک نظر

علی گڑھ: خیابانِ ادب دُھرا معافی علی گڑھ میں ایک ادبی تقریب میں عصر حاضر کے معروف تنقید نگار مقصود دانش کی تازہ ترین کتاب 'معاصر فکشن پر ایک نظر' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ پروگرام کی صدارت اردو ادب کے معروف افسانہ نگار پروفیسر غیاث الرحمن سید نے کی جب کہ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر خورشید احمد اور صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی شامل ہوئے۔ نظامت کے فرائض ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر سرور ساجد نے انجام دیے۔ پروگرام کے منتظم پروفیسر صغیر افراہیم نے مقصود دانش کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ بلاشبہ مقصود دانش موجودہ دور کی تنقید کا ایک بڑا نام ہے۔ ان کی کتاب 'معاصر فکشن پر ایک نظر' معاصر فکشن کی تفہیم کے سلسلے میں ایک اہم کارنامہ ہے۔ پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ مقصود دانش کا خاصہ یہ ہے کہ وہ جب کسی فن پارے، کسی ناول یا کسی افسانے کی تنقید کرتے ہیں تو ادب کی اصطلاحات کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے نظریے کا اظہار نہیں کرتے بلکہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ فکشن میں درحقیقت قاری کو کیا چیز متاثر کرتی ہے۔ وہ محض کرداروں کے حوالے سے گفتگو نہیں کرتے بلکہ تخلیق کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہوئے اپنی تنقیدی بصیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ پروفیسر طارق چھتاری نے کہا کہ یہ کتاب نہ صرف اردو ادب کے علما کے لیے مفید ہے بلکہ طلبہ بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ پروفیسر غیاث الرحمن سید نے کہا کہ آج کی محفل ایک اہم اور منفرد محفل ہے، رسمی طور پر تو یہ ایک کتاب کی رسم اجرا کے طور پر منعقد ہوئی ہے لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں علی گڑھ میں موجود اردو زبان وادب کے ائمہ جمع ہو گئے ہیں۔ میرے لیے باعث عزت وافتخار ہے کہ اس محفل میں شریک ہوا۔ اگرچہ یہ کتاب 'معاصر فکشن پر ایک نظر' مصنف مقصود دانش کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے لیکن یہ ایک کوزے میں سمندر کو سموئے ہوئے ہے، جس میں اردو فکشن کے چند اہم تخلیق کاروں کا تذکرہ بھی ہے اور ان کے فن پر تفصیلی گفتگو بھی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر معید رشیدی نے بھی کتاب اور صاحب کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ساتھ ہی محفل میں ڈاکٹر شہناز رحمٰن اور محمد حنیف وغیرہ نے بھی مقصود دانش کے فن پر مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 23 فروری 2024

فاروق ارگلی و دیگر مصنفین کی کتابوں کا اجرا

نئی دھلی: این بی ٹی کے زیر اہتمام اور آئی ٹی پی او کے تعاون سے نئی دہلی کے پرگتی میدان میں منعقدہ 9 روزہ نئی دہلی عالمی کتاب میلے میں ایم آر پبلی کیشنز کے اسٹال نمبر 6,7 ہال نمبر 2 میں سات نئی کتابوں کا اجرا عمل میں آیا۔ ایم آر پبلی کیشنز کے مالک عبدالصمد نے بتایا کہ وہ مسلسل دو دہائیوں سے عالمی کتاب میلے میں اردو زبان وادب کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ان کا مقصد اردو کتابوں کو قاری تک پہنچانا اور اردو زبان و ادب کو فروغ دینا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر ریاض، پروفیسر فاروق بخشی، سدھارتھ آغا، ڈاکٹر عطیہ رئیس، معصوم مرادآبادی کے ہاتھوں پروفیسر ریاض عمر کی کتاب 'امیدوں کے پیغامات'، فاروق ارگلی کی کتاب 'اور جمنا بہتی رہی (خودنوشت)'، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی کتاب 'مصطفیٰ زیدی کی کہانی: خودکشی یا قتل اور شاعری'، سید ماجد جناح کی کتاب 'خلافت عثمانیہ ترکیہ'، ڈاکٹر قیصر ناہید کی کتاب 'اردو ناول کی تاریخ (1869 تا حال)'، سدھارتھ آغا کا شعری مجموعہ 'خطۂ دل' اور توحید احمد کنچن پوری کی کتاب 'زندگی کے انمول موتی' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس تقریب میں دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات کے علاوہ متعدد شہروں سے دیگر مہمانان نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 فروری 2024

معصوم شرقی کی دو کتابوں کی تقریب رونمائی

کولکاتا: شاعر، ادیب، محقق اور ناقد ڈاکٹر معصوم شرقی کی دو کتب 'لذتِ سنگ' (غزلیات) اور 'سخن زار' (رباعیات)

کا اجرا تانتی باغ ایجوکیشنل سوسائٹی کی لائبریری میں بزم نثار کولکاتا کے زیر اہتمام عمل میں لایا گیا۔ بزرگ شاعر حلیم صابر نے صدارت کی اور نظامت کے فرائض بزم کے معتمد اشرف احمد جعفری نے انجام دیے۔ پہلی کتاب

’لذتِ سنگ‘ کی رسم رونمائی ڈاکٹر غلام سرور نے ادا کی۔ دوسری کتاب ’سخن زار‘ کا اجرا ڈاکٹر ابوبکر جیلانی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر غلام سرور نے ’لذتِ سنگ‘ کی غزلوں کی تعریف کی اور کہا کہ ’لذتِ سنگ‘ کی ترکیب غالب کے شعر سے ماخوذ ہے، جو حسین پیرایے میں استعمال ہوا ہے۔ شاعر نے اپنے تجربات واحساسات کو لفظوں کا خوبصورت پیراہن عطا کیا ہے۔ فاضل مقرر نے منتخب اشعار کی خوبیاں بیان کیں۔ ڈاکٹر ابوبکر جیلانی نے ’سخن زار‘ پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ تخلیق خالق کے مشاہدات وتجربات کا ردعمل ہوتی ہے‘ اظہار کے وسیلے برتے جاتے ہیں تب فن کا ظہور ہوتا ہے، شاعر نے رباعی کے پیراہن میں سلگتے ہوئے مسائل پر قلم اٹھایا ہے، ان کی رباعیاں دلوں کو چھوتی ہیں۔ صدر جلسہ حلیم صابر نے کہا کہ معصوم شرقی کے یہاں جو کچھ بھی ہے، ان کا اپنا ہے، قارئین ان کے کلام سے مایوس نہیں ہوں گے، عالمی سطح پر رونما ہونے والے واقعات کو انھوں نے اپنی رباعیات کا محور بنایا ہے۔ صاحب کتب معصوم شرقی نے احباب سے تجدید ملاقات کو باعثِ انبساط بتایا اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ علمی وادبی شخصیات نے محفل کو رونق بخشی۔ معتمدِ بزم کے اظہار تشکر کے ساتھ جلسے کا اختتام ہوا۔

رپورٹ: ظہیر فیصل‘ کولکاتا، 25 فروری 2024

فن اگر مکمل ہو

نئی دھلی: امروہہ فاؤنڈیشن کی جانب سے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں 10 فروری 2024 کو ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں شاعرہ صبیحہ سنبل کی کتاب ’فن اگر مکمل ہو‘ کی رسم رونمائی کی گئی۔ پروگرام کی صدارت پدم شری

پروفیسر اختر الواسع نے کی۔ مہمان خصوصی پروفیسر شہپر رسول تھے۔ ان کے علاوہ مہمانانِ اعزازی میں کامنا پرساد، احمد گوہر اور ارشاد خان نے بھی شرکت کی۔ نایاب عباسی نے شمع روشن کرکے پروگرام کا آغاز کیا۔ امروہہ فاؤنڈیشن کے صدر فرمان حیدر نقوی نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقعے پر کامنا پرساد نے کہا کہ اس طرح کے پروگرام اردو ادب کے لیے بہت ضروری ہیں۔ اس سے معاشرے میں ایک اچھائی پیدا ہوتی ہے۔ اردو کسی مخصوص طبقے کی زبان نہیں ہے۔ یہ سب کی زبان ہے۔ پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جس میں ایک الگ ہی خوبصورتی ہے۔ اردو زبان میں ایک الگ ہی لذت ہے جو کسی اور زبان میں نہیں ملتی۔ صدارتی کلام میں پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ جب تک کامنا پرساد جیسی شخصیت موجود ہے، تب تک ہندوستان میں اردو کا مستقبل روشن رہے گا۔ اس موقعے پر حقانی القاسمی نے بھی صبیحہ سنبل کے شعری مجموعے پر اظہارِ خیال کیا۔ پروگرام کا اہتمام عرفان اعظمی نے کیا تھا۔ اس دوران جن شعرا نے اپنا کلام پیش کیا، ان میں صبیحہ سنبل، حامد گوہر، شاہد انور، علی عباس نوگانوی، شفا کشکانوی، علی مہدی، راشدہ باقی حیا شامل ہیں۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 12 فروری 2024

سپنوں کی روشنی

نئی دھلی: پرگتی میدان میں جاری عالمی کتاب میلے میں نوبل امن انعام یافتہ کیلاش ستیارتھی کی کتاب ’سپنوں

کی روشنی‘ کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ یہ کتاب پربھات پرکاش کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔ ’سپنوں کی روشنی‘ 50 سال قبل 17 سال کی عمر میں تحریر کردہ نوبل انعام یافتہ کیلاش ستیارتھی کی ڈائری پر مشتمل ہے، جسے اب کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے نو ابواب میں کامیابی کے نو فارمولے بیان کیے گئے ہیں۔ اس موقعے پر کیلاش ستیارتھی نے کہا کہ یہ کتاب 17 تا 70 سال کی عمر کے خوابوں کی آبیاری کے تجربات اور سیکھنے پر مبنی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب میں کوئی تقریر یا تعلیم نہیں۔ اس میں میری اور میرے آس پاس کے لوگوں کی ایسی بہت سی کہانیاں ہیں، جن میں امید اور مایوسی، کامیابی اور ناکامی، خوشی اور غم، آسانی اور مشکل، پریشانی اور تفریح جیسے تمام تجربات شامل ہیں۔ آج کی حقیقتوں اور چیلنجوں کے تناظر میں تقریباً نصف صدی پہلے کے میرے خیالات کتنی مطابقت رکھتے ہیں اور اس کے بعد سے اب تک کیا بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئیں یا نہیں ہوئیں، ذاتی تجربات کی بنیاد پر بحث کی گئی ہے۔ مسٹر ستیارتھی نے نوجوانوں سے اپیل کرتے ہوئے کہا کہ بڑے خواب دیکھیں۔ اس کتاب کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ خواب دیکھنے کی ہمت کرسکیں۔ خواب دیکھنے والا کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ اس موقعے پر مشہور نغمہ نگار اور شاعر آلوک سریواستو نے بھی بحث میں حصہ لیا۔ انھوں نے اپنی نوعمری کے دوران ودیشا میں چھوا چھوت کے خلاف کیلاش ستیارتھی کی جدوجہد پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ کس طرح صفائی کرنے والے لوگوں کے ذریعہ تیار کردہ کھانا کھانے کی دعوت دینے کی وجہ سے وہ اپنے ہی گھر میں اچھوت بن گئے۔ اس ایک واقعے نے کیلاش کے بعد کیلاش ستیارتھی بننے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب خوابوں کی تعبیر کی دستاویز ہے۔ اس موقعے پر کتاب کے پبلشر پربھات پبلی کیشنز کے ڈائرکٹر پربھات کمار نے کہا کہ کیلاش ستیارتھی نہ تو موٹیویشنل اسپیکر ہیں اور نہ ہی پیشہ ور مصنف۔ یہ ایک کرم یوگی کے خوابوں، جدوجہد اور تجربات کی کہانی ہے۔ اس میں پیغامات نہیں بلکہ تجرباتی سچائیاں ہیں۔ مصنف کے ایک چھوٹے سے شہر اور عام ماحول سے آنے سے لے کر امن کے نوبل انعام یافتہ بین الاقوامی شخصیت بننے تک کے تجربات پر مبنی یہ کتاب قارئین کے لیے ایک انمول تحفہ ثابت ہوگی۔

روزنامہ ’ہندوستان ایکسپریس‘ دہلی، 12 فروری 2024

ادب کا پیدل سپاہی: سیفی سرونجی

لکھنؤ: سہ ماہی انتساب کے مدیر وشاعر ڈاکٹر سیفی سرونجی کی ادبی خدمات پر مشتمل محقق وادیب محمد ایوب واقف کی

کتاب ’ادب کا پیدل سپاہی: سیفی سرونجی‘ کا اجرا گدی برادری کے صدر، سابق ممبر آف پارلیمنٹ داؤد صاحب کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ آل انڈیا گدی برادری کے بینر تلے منعقدہ اِس پروگرام میں داؤد صاحب نے سیفی سرونجی کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جس برادری کا ادب سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں، ہمیں اِس پر فخر ہے کہ سیفی جیسے تخلیق کار نے اِس برادری میں جنم لیا۔ ایک ایسا شخص جس نے گاؤں دیہات میں پرورش پائی، جس نے بیڑی مزدوری کی اور جس نے اسکول کی پہلی کلاس تک نہیں پڑھی، آج وہ دو رسالوں کا مدیر ہے اور اُس کی شخصیت پر پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جا رہے ہیں۔

سرونج جیسی گمنام بستی کو سیفی نے اپنے کارناموں سے لافانی حیثیت عطا کی ہے۔محمد ایوب واقف کی یہ کتاب واقعی ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ندیم فرخ نے اِس کتاب کے عنوان پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ صاحبِ کتاب نے سیفی صاحب کو بارہا کتابوں کا بوجھ کندھے پر رکھ کر پیدل سفر کرتے دیکھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو 'ادب کا پیدل سپاہی' نام دیا ہے۔ واصف فاروقی نے کہا کہ اِس کتاب میں سیفی کی ادبی اور گھریلو زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں کا مختصراً احاطہ کیا گیا ہے۔انھوں نے 40 سال تک انتساب کو تواتر سے جاری رکھنے کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔ایسی شخصیت کی قدردانی ہونا چاہیے۔تقریبِ اجرا کے بعد مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ صدارت کے فرائض بی ڈی نقوی نے انجام دیے اور نظامت شہباز طالب نے کی۔ پروگرام میں رام پرکاش بیخود، صابر گدی، رحمٰن گدی، شاشوت سنگھ، پی یوش اگنی ہوتری وغیرہ نے حصہ لیا۔آخر میں سیفی سرونجی نے تمام مقررین وحاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: استوتی اگروال، 24 فروری 2024

سرسید اکیڈمی میں دو کتابوں کا اجرا

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سرسید اکیڈمی میں اردو زبان وادب کی ایک محفل منعقد کی گئی جس میں شعبہ اردو سمیت مختلف شعبوں کے متعدد اساتذہ، اسکالر اور طلبا نے شرکت کی اور اپنے کلام بھی پیش کیے، اس موقعے پر دو کتابوں کا اجرا بھی عمل میں آیا جو عالم خورشید کے دو شعری مجموعے ہیں۔ عالم خورشید ایک ممتاز شاعر ہیں، وہ اپنے لب و لہجے کی وجہ سے منفرد مقام رکھتے ہیں۔آج ان کی جن کتابوں کا رسم اجرا کیا گیا ان میں 'خواب زار' اور 'کوئی مسافت باقی ہے' شامل ہیں۔ 'خواب زار' کو اردو اکیڈمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈپٹی ڈائریکٹر ڈاکٹر زبیر شاداب نے ترتیب دیا ہے جو عالم خورشید کے پانچ شعری مجموعوں کا انتخاب ہے۔اسی طرح دوسرا ان کا ایک تازہ ترین شعری مجموعہ ہے۔اس موقعے پر مقررین نے کہا کہ زبیر شاداب نے خوش گوار فریضہ انجام دیا ہے۔انھوں نے انتخاب میں بہت محنت کی ہے، عالم خورشید کی دس کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں ایک کتاب نثر بقیہ بھی شاعری کی ہے۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 24 فروری 2024

باتیں- ملاقاتیں

دیوبند: پریس ایسوسی ایشن دیوبند کے تحت معروف صحافی وادیب شاہد زبیری کی کتاب 'باتیں- ملاقاتیں' کا رسم اجرا شیخ الہند ہال میں عمل میں آیا۔اس دوران مذاکرہ بعنوان 'باتیں ملاقاتیں' کے تحت دانشوران نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تقریب کی صدارت مولانا ندیم الواجدی نے کی جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر شافع قدوائی شعبہ ماس کمیونی کیشن و جرنلزم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے شرکت کی اور مہمانِ ذی وقار کے طور پر پروفیسر راحت ابرار سابق صدر اردو اکیڈمی و پی آر او علی گڑھ مسلم یونیورسٹی موجود تھے۔ 'باتیں ملاقاتیں' کے مرتب ڈاکٹر عبید اقبال عاصم نے کتاب کا تعارف پیش کیا۔مولانا ندیم الواجدی نے اپنے صدارتی خطاب کے دوران شاہد زبیری اور ڈاکٹر عبید اقبال عاصم کی کاوشوں کی ستائش کرتے ہوئے مبارکباد دی۔ انھوں نے دیوبند اور علی گڑھ کے رشتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ دیوبند نے ہمیشہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور وہاں دی جانے والی تعلیم کے خواب کو سراہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مولانا قاسم نانوتوی کی وفات پر سرسید احمد خاں نے نہایت پراثر تعزیتی تحریر لکھی تھی جو دیوبند اور علی گڑھ کے رشتوں کا بھی ثبوت ہے۔ پروفیسر راحت ابرار نے کہا کہ کتاب میں شامل تمام انٹرویو نہایت اہمیت کے حامل ہیں، اس لیے اس کتاب کو ڈیجیٹلائز کرکے اپنی کاوشوں کو دور تک پہنچانے کی سعی کرنی چاہیے۔انھوں نے تعلیمی وادبی اعتبار سے دیوبند وعلی گڑھ کی شخصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ دیوبند و علی گڑھ تحریکات کے رشتے قائم رہنے چاہئیں۔اے ایم یو میں جرنلزم کے پروفیسر شافع قدوائی نے جرنلزم کے حوالے سے اپنے خیالات پیش کرتے ہوئے کتاب سے متعلق ڈاکٹر عبید اقبال عاصم اور ڈاکٹر شاہد زبیری کی مشترکہ کوششوں کی ستائش کی۔لندن سے تشریف لانے والے معروف صحافی غزالی خان نے اس اہم کارنامہ پر ڈاکٹر شاہد زبیری و ڈاکٹر عبید اقبال عاصم کو مبارکباد دیتے ہوئے صحافت کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ سہارنپور سے تشریف لانے والے معروف سماجی خدمت گار ڈاکٹر جمی مانوی نے کہا کہ شاہد زبیری ایک مستقل مزاج شخص ہیں۔ انھوں نے صحافتی میدان میں بہت محنت کی ہے، وہ قلم کے ذریعے اردو ادب کی جو خدمت کرسکتے تھے انھوں نے اس میں کوتاہی نہیں کی۔ سہارنپور کے معروف تعلیمی ادارے بلوسم اسکول کے پرنسپل رحمٰن عزیز نے منظوم مبارکباد پیش کی۔ دیوبند کی سیاسی وسماجی شخصیت بدر کاظمی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کتاب میں شائع انٹرویو نہایت شاندار اور پرمغز ہیں۔ اس دوران پریس ایسوسی ایشن دیوبند کی جانب سے ڈاکٹر شاہد زبیری کو شال اوڑھا کر اور مومنٹو پیش کرکے اعزاز دیا گیا۔ پروگرام کی نظامت صحافی و ادیب سید وجاہت شاہ نے کی۔ آخر میں منتظمین سمیر چودھری اور عارف عثمانی نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 فروری 2024

علقمہ شبلی: کتاب درد کا اقتباس

پٹنہ: میری نظر میں علقمہ شبلی ایک قادر الکلام شاعر ہیں، جن کے یہاں کچھ خاص روایتوں کا اظہار ملتا ہے۔ ان روایتوں کا تعلق اخلاقیات اور تاریخ وتہذیب سے ہے۔

ان خیالات کا اظہار پروفیسر اعجاز علی ارشد نے اپنے صدارتی خطبے میں کیا۔انھوں نے کہا کہ میں علقمہ شبلی سے جب بھی ملا ایک مسرت کا احساس لے کر لوٹا۔ ان کی شعری ونثری خدمات پر ڈاکٹر مظہر کبریا نے اس کتاب میں تقریباً تمام نئے مضامین جمع کردیے ہیں۔واضح ہو کہ شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں ڈاکٹر مظہر کبریا کی کتاب 'علقمہ شبلی: کتاب درد کا اقتباس' کی رسم رونمائی اور ادبی مذاکرے کی محفل منعقد کی گئی تھی، جس کی صدارت پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کی، جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی، جناب جاوید ہمایوں، جناب ارشد فیروز اور ڈاکٹر مظہر کبریا نے شرکت کی۔

تقریب کے آغاز میں سابق صدر شعبہ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے تعارفی واستقبالیہ کلمات ادا کیے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے کہا کہ علقمہ شبلی کسی ازم سے وابستہ نہیں تھے مگر ذہنی طور پر ہمیشہ ترقی پسند رہے۔ جناب جاوید ہمایوں نے کہا کہ مظہر کبریا نے ایک دستاویزی کتاب مرتب کی ہے۔ ہندو پاک کی تقسیم اور سقوط ڈھاکہ کے علاوہ ترقی پسندی کے زوال کا اثر علقمہ شبلی کی شاعری پر واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ تقسیم ہند سے مابعد جدیدیت تک بدلتے ہوئے شعری اسالیب اور رجحانات کا آئینہ علقمہ شبلی کی شاعری ہے۔ علقمہ شبلی اس حیثیت سے بھی خوش نصیب تھے کہ انھیں اردو سے پیار کرنے والے صاحبزادے ملے۔ جناب مظہر کبریا نے کہا کہ میں خوش نصیب ہوں کہ اپنے محبوب شعبے میں کتاب کے ساتھ حاضر ہوں۔

اس شعبے نے ہمیں صرف تعلیم نہیں دی۔ تہذیب و تربیت بھی کی ہے۔ میری کتاب کا اجرا یہاں ہونا میرے لیے قابل فخر ہے۔ علقمہ شبلی بھی میری نظر میں ایک تہذیب کا نام ہے۔ وہ منکسر المزاج، وضع دار اور نرم مزاج انسان تھے اور ویسا ہی انھوں نے مجھے بننے کی ترغیب دی۔ میرے آئیڈیل پروفیسر اعجاز علی ارشد اور علقمہ شبلی رہے ہیں۔ میں آج بھی ان کی راہ پر چلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آخر میں شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر سورج دیو سنگھ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا جب کہ شاہد وصی نے اس پروگرام کی نظامت کی۔ اس مناسبت سے ڈاکٹر ضمیر رضا، ڈاکٹر عشرت صبوحی اور ڈاکٹر مسرت جہاں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

پریس ریلیز، صدر شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ 17 فروری 2024

آسان پہیلیاں

نئی دھلی: حبیب سیفی کی دسویں تصنیف آسان پہیلیاں (مع جواب) کی رسم رونمائی 5 مارچ کو بمقام سی جی او

کمپلیکس دفتر ماہنامہ آجکل اُردو لودھی روڈ نئی دہلی میں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی معروف فکشن نگار احمد صغیر اور ہفت روزہ صدائے انصاری کے ایڈیٹر انصاری اطہر حسین کے علاوہ آجکل اردو کی ٹیم بھی شامل رہی، کچھ وقفہ کے لیے آجکل ہندی شعبے کی بھی شرکت ہوئی۔ رسم رونمائی کے مہمان فکشن نگار احمد صغیر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہمہ جہت قلمکار کے طور پر حبیب سیفی اردو ادب میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ معروضاتِ حبیب کے نام سے ان کے فن (تحقیق وتنقید) اور شخصیت پر بھی دو سال قبل ڈاکٹر محمد معین الدین استاد شعبۂ اردو ذاکر حسین دہلی کالج دہلی ترتیب دے چکے ہیں۔ کئی صوبائی اردو اکادمیوں کی جانب سے بھی ان کی تنقیدی و ادبی خدمات پر اعزازات پیش کیے جا چکے ہیں۔ بچوں کے ادب میں بھی حبیب سیفی کی سائنسی نظمیں انفراد رکھتی ہیں۔ لیکن آسان پہیلیاں منظوم لکھ کر حبیب سیفی نے گم شدہ صنف کی بازیافت کی ہے۔ میں ایسا اس لیے کہہ رہا ہوں کہ امیر خسرو نے بچوں کے ادب سے متعلق پہلیاں اور کہہ مکرنیاں لکھیں، افسوس اُردو زبان میں پہیلیوں کے لکھنے کا چلن ختم سا ہوتا جا رہا ہے۔ پہیلیاں لکھنے کا یہ کام حبیب سیفی نے بچوں کی معلومات میں اضافہ کی نیت سے ایک نئے انداز سے کیا ہے۔ پہیلیوں کا یہ مجموعہ بچوں کے ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ انصاری اطہر حسین نے کہا کہ بچوں کے ادب کی موجودہ صورتحال اطمینان بخش اس لیے ہے کہ بعض لکھنے والے بچوں کا ادب وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے لکھ رہے ہیں، ایسا کرنے والوں میں حبیب سیفی بھی شامل ہیں۔ رہی بات پہیلیوں کی تو اردو زبان کے برعکس ہندی میں ضرور کبھی کبھار پہیلیاں دیکھنے کو مل جاتی ہیں، لیکن اردو میں پہیلیاں نہیں لکھی جاتیں، جس سے بچوں کے پسندیدہ مشغلے اور ان کے مزاج میں بدلاؤ بھی آیا ہے۔ آسان پہیلیاں (مع جواب) میں موضوع کی مناسبت سے لائن آرٹ تصویریں ہیں۔ احمد صغیر، انصاری اطہر حسین و معاون آجکل اردو نرگس سلطانہ کے ساتھ دیگر شرکا نے بھی خصوصی طور پر تعریف کرتے ہوئے حبیب سیفی کو مبارکباد پیش کی۔

پریس ریلیز: حبیب سیفی، دہلی، 5 مارچ 2024

بالمشافہ

لکھنؤ: ممتاز صحافی اور ادیب معصوم مرادآبادی کی کتاب 'بالمشافہ' جو کہ ادیبوں اور اہم شخصیات کے انٹرویوز پر مشتمل ہے، اس کی رسم رونمائی اور مذاکرہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے لکھنؤ کیمپس میں ہوا۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی نے فرمائی اور نظامت

ڈاکٹر عمیر منظر نے کی۔ انھوں نے کہا کہ کتاب کا یہ ایڈیشن لکھنو سے نعمانی کیئر فاؤنڈیشن نے شائع کیا ہے، جس کے روح رواں اویس سنبھلی ہیں۔ تین دہائی بعد کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے جو کہ بہت خوش آئند ہے۔ کیمپس کی انچارج ڈاکٹر ہما یعقوب نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک نہایت عمدہ اور کارآمد کتاب ہے۔ قاری کو دو لوگوں کی گفتگو کے درمیان بہت کچھ سیکھنے اور جاننے کا موقع ملتا ہے۔ ڈاکٹر نور فاطمہ نے کتاب پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ بالمشافہ ایک رنگین البم ہے جس میں مختلف شخصیات کے مزاج اور لہجوں کے متنوع رنگ ایک ساتھ جمع ہو گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب کے مطالعے سے انٹرویو نگار کے ادبی سروکار کو خاص طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کے بقول معاصر ادبی منظرنامے سے واقفیت، بعض لسانی مسائل اور مختلف شخصیات کے متنوع مزاج اور لہجے کے مابین فرق کو بھی واضح طور پر کتاب کے مطالعے کے دوران میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر نور فاطمہ نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ معصوم مرادآبادی نے ہر شاعر اور ادیب سے اس کے تخلیقی سفر کو سامنے رکھ کر نہایت موزوں سوال کیے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اختر الایمان، کیف بھوپالی، حبیب جالب، افتخار عارف، مظفر وارثی، ملک زادہ منظور احمد، صلاح الدین پرویز اور بشیر بدر کے انٹرویوز کو پڑھ کر یہ بات نہایت اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ معصوم مرادآبادی نہایت سلیقے سے گفتگو کرنے کا فن جانتے ہیں۔ حمیرا عالیہ نے کہا کہ معصوم مرادآبادی کے صحافتی تجربات کی فنی جھلک ہمیں 'بالمشافہ' کے انٹرویوز میں واضح طور پر دیکھنے کو ملتی ہے، کیونکہ انھوں نے انٹرویو کے لیے جن شخصیات کا انتخاب کیا ہے، وہ اردو شعر و ادب کے ساتھ معاشرے میں بھی اہم حیثیت کی حامل ہیں۔ سینئر صحافی قطب اللہ نے کتاب پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب انٹرویو کے فن کے لحاظ سے بھی شاہ کار ہے کیونکہ معصوم مرادآبادی نے مختصر سوال کیے ہیں اور زیادہ موقع شخصیات کو دیا ہے تاکہ ان کا پورا موقف سامنے آجائے۔ انھوں نے کہا کہ ادبی شخصیات کے ساتھ ساتھ سماجی شخصیات کی شمولیت نے کتاب کی اہمیت کو دو چند کر دیا ہے۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے کہا کہ 'بالمشافہ' سے انٹرویو کے فن کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ معصوم مرادآبادی نے نہایت عمدہ طریقے سے لوگوں سے گفتگو کی ہے اور ان کی پیشکش اور زبان بھی عمدہ ہے۔ صدارتی گفتگو میں ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی نے کہا کہ یہ کتاب دراصل ادب اور سماج دونوں کا آئینہ ہے کیونکہ اس میں ادیبوں کے ساتھ ساتھ سماجی اور دیگر فن کاروں سے بھی انٹرویو لیے گئے ہیں جو نہایت کارآمد ہیں۔ معصوم مرادآبادی ہمارے عہد کے ایک نہایت سنجیدہ صحافی اور قلم کار ہیں۔ ان کی اس سنجیدگی کو اس کتاب کے ہر صفحے پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ادب کے ہر طالب علم کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

پریس ریلیز: معصوم مرادآبادی، 2 مارچ 2024

مولانا محمد عثمان فارقلیط: صحافی، مناظر، مفکر

نئی دھلی: سینئر صحافی سہیل انجم کی مرتب کردہ کتاب 'مولانا محمد عثمان فارقلیط، صحافی، مناظر، مفکر' کی رسم اجرا

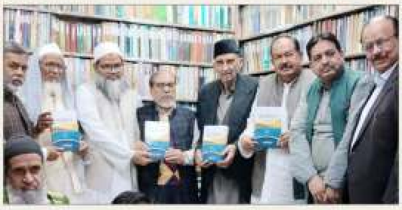

کی تقریب چوڑی والان میں منعقد ہوئی۔ کتاب مکتبہ ضیاء الکتب خیرآباد متو یوپی سے شائع ہوئی ہے۔ ناشر ضیاء الحق خیرآبادی اور کتاب کے مرتب سہیل انجم کی خواہش پر اس کا اجرا دہلی میں بھی کیا گیا۔ سہیل انجم نے مولانا محمد عثمان فارقلیط کی کتاب کے بارے میں روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب 512 صفحات پر مشتمل ہے۔ پیش لفظ میں اپنا موضوع 'مدتوں یاد کریں گے' مولانا کے بڑے صاحبزادے محمد فاروق مرحوم کا مضمون 'ہمارے والد محمد عثمان فارقلیط' بھی شائع ہوا ہے۔ اسی طرح بہت سے معروف ومشہور دانشوران کے مضامین اس کتاب میں قلم بند کیے ہیں جن میں پروفیسر اختر الواسع، محمد سلیمان صابر مرحوم، مالک رام، فاروق ارگلی، مولانا ضیاء الحق خیرآبادی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ تقریب رسم اجرا کی صدارت مولانا ضیاء الدین قاسمی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ مولانا محمد عثمان فارقلیط غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے، وہ بیباک صحافی اور مفکر قوم تھے۔ مہمان خصوصی مولانا ضیاء الحق خیرآبادی نے مولانا محمد عثمان فارقلیط سے بے پناہ لگاؤ اور محبت کا ثبوت دیتے ہوئے اس کتاب کی طباعت واشاعت کا کام کیا ہے۔ فتح پوری اسکول کے منیجر اور 'ڈائیوا' کے پیٹرن خلیل احمد نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے مولانا کے دیے ہوئے نعرے کے بارے میں بتایا۔ مولانا کی نواسی علینہ ناصر اور ان کے والد محمد ناصر بھی موجود تھے، وہ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی کر رہے ہیں جو جلد از جلد منظر عام پر آئے گا۔ فتح پوری اسکول کے چیئرمین اور ذاکر حسین دلی کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر ریاض عمر نے اظہار تشکر پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولانا محمد عثمان کے نام سے لائبریری کا نام رکھا جائے۔ 'ڈائیوا' کے نائب صدر محمد تقی نے کہا کہ صدر اور تمام ممبران کی اجازت سے مولانا محمد عثمان فارقلیط کا لائبریری میں ایک گوشہ جلد ہی قائم کیا جائے گا، موجود ممبران نے اس کی تائید کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 مارچ 2024

'وکیل احمد اعظمی' اور 'تاریخ مسلم پٹی'

نئی دھلی: آئی ایچ ایف و دہلی اوورسیز کے اشتراک سے مرکز جماعت اسلامی ہند کے کانفرنس ہال میں ڈاکٹر مرزا ندیم بیگ کی دو کتابوں کا اجرا عمل میں آیا، جس میں دہلی و اطراف کی ادبی و علمی شخصیات موجود تھیں۔ معروف اسلامی اسکالر پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ ڈاکٹر مرزا ندیم بیگ نے مسلم پٹی کی تاریخ مرتب کرکے اپنی مٹی کا حق ادا کردیا جو بالخصوص

وہاں کے باشندگان کا فرض کفایہ بھی تھا، ساتھ ہی وکیل احمد اعظمی کی کتاب اس لیے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ ہمارے معاشرے میں بھی بہت سے ایسے گمنام افراد ہیں جن کے کارنامے غیر معمولی ہیں اور انھوں نے اپنے مقصد کی تکمیل میں پوری زندگی وقف کردی اور یہ کتاب ان کے حق میں سب سے بڑا خراج عقیدت ہے۔ جماعت اسلامی ہند کے رکن مجلس شوریٰ و 'ریڈینس' کے چیف ایڈیٹر ڈاکٹر اعجاز اسلم نے کہا کہ یہ دونوں کتابیں ہمارے اسلاف کی روشن تاریخ کے تحفظ و بقا کی جانب بڑا قدم ہے۔ روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر ودود ساجد نے اس موقعے پر کہا کہ ڈاکٹر مرزا ندیم بیگ نے اعظم گڑھ کے معروف گاؤں مسلم پٹی کی تاریخ کو کتابی شکل دے کر اسے محفوظ کرنے کا اہم کارنامہ انجام دیا ہے جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس کتاب میں عہد جہانگیر سے موجودہ عہد تک چار سو سالوں کے شجرۂ نسب کو نقل کیا گیا ہے جو خود میں ایک دیدہ ریزی کا کام ہے۔ اس موقعے پر معروف صحافی و کالم نگار سہیل انجم نے دونوں کتابوں کا تفصیلی خاکہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اپنی نوعیت و معنویت کے لحاظ سے مذکورہ کتابیں منفرد ہیں اور مرزا ندیم بیگ نے اس کتاب کے لیے جس جانفشانی سے کام کیا ہے وہ کسی کوہ پیمائی سے کم نہیں کیونکہ تاریخ نویسی میں اکثر ایسے مقامات آتے ہیں جب کسی واقعہ اور دستاویز کے بارے میں کوئی مستند ثبوت نہیں ملتا۔ ایسے عالم میں زبانی گفتگو پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے اور مصنف کے لیے یہ آزمائش سے پروقت ہوتا ہے۔ معروف ادیب حقانی القاسمی نے کہا کہ ڈاکٹر مرزا ندیم بیگ کی دونوں کتابیں ایسی تحریک ہیں جس کی روشنی میں نوجوان کو اپنے آبا و اجداد کی تاریخ کو مرتب کرنے میں مدد ملے گی۔ مسلم پٹی اعظم گڑھ کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے مگر رشک اصفہان ہے، اس گاؤں سے عالمی شہرت کی حامل مقتدر و معتبر شخصیات کا وطنی رشتہ ہے۔ مغل مرزا مسلم بیگ کے ذریعے آباد کردہ اس گاؤں کی ایک زریں تاریخ ہے اس کا شجرہ چچپنیا سے جا کر ملتا ہے اور آزادی کی تحریک میں بھی اس گاؤں کا اہم کردار رہا ہے۔ مرزا ندیم بیگ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس گاؤں پر کتاب مرتب کی ہے تاکہ اس کے تہذیبی و تمدنی اور تاریخ نشانات کا تحفظ ہوسکے اور نئی نسل اس گاؤں کی قابل فخر وراثت سے روشناس ہوسکے۔ سینئر صحافی اور کالم نگار معصوم مرادآبادی نے کہا کہ یہ دنوں کتابیں اپنی جگہ منفرد مقام رکھتی ہیں۔ بالخصوص خطۂ اعظم گڑھ کے لوگوں کے لیے مشعل راہ بنیں گی۔ پروفیسر قطب الدین نے کہا کہ مذکورہ کتابیں خاص اہمیت کی حامل اس لیے بھی ہیں کہ یہ تاریخی بھی ہیں اور تحقیقی بھی۔ تاریخ نویسی کے طلبہ کو شارٹ کٹ کی بجائے ڈاکٹر ندیم بیگ کی کاوشوں سے بہت کچھ سبق سیکھنے کی ضرورت ہے تبھی ان کی تحقیق میں پائیداری آئے گی۔ کتاب کے مصنف ڈاکٹر مرزا ندیم بیگ نے اپنی دونوں کتابوں کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ تاریخ نویسی کا کام کوئی نیا نہیں بلکہ کتاب اللہ میں تاریخوں کو یاد رکھنے اور قابل تقلید انبیائے کرام کے کارناموں سے روشنی حاصل کرنے اور ان پر عمل کرنے کی تلقین متعدد مقامات پر کی گئی ہے۔ وکیل اعظمی کی سادہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے کہا کہ کسی تحریک کا قائد و رکن بننے کے لیے نہ تو پڑھا لکھا یا سند یافتہ ہونا ضروری ہے اور نہ ہی کسی خاندانی پس منظر کی ضرورت درکار ہوتی ہے۔ بس آدمی کے اندر ایک واضح نصب العین ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنی زندگی کو با مقصد مشن کے تحت گزار سکے۔ پروگرام کی نظامت محمد علی نے کی جب کہ ڈاکٹر نعمان قیصر نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 مارچ 2024

صوتی وجینی آلودگی

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد میں منعقدہ دو روزہ اردو سائنس بین الاقوامی اردو سائنس کانفرنس کے اسپیشل سیشن میں مولانا آزاد کالج، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

کے صدر شعبہ نباتات پروفیسر رفیع الدین ناصر کی تحریر کردہ کتاب 'صوتی وجینی آلودگی' (Noise and Genetic Pollution) کا اجرا پنجابی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اروند کے ہاتھوں عمل میں آیا جب کہ مہمان خصوصی کے حیثیت سے مانو یونیورسٹی کے آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی ڈاکٹر محمود صدیقی، ڈین پروفیسر سلمان احمد خان، کانفرنس کے کنوینر ڈاکٹر صلاح الدین، کو کنوینر ماجد چودھری موجود تھے۔ کنوینر نے مصنف اور کتاب کے تعارف میں بتایا کہ ڈاکٹر رفیع الدین ناصر ابتدا سے ہی اردو سائنس کانفرنس سے جڑے ہیں یہ ان کی پینتالیسویں کتاب ہے۔ ڈاکٹر محمود صدیقی نے مبارکباد پیش کی اور واضح کیا کہ ڈاکٹر ناصر کا تحقیقی میدان طبی نباتات ہے لیکن اردو قاری کے لیے وہ دیگر موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کرتے ہیں اسی کے نتیجے میں یہ کتاب وجود میں آئی جس میں بہت ساری نئی باتیں موجود ہیں جس کو ہر قاری کو جاننا ضروری ہے۔ اس موقعے پر کثیر تعداد میں پروفیسرس اور طلبا موجود تھے۔ تمام نے ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کو مبارکباد پیش کی اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

پریس ریلیز: رفیع الدین ناصر، مولانا آزاد کالج آف آرٹس، سائنس اینڈ کامرس، ڈاکٹر رفیق زکریا کیمپس، روضہ باغ، اورنگ آباد، 5 مئی 2023

وفیات

امین سایانی

ممبئی: ملک میں ریڈیو کی آواز کہلانے والے اور ریڈیو کو

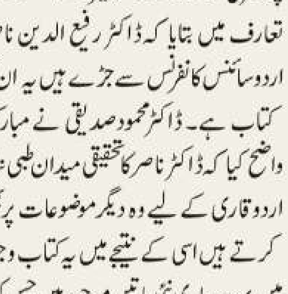

اس کی پہچان دلانے والے مشہور اناؤنسر اور میزبان امین سایانی خالق حقیقی سے جا ملے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 91 برس تھی۔ امین سایانی کے انتقال کی خبر سے ان کے مداحوں میں سوگ کی لہر دوڑ گئی۔ بیٹے راجل سایانی نے بتایا کہ امین سایانی کو 20 فروری کی شام 6 بجے جنوبی ممبئی میں جب وہ گھر پر ہی تھے، دل کا دورہ پڑا جس کے بعد انھیں فوری طور پر جنوبی ممبئی میں واقع ایچ این ریلائنس فاؤنڈیشن ہسپتال لے جایا گیا، جہاں ڈاکٹروں نے علاج شروع کیا، چند گھنٹے علاج جاری رہا مگر رب العالمین کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ امین سایانی کو ہائی بلڈ پریشر اور عمر سے متعلق دیگر امراض لاحق تھے۔ وہ پچھلے 12 برسوں سے کمر درد میں بھی مبتلا تھے اور اسی وجہ سے انھیں 'واکر' کا استعمال کرنا پڑتا تھا۔ ان کی آخری رسومات 22 فروری کو ممبئی میں ادا کی گئیں۔ امین سایانی 21 دسمبر 1932 کو ممبئی میں پیدا ہوئے۔ ان کی آواز کا جادو لوگوں کے دلوں پر راج کرتا تھا۔ انھوں نے اپنے کیریئر کا آغاز آل انڈیا ریڈیو سے بطور ریڈیو پریزنٹر کیا جہاں ان کے بھائی حامد سایانی نے ان کا تعارف کرایا تھا۔ انھوں نے یہاں 10 برس تک انگریزی پروگراموں میں حصہ لیا۔ اس کے بعد انھوں نے آل انڈیا ریڈیو کو ہندوستان میں مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ امین سایانی کے ریڈیو سیلون اور پھر وودھ بھارتی پر تقریباً 42 برس تک جاری رہنے والے ہندی گیتوں کے مشہور پروگرام 'بنا کا گیت مالا' نے کامیابی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے اور ریڈیو کو ہر گھر کی ضرورت بنا دیا تھا۔ لوگ ہر ہفتے انھیں سننے کے لیے بیتاب رہتے تھے۔ ان کی آواز اس ریڈیو پروگرام کی وجہ سے گھر گھر پہچانی جاتی تھی۔ ان کا 'بہنو اور بھائیو!' کہہ کر سامعین کو متوجہ کرنے کا انداز نہایت مقبول تھا بلکہ وہ ان کا ٹریڈ مارک جملہ بن گیا تھا۔ گیت مالا کے ساتھ امین سایانی ہندوستان کے پہلے ریڈیو میزبان تھے جنھوں نے ابھرتے ہوئے موسیقی کے منظرنامے کے بارے میں اپنی گہری سوجھ بوجھ کو ظاہر کرتے ہوئے ایک مکمل شو تیار کیا اور پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 فروری 2024

علیم صبا نویدی

چنئی: اردو کے معروف نقاد، محقق، ادیب شاعر علیم صبا نویدی کا 24 فروری 2024 کو انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین امیر النساء بیگم قبرستان راما راؤ گارڈن چنئی میں ہوئی۔ ان کا پیدائشی نام علیم صبا ہے اور قلمی نام علیم صبا نویدی۔ وہ 28 فروری 1937 کو چنئی تمل ناڈو کے ضلع شالی آرکاٹ کے ایک قصبہ امور (والا جاہ پیٹ) میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے 1968 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے امتیازی

نمبرات سے گریجویشن کیا۔ وہ بابائے اردو تمل ناڈو کے نام سے شہرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ کثیر التصانیف ادیب ہیں جن میں طرح نو، فکر بر، نقش گیر، اثر خامہ، عرش غزل، نور السموات، تشدید، اردو شاعری میں نئے تجربے، مولانا باقر آگاہ کے ادبی نوادر، شعاع مشرق، تمل ناڈو میں اردو، تمل ناڈو کے مشاہیر ادب، آزاد غزل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

علیم صبا نویدی کے تبصرے، مضامین اور مکتوبات مختلف رسائل و جرائد میں شامل ہوتے رہے ہیں۔ وہ چنئی کے بابائے اردو کہلاتے تھے۔ ان کی بیشتر کتابیں ان کی صاحب زادی جاویدہ حبیب نے ترتیب دی ہیں جن میں خواتین تمل ناڈو کی روشن تحریریں، دکن کی دانش گاہوں میں اردو تحقیق و تنقید، تمل ناڈو کا مفکر شاعر: دانش فرازی، علیم صبا نویدی کے خطوط، صبا کے غنچے قابل ذکر ہیں۔

مختلف ذرائع سے

ڈاکٹر فیروز احمد

دہرہ دون: معروف محقق پروفیسر فیروز احمد کا دہرہ دون میں 3 مارچ 2024 کو انتقال ہوگیا۔ وہ طویل عرصے سے بیمار تھے۔

مرحوم کی پیدائش اور تعلیم گورکھپور میں ہوئی لیکن عملی زندگی کا بیشتر حصہ راجستھان یونیورسٹی، جے پور میں گزرا۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انھوں نے دہرہ دون میں رہائش اختیار کی اور وہاں بھی تصنیف و تالیف کا کام جاری رکھا۔ ان کی تصانیف/ تالیفات میں مہدی افادی، انتخاب خطوط مہدی افادی، محنت کی برکت، انتخاب میر ناصر علی، باغ و بہار، اختر شیرانی، تحقیقات اور راجستھان میں اردو وغیرہ شامل ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے NCPUL کے لیے 'راجستھان میں اردو زبان و ادب کی تاریخ' پر ایک پروجیکٹ مکمل کیا تھا۔ ان دنوں وہ 'امیر

خسروؔ پر کام کر رہے تھے اور مضامین کا مجموعہ بھی زیر ترتیب تھا۔

پریس ریلیز: ابن فیروز احمد، دہرہ دون، اتراکھنڈ، 8 مارچ 2024

پنکج اُدھاس

ممبئی: غزل گلوکاری کو ایک نئی جہت دینے والے پنکج اُدھاس کا 26 فروری کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 72 برس تھی۔ پنکج اُدھاس 17 مئی 1951 کو راجکوٹ، گجرات کے قریب جیٹ پور میں ایک زمیندار گجراتی خاندان میں پیدا ہوئے۔ گھر میں موسیقی کے ماحول کی وجہ سے پنکج اُدھاس بھی موسیقی میں دلچسپی لینے لگے۔ پنکج اُدھاس نے محض سات سال کی عمر میں گانا شروع کیا۔ ان کے بڑے بھائی منہرادھاس نے ان کے شوق کو پہچانا اور انھیں اس راستے پر چلنے کی ترغیب دی۔ منہرادھاس اکثر موسیقی سے متعلق پروگراموں میں حصہ لیتے تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھ پنکج اُدھاس کو بھی شامل کرلیا۔ ایک بار پنکج کو ایک کنسرٹ میں حصہ لینے کا موقع ملا جہاں انھوں نے گانا 'اے میرے وطن کے لوگو ذرا آنکھ میں بھرلو پانی' گایا، اس گانے کو سن کر سامعین جذباتی ہوگئے۔ اسی دوران پنکج اُدھاس نے راجکوٹ کی سنگیت ناٹیہ اکیڈمی میں شمولیت اختیار کی اور طبلہ بجانا سیکھنا شروع کیا۔ کچھ برسوں کے بعد پنکج اُدھاس کا خاندان بہتر زندگی کی تلاش میں ممبئی آگیا۔ پنکج اُدھاس نے اپنا گریجویشن مشہور سینٹ زیویئرز کالج ممبئی سے مکمل کیا۔ اس کے بعد انھوں نے پوسٹ گریجویشن کی تعلیم کے لیے داخلہ لیا لیکن بعد میں ان کی دلچسپی موسیقی کی طرف بڑھ گئی اور انھوں نے استاد نورنگ جی سے موسیقی کی تعلیم لینا شروع کی۔ پنکج اُدھاس کے سنیما کیریئر کا آغاز 1972 میں ریلیز ہونے والی فلم (کامنا) سے ہوا، پھر انھوں نے غزل سنگنگ پر توجہ دی اور اس میں مہارت حاصل کرنے کے لیے باقاعدہ اردو زبان سیکھی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 27 فروری 2024

ناظر نعمان صدیقی

ممبئی: اردو کے سب سے قدیم ادبی رسالہ شاعر کے ناشر ناظر نعمان صدیقی انتقال کرگئے۔ 79 سالہ نعمان صدیقی اپنے بھائی اور مدیر اعلیٰ افتخار امام صدیقی کے انتقال کے بعد ادارت سنبھال رہے تھے۔ فی الحال ممبئی سے جاری اس قدیم ادبی رسالہ ماہنامہ 'شاعر' کے ناشر اور نائب مدیر ناظر نعمان صدیقی اپنی اہلیہ کے ساتھ جنوبی ممبئی میں رہائش پذیر تھے۔ یکم مارچ کی صبح نو بجے اپنے گھر اور شاعر کے دفتر دیناناتھ بلڈنگ، گرانٹ روڈ میں آخری سانس لی۔ نعمان امام کے پسماندگان میں اہلیہ، ایک بیٹی اور تین بھائی ہیں۔ ناظر نعمان صدیقی (مانی بھائی) کے نام سے مشہور تھے۔ سیماب اکبرآبادی کے پوتے، اعجاز صدیقی کے بڑے بیٹے تھے۔ خیال رہے کہ ناظر نعمان صدیقی نے تقریباً 60 برسوں تک شاعر کے لیے اپنی خدمات انجام دیں جو اپنے آپ میں ایک ریکارڈ ہے۔ آپ کی پیدائش 25 نومبر 1945 کو آگرہ میں ہوئی تھی۔ ان کی عمر 78 سال سے تجاوز کرچکی تھی اور عارضہ قلب کی وجہ سے وہ شاعر کے دیناناتھ بلڈنگ کی تیسری منزل پر چڑھنے اترنے سے بھی قاصر تھے، لیکن اگر ان کے 35 سالہ نوجوان بیٹے واصف نعمان صدیقی کا حرکت قلب بند ہونے سے انتقال نہیں ہوگیا ہوتا تو وہ شاید اتنی جلدی ہار ماننے والے نہیں تھے۔ ذاکر حسین کے مطابق ناظر نعمان کی تعلیم و تربیت واجبی ہوسکی تھی۔ انھوں نے مالی دشواریوں کے دوران صرف انٹر پاس کیا تھا اور چند ایک چھوٹی موٹی ملازمتیں کرنے کے بعد اپنے والد اعجاز اور بڑے بھائی تاجدار کے ساتھ شاعر کی ذمے داریوں میں خود کو بھلا دیا۔ شاعر کی اشاعت اور ترویج میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اگر جائزہ لیا جائے تو اس بات کا علم ہوگا کہ انھوں نے کتابت پریس کاغذ، بائنڈنگ، پوسٹنگ، حساب کتاب اور بینک سب کی ذمے داری قبول کرلی۔ جس زمانے میں ناظر نعمان اپنے بھائی تاجدار اور والد اعجاز کے معاون کی حیثیت سے شاعر کی خدمت کررہے تھے ان کے چھوٹے بھائی افتخار فلموں میں قسمت آزمائی کے ساتھ ساتھ مشاعروں میں شرکت کررہے تھے۔ ذاکر حسین نے کہا کہ ناظر نعمان کی وفات سے صحافت اور خصوصی طور پر ادبی صحافت میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 2 مارچ 2024

رشید انجم

بھوپال: رشید انجم نے یکم مارچ 2014 کو 84 سال کی عمر میں دنیا سے کنارا کیا اور اپنے پیچھے بیٹوں، بیٹیوں اور ناتی پوتوں سے بھرا پرا خاندان ہی نہیں 64 کتابوں کا اثاثہ بھی چھوڑ گئے۔ ان کتابوں میں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور معلومات کا خزانہ بھی۔ وہ شاعر تھے چنانچہ کئی شعری مجموعے ہیں۔ افسانہ نگار اور ناول نگار تھے، ڈرامہ نگار بھی تھے اپنے کئی ڈراموں کا خود ڈائریکشن بھی کیا۔ ان کا ایک طویل ڈرامہ سنگ ریز ہوائیں تقریباً پانچ سو صفحات پر محیط ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی ادبی شخصیات پر مونوگراف لکھے۔ ان کا ایک خصوصی تحقیقی موضوع فلمیں اور فلمی شخصیات تھیں۔ ان کی ایک مشہور کتاب 'جہانِ فلم کی مسلم اداکارائیں' ہے اس کے علاوہ دو جلدوں میں 'ادب سے فلم تک' جیسی اہم معلوماتی کتاب بھی انھیں کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ بھوپال کی مشہور 'اقبال لائبریری' میں بحیثیت سکریٹری وہ آخر دم تک اپنی خدمات دیتے رہے اور ہمیشہ دامے درمے سخنے وہ اس کی بقا کے لیے سینہ سپر رہے۔

بشکریہ: ضیا فاروقی، بھوپال، مدھیہ پردیش

نذیر احمد

سری نگر: وادی کشمیر سے تعلق رکھنے والے سینئر صحافی اور روزنامہ 'صبح کشمیر' کے مدیر اعلیٰ نذیر احمد وانی طویل علالت کے بعد 2 مارچ کی صبح انتقال کرگئے۔ خاندانی ذرائع نے بتایا کہ نذیر احمد وانی نے ہفتے کی صبح یہاں شیر کشمیر انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز صورہ میں زندگی کی آخری سانسیں لیں۔ وہ طویل عرصے سے صاحب فراش تھے اور گردوں کے عارضے میں مبتلا تھے۔ ان کا تعلق سری نگر کے پیر باغ علاقے سے تھا۔ درس اثنا

مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والی شخصیات و تنظیموں نے ان کے انتقال پر رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے مرحوم صحافی کو شریف النفس، خوش اخلاق، مہمان نواز اور غریب پرور قرار دیا اور ان کی جنت نشینی اور لواحقین کے صبر کے لیے بارگاہ ایزدی میں دعا کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 3 مارچ 2024

اقبال احمد

نئی دهلی: روزنامہ 'ہمارا سماج' کے سینئر کمپیوٹر آپریٹر اقبال احمد کا 7 مارچ کی صبح ممبئی کے ٹاٹا میموریل ہسپتال میں علاج کے دوران انتقال ہوگیا۔ وہ پندرہ روز پہلے

وہاں داخل ہوئے تھے اور ڈاکٹروں نے تفتیش کے بعد ان کے لیور میں کینسر کی تحقیق کرنے کے بعد کیموتھراپی سے علاج کر رہے تھے، لیکن دوسرے ڈوز کے دوران ہی 7 مارچ کو ان کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم کا تعلق جھارکھنڈ سے تھا، لیکن ایک طویل عرصہ سے وہ اپنے بچوں کے ساتھ منہدیان میں رہائش پذیر تھے۔ وہ جامعہ رحیمیہ کے آفس انچارج بھی رہے تھے، لیکن اب وہ مستقل روزنامہ 'ہمارا سماج' میں اپنی خدمات دے رہے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ چھوٹی بیٹی محض 2 برس کی ہے۔ مرحوم کو ان کے آبائی گاؤں لے جایا گیا، جہاں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 8 مارچ 2024

خراج عقیدت

گوپی چند نارنگ اور نئی فکریات

دوشنبه، تاجکستان: ہندوستانی ادبیات میں کسی مخصوص نظریے اور مخصوص ادبی تھیوری کی فہم وادراک کی سعی و سفارش کے خلاف ہمارے اردو کے کسی بھی نقاد نے کوئی نئی بحث شروع نہیں کی اور نہ ہی اس سمت میں کسی نے کچھ سوچا۔ یہ سہرا گوپی چند نارنگ کے سر جاتا ہے کہ انھوں نے اردو میں پہلی بار ادعائی رویوں سے انحراف کیا اور تھیوری

سے ارتباط رکھنے والوں کو ایک ایسے کشادہ رجحان سے متعارف کرایا جسے آج ہم مابعد جدیدیت کا نام دیتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار اردو ممتاز نقاد اور دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ کے 93 ویں یوم پیدائش (11 فروری) پر شعبہ ہندی- اردو، تاجک نیشنل یونیورسٹی کے زیر اہتمام 'گوپی چند نارنگ اور نئی فکریات' کے موضوع پر منعقد خصوصی لیکچر میں تاجک نیشنل یونیورسٹی میں آئی سی سی آر کے وزیٹنگ پروفیسر ڈاکٹر مشتاق صدف نے کیا۔ انھوں نے گوپی چند نارنگ کو مابعد جدیدیت کا امام قرا دیتے ہوئے کہا کہ مابعد جدیدیت کسی بھی نوع کی فارمولا سازی اور نظریوں کی مطلقیت کے خلاف ہے۔ آج کی تخلیقی فضا میں جو تبدیلیاں آئی ہیں وہ زندگی کی ضرورتوں کا تقاضا ہیں۔ یہ اپنی تہذیبی، فکری اور ادبی ترجیحات کی پروردہ ہیں۔ ان تمام پہلوؤں پر اردو میں پہلی بار گوپی چند نارنگ نے سوچا اور غور وفکر کی نئی قندیلوں کو روشن کیا۔ ڈاکٹر مشتاق صدف نے مزید کہا کہ نئے ذہن وفکر کو مابعد جدید فکر ہی سب سے زیادہ راس آتی ہے کیونکہ آج کی نئی سوچ اور نئی ادبی تھیوری تکثیریت پر استوار ہے اور یہ اپنے تشخص، اپنی تہذیب اور ثقافت پر اصرار کرتی ہے۔ اس لیے تھیوری اب نئی فکریات کے لیے عام ہوچکی ہے۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر رجب حبیب اللہ نے کہا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسے دانشور اور ادیب صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ پروگرام میں ایشین اور یوروپین لینگویجز کے ڈین پروفیسر سید علی زادہ شادمان نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ ابتدائی کلمات کے طور پر صدر شعبہ ڈاکٹر قربان حیدر نے گوپی چند نارنگ کا مختصر تعارف پیش کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر زرینہ، ڈاکٹر علی خان، محترمہ شیرین کے علاوہ ہندی، اردو کے طلبا وطالبات کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 فروری 2024

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دکنی ہندو اور اردو

مصنف: نصیر الدین ہاشمی

تیسری اشاعت: 2023

صفحات: 266

قیمت: 170 روپے

کلیاتِ فراق (جلد سوم)

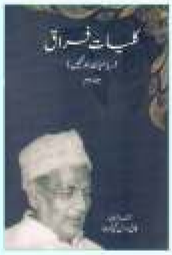

ترتیب و تدوین: کالی داس گپتا رضا

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 399

قیمت: 235 روپے

املا نامہ

مرتب: گوپی چند نارنگ

چوتھی اشاعت: 2023

صفحات: 97

قیمت: 80 روپے

جدید ہندوستان میں ذات پات اور دوسرے مضامین

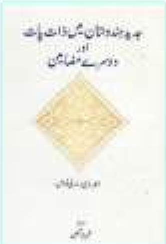

مصنف: ایم این سری نواس

مترجم: شہباز حسین

دوسری اشاعت: 2023

صفحات: 180، قیمت: 125 روپے

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

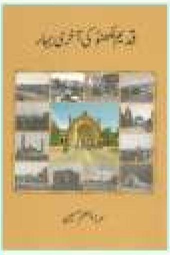

مصنف: مرزا جعفر حسین

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 671

قیمت: 355 روپے

حالی کا سیاسی شعور

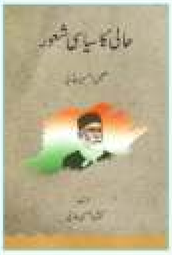

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

حالی کی غزلیں اور قطعات

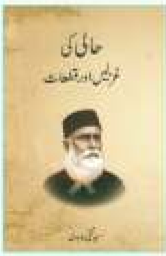

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 66+185

قیمت: 150 روپے

نوم چامسکی

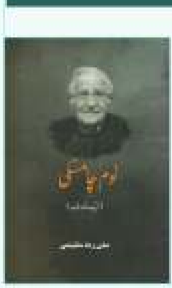

مصنف: علی رفاد فتیحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, अप्रैल-२०२४,वर्ष:२६, अंक:४
URDU DUNIYA Monthly, April-2024, Vol.26, Issue:04
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/03/2024
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Prof. Dhananjay Singh, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6